

حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب دہانوی رحمۃ اللہ علیہ کے موعظ کا مجموعہ

دعائے عریض

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب دہانوی رحمۃ اللہ علیہ

کتب خانہ اشرفیہ

تاسیس شدہ دو ماہ قبل ۱۳۳۳ھ اور ۱۹۱۵ء
۲۲۱۳۰۵۸

مکتبہ فقہانوی

مولوی مسافر خانہ ایم ایچ جناح روڈ کراچی ۱
۲۴۴۶۲۰ - ۲۴۴۰۹۳

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً
رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

دعواتِ عبدیتِ جلد دوم

کا

پہلا وعظ مُلقب بہ

تَظْهِيرُ رَمَضَانَ

منجملہ ارشادات

حکیم الامتہ مجدد الملتہ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی، دفتر الالبقاء

متصل مسافر خانہ - بند روڈ - کراچی ۷
ایم اے جناح روڈ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

دعواتِ عبدیت جلد دوم کا

پہلا وعظ ملقب بہ

تطہیر رمضان

ایں	میں	کچھ	کچھ	ماذا	منجھلا	الکلمۃ	انبات
کسنا ہوا	کس ہوا	کسنا ہوا	کسنا ہوا	کیا ضرورت تھا	کس نے کھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مرا آ باد محمد شفیع	۱۳۱۹ھ	۲ گھنٹہ	بچھا کر	اصلاح محکرات رمضان	حکم کو مضبوط بجوری	تجربہ ۵۰۰	.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَغْنِيْهِ وَنُسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهُ تَوَكَّلْ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ
 مِنْ شُرُوْرٍ اَنْفُسَنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مِنْ يَّهْدِيْهِ اللّٰهُ فَلَا مَضِلَّ لَنَا وَمَنْ
 يُّضِلُّهُ فَلَا هَادِيَ لَنَا وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَنَا وَنَشْهَدُ
 اَنْ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم
 اَمَّا الْبَعْدُ۔ بوجہ قرب رمضان شریف مناسب ہے کہ کچھ احکام اس کے بیان کر دئے جائیں۔
 یہ تو معلوم ہے کہ روزہ فرض ہے اس کے تو بیان کی ضرورت نہیں۔ اور ایسے ہی تراویح سنت
 مؤکدہ ہونے کی وجہ سے ضروری ہے اس کے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ البتہ ضروری
 مضمون یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس ہینہ میں کچھ منکرات بڑھادیئے ہیں اور وجہ اسکی یا تو عدم علم

ہے یا قصور علم یا جانتے سمی ہیں مگر احتیاط نہیں کرتے بڑے تعجب کی بات ہے کہ اللہ میاں نے اس مہینہ میں ان چیزوں کو بھی حرام کر دیا جو پہلے حلال تھیں کیا یہ اس بات پر دال نہیں کہ جو چیز ہمیشہ حرام ہے اس میں اور شدت زیادہ ہو جائے گی۔ حق تعالیٰ سبحانہ نے تو علت بیان کی روزہ رکھنے کی۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ روزہ اس واسطے ہے کہ متقی بن جاؤ۔ اب ہر شخص غور کر لے کہ قبل رمضان میں اور رمضان میں کچھ فرق اس کی حالت میں ظاہر ہوا اس نے نظر بد کو یا غیبت کو چھوڑ دیا، یا نہیں سو کچھ نہیں، دونوں حالتیں یکساں ہیں کسی باب میں بھی کمی نہیں ہوئی۔ اب رہا کھانا سو اس کے بھی وقت بدل دیئے مقدار میں کچھ تغیر نہیں کیا۔ غرض یہ کہ شائع علیہ السلام کا تو مقصود یہ تھا کہ منکرات میں کمی ہو مگر لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ اہل تحقیق تو کھانے تک میں بھی کمی کر دیتے ہیں۔ اس مہینہ میں بہ نسبت شعبان کے مگر اس کی مقدار کچھ معین نہیں ہو سکتی ہے۔ جتنا شعبان میں کھاتے تھے اس سے کم کر دیا بعض نے صرف بقدر لایموت کھا کر روزہ رکھا۔ جب ہی تو کچھ اثر پایا۔ ہمیشہ اچھی طرح کھایا ایک مہینہ عبادت ہی کے واسطے سہی۔ حاصل یہ کہ ان لوگوں نے اکل میں بھی کمی کر دی مگر یہ بات مندوب خواص کے لئے ہے۔ یہ ہر شخص سے نہیں ہو سکتا مگر معاصی تو چھوڑو۔ خیر کھانے کے لئے جواز کا مرتبہ تو ہے معاصی کے واسطے تو جواز بھی نہیں۔ ہم برخلاف اس کے دن بھر معاصی میں مشغول رہتے ہیں بلکہ بعض تو عصیاں میں اور زیادہ جلاتے ہیں اسی کو دیکھ لیجئے کہ صبح اس مہینہ میں اپنے وقت پر ہوتی ہے یا نہیں۔ اس نماز کی تو وقت سے تاخیر کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ بہتیروں کو تو قضا ہوتی ہے اور قضا نہ بھی ہوتو اس قدر تاخیر تو ہوتی ہے جس سے جماعت فوت ہو جاوے۔ خوش ہیں کہ ہم نے روزہ رکھ لیا بڑا تعجب ہے کہ نماز کو چھوڑ دیا روزہ کیا کفایت کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مغفرت کو اس قدر بڑھا دیا کہ دس ضعف ثواب کا وعدہ فرمایا اور ہم اس قدر گناہ کرتے ہیں کہ حنات باوجود اتنے بڑھائے جانے کے بھی سینکڑوں کے برابر نہیں ہوتیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حنات کی تعداد بڑھی ہوئی رہتی۔ اس کو بھی جانے دیجئے برابر تو رہتی کہ پھر بھی حنات بموجب سبقت رحمتی علی غضبی کے غالب ہو جاتیں اور جب باوجود اَضْعَا فَاَمْضَا عَصَا ہونے کے بھی نیکیاں گناہوں کے برابر نہیں ہوتیں بلکہ گناہ بڑھتا رہتا ہے تو پھر کیا حشر ہونا ہے۔ اچھا اس کو بھی جانے دیجئے اگر ہمیشہ ہم اس پر متاد رہیں ہیں کہ معاصی کو گھٹا دیں تو رمضان میں تو ایسا کر لیا جائے۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ عبادت کا اثر اس کے

بعد گیارہ مہینے تک رہتا ہے جو کوئی اس میں کوئی نیکی تکلف کر لیتا ہے اس کے بعد اس پر بآسانی قادر ہو جاتا ہے اور جو کوئی کسی گناہ سے اسے اجتناب کر لے تمام سال بآسانی اجتناب کر سکتا ہے اور اس مہینہ میں معصیت سے اجتناب کرنا کچھ مشکل نہیں کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں پس جب شیاطین قید ہو گئے معاصی آپ ہی کم ہو جائیں گے۔ محرک کے قید ہونے کی وجہ سے اور یہ لازم نہیں آتا کہ معاصی بالکل مفقود ہی ہو جائیں کیونکہ دوسرا محرک یعنی نفس تو باقی ہے اس مہینہ میں وہ معصیت کرائے گا مگر یہاں کم اثر ہوگا کیونکہ ایک ہی محرک رہ گیا۔ اس میں ایک مہینہ کی مشقت گوارا کر لی جائے کوئی بات نہیں۔ غرض اس میں ہر عضو کو نگاہ سے بچایا جاوے۔ ایک زبان ہی کے مین گناہ ہیں جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے ایک ان میں سے کذب ہے جس کو لوگوں نے شیر مار سمجھ رکھا ہے اور کذب وہ شے ہے کہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں اور پھر اس کو مسلمان کیسا خوشگوار سمجھتے ہیں۔ ذرا سا بھی لگاؤ کذب کا ہو جائے بس معصیت ہو گئی یہاں تک کہ ایک صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بچہ سے پہلانے کے طور پر یوں کہا کہ لے یہاں آؤ چیز دیں گے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ آجائے تو کیا چیز دو گی انھوں نے دکھایا کہ یہ کھجور ہے میرے ہاتھ میں، فرمایا اگر تمہاری نیت میں کچھ نہ ہوتا تو یہ معصیت لکھ لی جاتی۔ حضرات! کذب یہ چیز ہے۔ خیر یہ تو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں اگر اس سے استرازنہ ہو سکے تو کذب مفسر سے تو بچنا چاہیئے۔ پھر روزہ میں۔ دوسرا گناہ زبان کا غیبت ہے لوگ یوں کہا کرتے ہیں کہ میاں ہم تو اُس کے منہ پر کھدیں منہ پر عیب جوئی کرو گے تو بہت اچھا کرو گے اور پیچھے تو ظاہر ہے جیسا اچھا ہے بلکہ اگر منہ پر برا کہو گے تو بدلا بھی پاؤ گے وہ شخص تمہیں بُرا کہہ لے گا یا اپنے اوپر سے اس الزام کو دفع کرے گا۔ پیچھے بُرائی کرنا تو دھوکہ سے مارنا ہے یاد رکھو جیسا کہ دوسرے کا مال محترم ہے ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ آبرو ہے چنانچہ جب آبرو پرا بنتی ہے تو مال تو کیا چیز ہے جان تک پرواہ نہیں رہتی پھر آبروریزی کرنے والا کیسے حق العبد سے بری ہو سکتا ہے مگر غیبت ایسی رائج ہوتی ہے کہ باتوں میں احساس بھی نہیں ہوتا کہ غیبت ہو گئی یا نہیں اس سے بچنے کی ترکیب تو بس یہی ہے کہ کسی کا بھلا یا بُرا اصلاً ذکر ہی نہ کیا جاوے کیونکہ ذکر محمود بھی اگر کیا

جاوے کسی کا تو شیطان دوسرے کی برائی تک پہنچا دیتا ہے اور کہنے والا سمجھتا ہے کہ میں ایک ذکر محمود کر رہا ہوں اور اس طرح ایک خیر اور ایک شر مل جانے سے وہ خیر بھی کالعدم ہوگئی اور حضرات اپنے ہی کام بہتیرے ہیں پہلے ان کو پورا کیجئے دوسرے کی کیا پڑی۔ علاوہ بریں غیبت تو گناہ بے لذت بھی ہے اور دنیا میں بھی مضر ہے جب دوسرا آدمی سنے گا تو عداوت پیدا ہو جائے گی اور پھر کیا ثمرات اس کے ہوں گے اسی طرح زبان کے بہت گناہ ہیں، سب سے بچنا ضروری ہے ان کے علاوہ ایک گناہ جو خاص روزہ کے متعلق ہے افطار علی الحرام ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس مہینہ میں حلال کا کھانا بھی ایک وقت میں حرام ہو گیا اور پھر دن بھر تو لوگ اسے چھوڑے رہیں اور شام کو حرام سے افطار کریں اور دراصل بعض لوگوں نے خبط میں ڈال دیا ہے یوں کہتے ہیں کہ رزق حلال تو پایا نہیں جاتا سوائے اس کے کہ دریا میں سے مچھلی شکار کر کے کھالی جائے یا سبزی کھا کر یا گھاس چر کر پیٹ بھر لیا جائے اور کچھ قصے اس کے متعلق مشہور کئے ہیں وہ ایک بزرگ کا قصہ بیان کیا کرتے ہیں کہ ان کا بیل لڑتے لڑتے دوسرے کے کھیت میں چلا گیا تو انہوں نے اس کھیت کا غلہ کھانا چھوڑ دیا کہ نہ معلوم دوسرے کے کھیت کی مٹی جو میرے بیل کے کھڑ میں لگ کر بلا اجازت چلی آئی کون سے دانے میں شامل ہو گئی۔ اگر یہ قصہ ہوا ہے تو وہ صاحبِ حال ہے دوسرے کے لئے اُن کا فعل حجت نہیں ہو سکتا۔ قصداً انتہا مبالغہ کرنا فتویٰ کا ہیضہ اسی کو کہتے ہیں۔ جب اتنے شبہ کو بھی حرام میں داخل سمجھا دے گا اور اس سے بچنا ظاہر ہے کہ مشکل ہے تو گمان یہ ہوگا کہ حرام سے بچنا مشکل ہے پس سب حراموں میں مبتلا ہو گئے اور حلال کو بالکل چھوڑ ہی دیا میں کہتا ہوں کیا کنز و ہدایہ بالکل لغو ہی ہے میں جب یہی بات ٹھہری کہ حلال کا وجود ہی نہیں تو ناحق اتنا بسط کیا صرف اتنا کافی تھا کہ اَلْحَلَالُ لَا یُوجَدُ (حلال کا وجود ہی نہیں) ہرگز نہیں جس پر کنز و ہدایہ فتویٰ دے دیں وہ حلال ہے میں کہتا ہوں کیا سب علماء حرام خور ہیں۔ ایک بزرگ تھے مولانا مظفر حسین صاحب ان کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی اُن کو مال حرام دھوکے سے بھی کھلا دیتا تھا تو تھے ہو جا یا کرتی تھی اور پھر بھی وہ دونوں وقت کھانا کھاتے تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے

کہ حلال کا وجود دنیا میں ضرور ہے ورنہ وہ کیا کھاتے تھے اگر فرض کیجئے کہ مال حرام ہی کھاتے تھے تو طبیعت کو یہ نفرت نہیں ہو سکتی یا یہ کہ ہمیشہ تھے ہی کیا کرتے ہوں گے تو کھانا فضول ہے غرض دنیا میں حلال بھی ہے حرام بھی ہے جو مسائل دریافت کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے مگر لوگ پوچھتے ہی نہیں اور یہ فساد کا ہے سے ہوا کہ لوگوں نے پوچھنا چھوڑ دیا جو جی میں آیا کرتے رہے حتیٰ کہ اس کے عادی ہو گئے اب جو کسی نے منع کیا تو اس کا چھوڑنا نہایت دشوار معلوم ہوا بس کہہ دیا کہ میاں یہ لوگ تو خواہ مخواہ حلال کو حرام ہی کہا کرتے ہیں ان کی تو غرض بھی یہ ہے کہ مال بھی نہ بڑھے اور مسلمانوں کو زنی نہ ہو بس ہوتے ہونے بیہوش میں جم گیا کہ ان کے یہاں تو سب چیز حرام ہی ہے ، حلال کا وجود ہی نہیں جو حلال تھا وہ بھی حرام ہی سمجھنے لگے اور خوف سے مفتی کے پاس جانا چھوڑ دیا کہ دیکھا چاہئے کہ ہمارے کس معاملہ کو حرام بتادیں یا حلال بتائیں تو ہماری خاطر سے ہی شاید کہہ دیں اور فی نفسہ حرام ہی ہو گا کیونکہ حلال کا تو وجود ہی نہیں سو یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ جس کو مفتی مباح کہے وہ عند اللہ مباح ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔ شیطان کے بہت سے جال ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ سب حرام ہے پھر بعض لوگ حرام و حلال میں خواہ مخواہ شبہ کر کے حلال کو بھی چھوڑ دیتے ہیں کہ جب اس میں وسوسہ ہے تو چھوڑ ہی دو چاہئے مفتی کتنا ہی کہے کہ یہ حلال ہے مگر وہ اس کے چھوڑنے ہی کو اولیٰ سمجھتے ہیں نہیں اس فعل میں کچھ حرج نہیں جو مباح ہے اہل علم سے پوچھ لو کہ کوئی وجہ اس میں اباحت کی بھی ہے وہ کوئی عالم نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ بھی یہ ہی چاہتے ہوں کہ تم کو وقت میں ڈالیں اور یہ خیال مت کرو کہ حلال موجود ہی نہیں۔ پوچھ لو پھر جس سے وہ منع کریں اس پر عمل کرنے کے لئے ہمت باندھو اور اگر نفس کم ہمتی ہی کرے تو اس سے یوں کہو کہ یہ جو حکام وقت کے احکام ہیں ان کو کس طرح مانتا ہے اس کو بھی حاکم حقیقی کا حکم سمجھ کر مانو پھر دوسرے لوگ بھی انشاء اللہ تم سے معارضہ نہ کریں گے۔ میرا ہی خود قصہ ہے کہ کبھی زیور بنو اتا تو چونکہ چاندی کے واسطے روپیہ دینے سے روبا لازم آ جاتا ہے اس لئے جب کبھی زیور بنوانے کا اتفاق ہوتا تو میں چاندی دوسری جگہ سے خرید کر اسے دے دیتا دو ایک مرتبہ تو اس نے کہا روپیہ دے دو پھر تول کر حساب کر دینا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ یہ میرے دین کے خلاف بات ہے، اس نے اس کو خوشی سے منظور کر لیا۔ تو لوگ سب مان جاتے ہیں آدمی پکا چاہیئے اور اللہ میاں کی طرف

سے اسباب ویسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں خیال کر لیجئے کہ حاکم جب کسی کو امر شاق کا حکم دیتا ہے تو اس پر مامور کی اعانت بھی کیا کرتا ہے۔ حاصل یہ کہ دل کو مضبوط کرو اور اس پر عزم کر لو کہ ہم کوئی کام بلا پوچھے نہ کریں گے، ہاں اس پوچھنے پر بعض صورتیں عدم جواز کی بھی نکلیں گی اور اس میں آمدنی کم ہی ہو جاوے گی تو خوب سمجھ لو اور تجربہ کر لو کہ اس کم ہی میں برکت ہو جاوے گی اور اس کے یہ معنی نہیں کہ کم چیز مقدار میں بڑھ جاتی ہے کہ بازار سے تو ایک من گیہوں لائے اور گھر پر آ کر دو من اترے ممکن تو ایسا بھی ہے۔ ایک صاحب خیر نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ مسجد بنواتے تھے اور ایک تھیلی میں روپیہ رکھتے تھے اور کام شروع کیا جب ضرورت ہوتی اس میں ہی سے ہاتھ ڈال کر نکال لاتے یہاں تک کہ سب کام بن گیا حساب جو لگایا تو جتنا روپیہ تھا اُس سے کم نہیں ہوا تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مگر ہمیشہ ضرور نہیں بلکہ اس کے معنی اور ہیں اور وہی اکثر واقع ہیں اور وہ یہ کہ یہ مقدار فیصل جب تمہارے ہی صرف میں آئے بیماری میں خرچ نہ ہو اور ایسے ہی فضول خرچیوں میں مقدمات میں لاپائے تکلفات میں ضائع نہ جائے۔ جو کچھ آئے تمہاری ہی ذات پر صرف ہو، چاہے تھوڑا ہو اس سے بہتر ہے کہ زیادہ آئے اور تم پر حشر نہ ہو اور آخر میں میں کہتا ہوں کہ نہ ہو برکت مگر خود اللہ میاں کی رضا ہی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اللہ میاں ملیں پھر کیا حقیقت ہے کسی چیز کی، مال و دولت کے مقابلہ میں کیا اللہ میاں کی کچھ وقعت نہیں سمجھتے ہو۔ حضرت اللہ میاں کی رضا وہ چیز ہے کہ جس کی نسبت ایک بزرگ کہتے ہیں عہدِ اے آنکہ جزِ نوپاک نیست، دنیا کے حکام کی صرف خوشنودی کے واسطے کتنے کتنے سفر اور کیا کچھ خرچ کرنا پڑتا اور پھر ان کی خوشنودی دیر پا نہیں۔ ذرا سی بات پر بگڑ گئے اور اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ہم سکور ہیں خیال کیجئے اس لفظ کو۔ ایک بادشاہ کے سامنے کوئی چیز لے جائیے اور وہ اُس کی نسبت منظوری و عدم منظوری کچھ ظاہر نہ کرے مگر اس میں کوئی عیب نہ نکالے اور خازن کو حکم دے دے کہ رکھ لو تو لے جانے والے کے دماغ آسمان پر پہنچ جاویں گے اور سنا تا پھرے گا کہ بادشاہ نے ہمارا ہدیہ رکھ لیا۔ اور اللہ میاں کے یہاں ہم لوگ اپنے اعمال لے جاتے ہیں اور ذرا ان اعمال کو بھی دیکھ لیجئے کہ وہ کس قابل ہیں ایک نمازی ہی کو لے لیجئے اس وقت نظیر کے واسطے کہ کھڑے ہوتے ہیں اللہ میاں سے

باتیں کرنے کو اور کرتے ہیں کس سے گاؤں خر سے یا یوں مثال دیجئے کہ ایک بادشاہ نے محض اپنی عنایت سے اپنے غلام کو دربار میں حاضری کی اجازت دی بلکہ یوں کہیں کہ زبردستی طلب کیا۔ رہم لوگ ایسے بھلے مانس تو کا ہے کو ہیں کہ حاضری کی اجازت سے ہی دربار میں پہنچنے کو غنیمت سمجھیں، زبردستی بلائے ہوئے بلکہ پابہ زنجیر ہو کر دربار میں پہنچے اور کام ہم سے کیلہ ہے کہ بادشاہ کو ان پر حرم آیا ہے اور چاہتا ہے کہ ان سے دربار میں کچھ گفتگو کرے کہ درباریوں اور تمام رعایا میں ان کی عزت ہو جائے اپنا کچھ نفع مقصود نہیں۔

من نکردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بستگان جو دے کنم

..... ہائے من نکردم خلق تا سودے کنم، بلکہ تا بر بستگان جو دے کنم
اللہ میاں کا کیا نفع ہے ہمارے پیدا کرنے یا عزت دینے سے۔

خیر۔ ان حضرات نے کیا مکافات کی اُس بلانے کی کہ پہنچتے ہی تو منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ اور کانوں میں انگلیاں دے لیں مگر بادشاہ تو کم طرف نہیں ہے اس گستاخی پر نظر نہیں کر دیتا اور حکم دیتا ہے اپنے خادموں کو کہ اس بے وقوف کی انگلیاں کانوں سے نکال دو بلکہ ہاتھ باندھ دو کہ پھر انگلیاں کانوں میں نہ دے سکے اور منہ اس کا ہماری طرف کر دو اور جلدی سے یہ شفقت آمیز کلمات زبان سے فرمانے لگا کہ ایک دفعہ تو اس کے کان میں پڑ جائیں دیکھیں تو معلوم کیسے نہیں ہوتا۔ مگر یہ تو قسم کھا کر چلے ہیں کہ الٹا ہی کریں گے چٹ سے پھر انگلیاں کانوں کی طرف بٹھائیں مگر ہاتھ بندھے ہوئے تھے جلدی سے اس خوف سے کہ کہیں محبوب کا کلام کان میں پڑ جائے اس جگہ سے بھاگ صراط میں گھوڑے کے پاس جا چھپے وہاں آدمی پکڑنے کے لئے پہنچا کہ ہس کے پاس جا چھپے۔ غرض ایک گھنٹہ بھر یہی کیفیت رہی کہ یہ بھاگا کئے اور بادشاہ کے نوکر بلکہ خود بادشاہ۔ اللہ اکبر! ان کے پیچھے پھر کیا مگر انہوں نے وہی کیا جو شامت اعمال سے ہونا تھا۔ اب فرمائیے کہ یہ شخص کس سزا کا مستحق ہے یا بادشاہ کو اس پر رحم آنا چاہیے یہ تو اس قابل ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی یہ حرکت اس نے کی ہے تو توہین بادشاہ کے جسم میں اس کو لے لیا جائے اور کبھی دربار کی حاضری کی اجازت نہ ہو۔ اب آپ اپنے معاملہ

کو اللہ میاں کے ساتھ دیکھ لیجئے کہ اُدھر سے تو حاضری کی اجازت ہر وقت یعنی نعل نماز کے لئے اجازت ہے جب چاہو پڑھو رہا ستھار تھوڑے سے وقتوں کے) مگر ہمیں توفیق نہیں ہوتی کہ اس اجازت کو غنیمت سمجھیں یہاں تک کہ پیڑ کر بلانے کی نوبت پہنچی یعنی فسخ نماز کا وقت آیا۔ نہایت کاہلی کے ساتھ گرتے پڑتے پہنچے برا بھلا وضو کیا اور باکراہ نیت نماز کی یعنی سامنے باتیں کرنے کو کھڑے کئے گئے کھڑے ہوتے ہی منہ ایسا پھیرا کہ کچھ خبر نہیں صرف الفاظ زبان پر جاری ہیں دھوکہ دینے کے واسطے آداب شاہی بجا لایا ہے ہیں یعنی تَسْبِيْحًا تَاكِيًا اَللّٰهُمَّ بَرِّحْنَا۔ اللہ میاں نے اس منہ پھیرنے پر نظر نہ کی اور کلام شروع کیا چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ پر جواب مناد ثیوں میں آیا ہے ذرا سی بھٹک کان میں پڑتے ہی ایسے بھاگے کہ سیدھے گھر آکر دم لیا کبھی بیوی کے پاس کبھی بچوں کے ساتھ کبھی مکان میں کبھی طویلہ میں پھرا کئے۔ مراد اس سے خیالات کا جولانی دینا... بغرض یہی مسخرانہ کیا کئے یہاں تک کہ بمشکل تمام دربار کی حاضری ختم تک پہنچی یعنی سلام پھیرا۔ بڑی خیر ہوئی بادشاہ کی ہم کلامی سے بچ گئے جانے وہ کاٹ کھانا کیا کرتا یہ خبر نہیں کہ کیا کرتا اور کیا ہوتا اور یہ کیا پاتے، صاحبو! اب ان گستاخیوں کی سزا دی ہوئی چاہیے تھی یا نہیں جو مثال میں نے عرض کی کہ اگر ایک دفعہ بھی ہم ایسی سزا پڑھتے تو کبھی اللہ میاں کے یہاں ہم کو گھسنے نہ دیا جاتا اور فوراً دربار سے نکلتے ہی گرفتاری اور جس دوام کا رو بکار جاری ہو جاتا مگر سنئے کہ اللہ میاں سے کیا رو بکار جاری ہوا... وَكَانَ سَعْيُكَ مُشْكُوتًا (تمہاری کوشش قابلِ قدر ہے) اس نے دربار میں کراتنی دیر کی مصاحبت کو بہت اچھے طرح انجام دیا۔ مرجانے کی بات ہے۔ اچھی طرح تو جیسے انجام دی وہ ہم بھی خوب جانتے ہیں اور جو وہاں حاضر تھے انہوں نے بھی خوب دیکھا۔ بلکہ حاضرین کے سامنے شرم رکھنے کے واسطے اور فرماتے ہیں..... اُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ مِثْلَ مَا يَشَاءُ لِمَنْ يَشَاءُ حَسَنَاتٍ رَّحِمَ مَنْ هُوَ لَكُمْ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ خداوند کریم نیکیوں سے بدل دیتے ہیں، گویا یہ بیوقوف ہے کتنی ہی گستاخیاں کیں مگر ہم اس آنے کو حاضری میں لکھ لیتے ہیں اور اس کی وہی عزت کی جائے جو باقاعدہ آنے والے کی کیجاتی ہے اب فرمائیے کہ اگر ایک مرتبہ ایسا معاملہ بادشاہ کسی کے ساتھ کرے تو کیا دوبارہ اس شخص کی بہت پڑ سکتی ہے کہ پھر اسی طرح وحشیانہ طریق سے دربار میں جاوے ہرگز نہیں بلکہ سر سے پیر تک نجات

گئے پسینہ میں غرق ہو جائے گا مگر ہم ایسے احسان فراموش ہیں کہ ایک دو دفعہ کیا معنی سینکڑوں بار بلکہ ہر روز پانچ بار یہی جفاکاری کرتے ہیں، مگر ادھر سے مطلق خیال نہیں کیا جاتا اس پر طرہ یہ ہے کہ ان لنگڑے لوے اعمال (بلکہ اعمال کیسے کہا جاسکتا ہے بد اعمالیوں) میں بھی کمی اور کوتاہی ہے بلکہ خدائے تعالیٰ کے محرمات کی طرف میلان ہے۔

صاحبو! ذرا شرم آؤ اور عمل کرو اور حرام سے بچو خاص کر رمضان کے مہینہ میں۔ منکرات تو روزے کے ہوئے اب ایک عمل اور ہے خاص رمضان کا جیسے دن کا عمل روزہ ہے ایسے رات کا عمل قیام ہے اس میں بول ضبط کر دیا کہ تراویح کی ۲۰ رکعت گنتی میں تو پوری کر لیں مگر یہ پتہ نہیں کہ چلتا کہ ان میں نوریت پڑھی جاتی ہے یا انجیل پڑھی جاتی ہے یا تو شروع کا حرف سمجھ آتا ہے یا شروع کی "بجیر" ایک حافظ کا قصہ ہے کہ قرآن شریف پڑھتے پڑھتے جہاں بھولے وہاں کچھ اپنی تصنیف سے پڑھ دیا۔ بڑی تعریف ہوتی رہی مدتوں کہ ان کو کہیں متشابہ بھی نہیں لگتا۔ لاجل و لا قوۃ الا باللہ صاحبو! اللہ میاں کو دھوکہ مت دو میں رکعتیں گنا کر ذرا ڈھنگ سر بھی تو کرو۔ ایک یہ ظلم ہوتا ہے کہ حافظ مقتدیوں کو بھگاتا ہے اس طرح کہ قراۃ کو اتنا طول دیتا ہے کہ کوئی ٹھہر ہی نہ سکے پانچ پانچ سیپارہ ایک ایک رکعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں بَشَاءٌ وَلَا تَقْضُاْ وَكَيْسَ اَوْ لَا تَقْضُاْ خَوْشَجْرِي سُنَا اور نفرت مت دلاؤ اور آسانی کرو اور تنگی میں مت ڈالو۔ ہاں ایسا ہی شوق ہے تو تہجد میں پڑھو جتنا چاہو اور اس میں اور جس کا جی چاہے شریک ہو جائے مگر اس بھی امام کے علاوہ تین سے زیادہ جماعت میں نہ ہوں کہ فقہائے مکروہ کہا ہے کیونکہ پھر فضل میں فرض کا سا اتہام ہو جائے گا بعض لوگ ایک ہی شب میں ختم کرتے ہیں جسے شبینہ کہتے ہیں اس میں تو کئی بدعتیں ہیں غور کر کے دیکھ لیجئے کہ اس میں نیت صرف نمود کی ہوئی ہے کیا امام اور کیا ہتھم اور کیا سامعین امام تو داد ملنے کے امیدوار رہتے ہیں کہ جہاں سلام پھیرا اور لوگوں نے منہ پر تعریف کر دی تو خوش ہو گئے ورنہ پڑھا بھی نہیں جاتا۔ حدیث شریف میں منہ پر تعریف کرنے والے کے لئے حکم ہے کہ اس کے منہ پر خاک جھونک دو اور امام صاحب کے قلب پر بھی اثر ہوتا ہی ہے ورنہ تعریف کرینو لے کو بعضے امام نو قلمہ بھی نہیں لینے کہ اسی وجہ سے کہ لوگ کہیں گے کہ اچھا یا نہیں اور ہتھم تو سامعین میں شامل ہی نہیں ہوتے چائے پانی ہی سے فرصت نہیں ہوتی ہیں پوچھتا ہوں کہ

شبینہ سے چائے پانی مقصود ہے یا قرأت و سماعت قرآن ایک شے میں البتہ چائے سے مدد مل جاتی ہے سماعت اور قرأت میں مگر جب ذریعہ مقصود میں نخل ہوئے تو ذریعہ کہاں رہا اور یہ بھی جانے دیجئے مہتمم صاحب کو یہ ثابت کرنا منظور ہے کہ ہمارے ہاں فلاں مسجد سے اہتمام اچھا رہا ہے پس چائے پانی اچھا رہا مگر اصل شے تو اچھی نہیں ہی اور ہے سامعین تو انصاف سے کہہ دیجئے کہ وہ قرآن شریف سننے کے لئے آتے ہیں یا نماز کے ساتھ دل لگی کرنے کو۔ کچھ کھڑے ہیں کچھ بیٹھے ہیں کچھ کبھی کھڑے ہو جاتے ہیں کبھی بیٹھ جاتے ہیں کبھی کچھ لوگ بیٹھ بھی نہ سکے تو نیت توڑ کر لیٹے لیٹے سن رہے ہیں اور کریں بھی کیا بیچارے گھنٹوں تک کیسے کھڑے رہ سکتے ہیں اور بعضے جو اپنے اوپر جبر کر کے کھڑے بھی ہیں تو امام کی لغزشوں کو چھوڑتے جاتے ہیں وہ خواہ کسی ہی غلطی کرتا چلا جائے بتلا نہیں سکتے کیونکہ حرج ہو گا اور قرآن شریف ختم سے رہ جائیگا۔ بعضے تو یہ غضب کرتے ہیں کہ خارج صلوٰۃ سے لقمہ دیئے جاتے ہیں اس صورت میں اگر امام نے لیا نماز سب کی فاسد ہوئی اور نہ لیا تو وہ غلطی اگر مغیر معنی ہیں تو یہ یوں نماز فاسد ہوئی۔ اب ان سامعین کا گھنٹوں سے اپنے اوپر جبر کرنا بالکل ضائع کیا علیحدہ بیٹھ کر سننا اور یہ برابر ہوا، اور تکلیف مفت میں ہوئی۔ غرض لقمہ لینے کی صورت میں بھی معصیت ابطال عمل کی لازم آئی اور نہ لینے سے بھی نماز فاسد ہوئی ان سب صورتوں کو ملا کر آپ ہی کہہ دیجئے کہ نماز ہے یا کھیل احکام ظاہری کے لحاظ سے بھی تو نماز صحیح نہ ہوئی، خشوع و خضوع کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

اور ایک خرابی شبینہ میں یہ بھی ہے کہ اکثراً نفل کی جماعت لازم آتی ہے کیونکہ بعض ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اس کو تراویح کی جماعت میں کرتے ہوں کیونکہ سب مقتدیوں سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اول سے آخر تک شریک رہیں اور اسی کو تراویح رکھیں اس لئے تراویح علیحدہ پڑھ لیتے ہیں پھر نفلوں میں اس کو پڑھتے ہیں اور نفلوں میں جماعت مکروہ ہے غرض بہت سے منکرات اس شبینہ میں لازم آتے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ بعض حفاظ اپنا اپنا پڑھنے کے بعد مغالطہ دینے آتے ہیں یہاں آپ کہہ سکتے ہیں کہ سننے کو آئے ہیں اور یہ بے ادبی نہیں ہے اور ایسے بہت سے بدعات ہیں۔

ہاں اگر شبینہ میں ختم ہی مد نظر ہے مگر اخلاص کو غور کر لیجئے گا، تو امر حسن ہے اس میں بھی اعلان

کی ضرورت نہیں تاکہ ریاء و سمعہ سے خالی رہے۔ جتنی ہمت ہو قرآن شریف پڑھو امام کو گرہ میں نہ ڈالو اور سب منکرات مذکور سے بچو۔ ایک بدعت رمضان میں یہ ہے کہ نامحرم حفاظ گھروں میں جا کر عورتوں کو خراب ساتے ہیں اس میں چند قیاحتیں ہیں ایک یہ کہ جنہی مرد کی آواز جب خوش آوازی کا قصد کرے عورت کے لئے ایسی ہی ہے جیسے جتنی عورت کی آواز مرد کے لئے اور رواج یہی ہے کہ خوش آواز مرد تلاش کئے جاتے ہیں اور حافظ صاحب بھی مردوں کی جماعت میں تو شاید سادہ ہی پڑھتے یہاں خوب بنا بنا کر ادا کرتے ہیں سو عورتوں کے لئے جماعت کی ضرورت ہی کیا ہے اپنی اپنی الگ پڑھیں اور کچھ ضرورت محراب سننے کی نہیں ہے اگر حافظ ہیں تو فردی فردی اپنی تراویح میں ختم کر لیں اور اگر حافظ نہیں ہیں تو انکم مثر کیف سے پڑھ لیں اور ناظرہ جتنا ہو سکے پڑھ لیا کریں کیوں روپیہ خرچ کر کے گناہ مول لیا۔ دوسری بدعت اس میں استیجار علی العبادۃ ہے یعنی حافظ صاحب سے اجرت دیکر قرآن شریف پڑھوایا جاتا ہے اور استیجار علی العبادۃ حرام ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قبر پر حافظ کو مقرر کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس میں بھی استیجار علی العبادۃ ہے اس پر بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کیا ہو گیا ہے۔ علما کو میت کا ثواب ہی بند کر دیا۔ ہم کہتے ہیں اس کا ثواب ہی نہیں پہنچتا پھر بند کیا کر دیا کیونکہ ثواب پہنچنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اول عمل خیر کر نیوالے کو ثواب ملتا ہے پھر اسکو اختیار ہے جسے چاہے بخش دے جیسے اپنا مال جسے چاہے دیدے اور یہاں خود کو ہی ثواب نہیں ملا تو بخشا ہی کیا گیا۔ اگر کوئی کہے کہ قرآن شریف کا پڑھنا ثواب کی بات ہے اور اجرت لینا گناہ تو ایک معصیت اور ایک ثواب ہو گیا تو ثواب پہنچ جائیگا اور گناہ ہمارے ذمہ رہ جائیگا پھر ہم توبہ کر لیں گے تو یہ عمل حسن رہ گیا تو ہم کہیں گے اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ قاری کی نیت دیکھ لیجئے کہ استحصال مال ہے نہ ثواب پھر ثواب کہاں۔ جب اسی کو ثواب نہ ملا تو دوسرے کو کیا بخشے گا۔ بعض لوگ یہاں کہتے ہیں کہ یہ استیجارہ نہیں کیونکہ ہم کوئی مقدار مقرر نہیں کرتے جو ہمارے مقررہ میں ہے پہنچتا ہے سُبْحَانَ اللَّهِ الْمَعْرُوفِ كَمَا مَنَّتُ سُورَةُ جَوَابَاتِ مشروط ہوتی ہے اس کو بٹھرانے کی ضرورت کیا ہے اگر کسی طرح معلوم ہو جائے کہ یہاں کچھ نہ ملے گا وسط رمضان ہی میں حافظ صاحب چھوڑ کر بیٹھ رہیں ثابت ہو کہ مقصود حافظ صاحب کو اجرت ہی ہے ختم سے بخت نہیں اگر کوئی شخص خالی اندھن ہو اور اس جگہ رواج بھی دینے کا نہ ہو تو جو کچھ ہدیہ قبول کیا جائے اس میں کچھ حرج نہیں بلکہ ان کو ان کی ضرورت کے موافق بطور ہدیہ دیدیا کر داور چونکہ اس طرح سے دینے کی عادت نہیں اسی وجہ سے

ان کی نیتوں میں فساد پیدا ہو گئے۔ اگر بلا سوال و حیلہ ان کو دیدیا جایا کرے تو یہ نوبت کا ہے کو آئے۔ ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ وہ ایک جگہ پڑھنے گئے کھانا مقرر نہ ہوا اتفاق سے ایک موت ہو گئی اور وہاں کے لئے تو غمی تھی مگر اس بیچارہ کے لئے عید کا دن آگیا۔ ان کا کھانا چالیس دن کیلئے مقرر ہو گیا غنیمت سمجھا جب چلہ قریب ختم کے پہنچا تو فکر ہوئی کہ پھر وہی فائدہ آتا ہے اتفاق سے چلہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک اور موت ہو گئی ان کے ایک چلہ کا سامان اور ہو گیا اسی طرح کئی موٹے موٹے یکے بعد دیگرے لڑھک گئے ان طالب علم صاحب کو چاٹ لگ گئی اور ہر وقت انتظار میں رہنے لگے کہ کسی طرح کوئی مرے۔ ایک روز ایک شخص نے کہا کہ یہ طالب علم سائے محلہ کو اسی طرح کھا جائے گا ورنہ اس کا کھانا مقرر کر دو کہیں اس طرح بھی اللہ میاں پہنچا دیتے ہیں غرض یہ نوبت بدیہی کی کا ہے سے پہنچی صرف مستحقین کی خبر نہ لینے سے۔ یوں تو کبھی سانس بھی ڈھنگ کا نہ ملے ہاں جمعرات کے دن حلوے آجائیں گے اور جو کوئی جمعرات کی تخصیص سے منع کرے تو برا معلوم ہوگا صاحبو! کیا آٹھ دن کا کھانا ایک دن کھا سکتے ہو طالب علم غریب نے کیا قصور کیا ہے کہ ہفتہ بھر تک توفیق نہ کر آو اور ایک دن اتنا لا کر رکھ دو کہ کھا نہ سکے چاہیئے کہ ان کی خدمت کر دی جایا کرے تاکہ ان کی نیت نہ بگڑے لوگوں نے اس کو تو بالکل بھڑو دیا اور سب اس کا یہ ہے کہ خادماں میں کو لوگ حقیر سمجھتے ہیں اس لئے نہ ان کی کچھ وقعت ہے نہ خدمت اور نہ ہی وجہ سے یہ بھی رواج ہو گیا کہ مؤذن وہی ہوتا ہے جو کسی کام کا نہ ہو لو لے لنگڑے اپاہج جو کسی کام کے نہ رہیں وہ مؤذن بن جاتے ہیں پھر کوئی خبر نہیں لینا اسی وجہ سے منیتیں بگڑ گئیں۔ ایک میت کا چادر اکر کسی نے ایک فقیر کو دیدیا تھا مؤذن کو جو خبر لگی تو فوراً پہنچے کہ واہ صاحب میرا حق اس کو دیدیا خدا خدا کرے تو یہ دن آتا ہے اس میں بھی ہمارا حق اور وہ کو دیدیتے ہو۔ بیشک یہی بات ہے بہت انتظار کے بعد یہ دن نصیب ہوتا ہے مگر اس میں اس کا قصور نہیں ہے بلکہ ایک محلہ کا قصور ہے کیوں یہ نوبت پہنچائی اگر ہم لوگ مقرر کر لیں کہ گیارہ مہینہ میں اپنے کپڑوں کے ساتھ ایک کپڑا ان کو بھی بنا دیں اور جہاں آپ کھاتے ہیں کبھی کبھی ان کی بھی دعوت کر دیا کریں اور اپنے خرچ کے روپوں کے ساتھ ان کے لئے بھی کچھ روپیہ نکال دیا کریں غرض غیر رمضان میں ان کی برابر خبر گیری کرتے رہا کریں پھر رمضان شریف میں ان سے سوال کیا جائے کہ قرآن شریف سنا دیجئے تو کیا نہیں سنا دیں گے ضرور اور بخوشی منظور کر لیں گے ایسے استیجار علی العبادۃ وغیرہ بھی کوئی قباحت نہ لازم آئیگی۔ غرض جرت پر حافظ سے قرآن شریف پڑھونا جائز نہیں اور ایسے ہی عورتوں کو گھروں میں سنانا نامناسب ہے میں کہتا ہوں جب عورتوں کو مسجد میں

اول اُس کی غرض کا رفع ضرورت ہے یعنی ستر اور بیغرض ٹاٹ سے بھی حاصل ہو سکتی ہے دوسری غرض آرائش ہے یہ لباس میں ٹاٹ سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ سردی کے موسم میں تھوڑی سی روئی کے لحاظ سے بھی حاصل نہیں ہوتی جب تک کافی روئی نہ ہو شریعت میں اس کی بھی اجازت دی گئی ہے تیسری غرض آرائش ہے اور یہ بھی شریعت میں جائز ہے۔

إِنَّ اللَّهَ بِكُمُ لَئِيفٌ يُحِبُّ الْعَجَمَالُ وَاللَّهُ تَعَالَى جَمَالٌ وَلَا لَهْوَ جَمَالٌ كَالِإِنْدِ كَرْتَابٍ (پہلے آرائش مباح ہے اور اس میں طبائع مختلف ہوتی ہیں بعضوں کی غرض تو آرائش سے تحدیث بالنعمة یعنی خدا تعالیٰ کی نعمت کا اظہار ہوا کرتا ہے اور یہ محمود ہے اور بعضوں کی غرض آرائش سے یہ ہوتی ہے کہ محتاج لوگ اس کی وسعت کو دیکھیں اور اپنی حاجت کا سوال کریں اور ایک غرض عشاق کی آرائش سے (جیسا حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے) وہ یہ کہ اللہ میاں کو اچھا معلوم ہو اور اس سے اچھی کوئی غرض نہیں ہو سکتی۔ دکھایا بھی جائے تو اللہ میاں کو۔

اور ایک غرض مباح ہے آرائش سے وہ یہ کہ اپنے ہی نفس کو لذت و فرحت ہو اس میں بھی کچھ حرج نہیں۔ بیغرضیں صرف مال کی تو محمود ہیں اور غرض میں سے ایک غرض مذموم بھی ہے اور وہ ریا و نمازش ہے تو جان لو کہ اول تو نفس ریا ہی جائز نہیں پھر کثرتِ چراغ کے متعلق ایک دوسرا مقدمہ اور قابلِ نظر ہے وہ یہ کہ معصیت کو معصیت نہ کرنا آسان ہے اس سے کہ معصیت کو دین سمجھ کر کیا جائے تو چراغ ریا کے لئے جلائے جاتے ہیں اور ریا معصیت ہے پھر یہ لوگ اس کو دین اور ثواب سمجھتے ہیں تو کتنی سخت بات ہوئی یہ قباحتیں ہیں روشنی میں علاوہ بریں اہتمام کرنے والے تو روشنی ہی میں مشغول رہتے ہیں نماز میں ان کا دل نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات جسمی شرکت بھی نہیں ہوتی اُس روز کی تراویح ان کو معاف ہو جاتی ہے کہیں صفوں کے بیچ میں پھرنے میں کہیں ایک صف سے دوسری میں جانے میں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو کوئی گردنوں کو پھیلانے لگے گا اس کو پل کی طرح ڈال دیا جائیگا۔ قیامت کے روز کہ مخلوق اُس پر ہو کر گزرے گی اتنے احکام کی مخالفت لازم آتی ہے۔ روشنی میں۔ میں کہتا ہوں قرآن شریف اور احادیث کے احکام کیا اس لئے ہیں کہ بت پرست اس پر عمل کریں یا نصاریٰ عمل کریں اور مسلمان اپنے ہاتھوں میں لے کر بس فخر ہی کر لیا کریں۔ کچھ بعید نہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت میں شکایت فرمادیں یا رب ان قومی المتخذ واھذ

النسوان مہجوسا۔ قرآن کو سرت اپنے گھروں میں رکھنا اور زبان سے پڑھنا کافی نہیں بلکہ جو کچھ اس کے اندر ہے اس کو بھی دیکھو اور دل پر اثر ڈالو اور ایک منکر ختم کے دن شیرینی کا تقسیم کرنا ہے اور اس کا منکر ہونا اگرچہ خلاف ظاہر ہے مگر سمجھاؤ دیتا ہوں۔ یہ مٹھائی اگر ایک شخص کی رقم سے آتی ہے تو اس کا مقصود ریاء و اشتہار و افتخار ہوتا ہے اور اگر چندہ سے ہوتی ہے تو اس کے تحصیل میں جبر سے کام لیا جاتا ہے اور جبر حبیبی ایلام بدن سے ہوتا ہے ایسا ہی ایلام قلب سے بھی جب دوسرے کو دبا یا شرمایا جبر میں کیا شبہ رہا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کا حکم اُسی غضب کا سا ہے جو لاکھی کے زور سے ہو۔ اللہ میاں اُس تھوڑے ہی میں برکت دیتے ہیں جو رضا و خوشی کے ساتھ دیا جائے اس کا خیال بہت ہی کم لوگ کرتے ہیں۔ اکثر مسجدوں کے لئے بھی لوگوں سے محصل کی وجاہت کے ذریعہ سے وصول کرتے ہیں پھر اُس میں بھی بعضے محض فضول زینت کے لئے جس کی ممانعت آئی ہے اگرچہ اپنے ہی مال سے ہو۔ ہاں استحکام منع نہیں ہے مصالحو عہدہ لگایا جائے معمار تجربہ کار ہوں، اینٹ پختہ ہو۔ آرائش بالیق کسی قدر ہو تو مضائقہ نہیں اور اس کی تو کسی درجہ میں بھی ضرورت ہی نہیں کہ لوگوں سے غصب کر کر کے آرائش میں خرچ کیا جائے۔ مسجد چھپر کی بھی ادائے نماز کے لئے کافی ہے بلکہ جو مقصود ہے یعنی خشوع وہ چھپر میں پکی مسجد سے کچھ کم نہیں ہوتا بلکہ اس کے نقش و نگار میں ہی خیال بٹ جاتا ہے اور وہ اس سے محفوظ ہے تو جب اصل مقصود ہی حاصل نہ ہوا تو یہ تزئین کیا کرے گی۔ ایسا ہی حال ہے مٹھائی میں کہ اُس میں بھی کہیں جبر کہیں تفاخر ہوتا ہے اور اس کا امتحان یوں ہو سکتا ہے کہ اگر وسط صلوٰۃ میں آدمی زیادہ جھجھک ہو جائیں تو مٹھائی کی منکر پڑ جاتی ہے نمازیوں کو بھی اور مہتممین کو بھی مہتممین کو تو اپنی آبرو کی پڑ جاتی ہے اور نمازیوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اب ایک ہی بتا شدہ طے کا خشوع تو کو مسوں دور گیا، مٹھائی کیا آئی کہ اتنے گناہ چپکلائی۔ علاوہ بریں اکثر عام بے نماز لوگ آتے ہیں اور تعجب نہیں کہ بعضے جنب بھی ہوں پھر لوگ باتیں کرتے اور مغالطے دیتے ہیں اور لغویات کہتے ہیں غینین کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا ظلم سمیٹتے ہیں۔ یہی حال مولود مندر لیت کی مٹھائی کا ہے بعضے لوگ اس میں عرب کے فعل سے حجت پکڑتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو کسی کا فعل حجت نہیں پھر تم اپنے فعل کو ان کے فعل پر قیاس بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی تو ایسی بے

تکلفِ عادت ہے کہ جب کچھ آدمی رہ جائیں اور مٹھائی ختم ہو جائے کہہ دیتے ہیں خلاص یعنی ہو چکی، ان کو یہاں کی طرح سے آبرو وغیرہ کی فکر نہیں ہوتی، جس کو پہنچ گئی پہنچ گئی نہ پہنچے تو کچھ خیال نہیں بس کہاں تمہارا فعل اور کہاں اُن کا فعل ہے

کارِ پاکان را قیاس از خود بگیر

گرچہ مانند در نوشتن شیر و شیر

میں کہتا ہوں شیرینی کی ایجاد کی وجہ اصل میں اظہارِ مسرت ہے شکرِ اللہ علیٰ حصول النعمۃ لیکن جب مباح میں ایک منکر منضم ہو جائے بلکہ منتخب میں بھی تو اُس کا ترک ضروری ہے اور اس سے تو بہتر یہ ہے کہ محتاجوں کو دے دیا جائے جو روپیہ مٹھائی میں صرف ہوتا ہے۔ محتاج کی خبر گیری بالاتفاق امرِ حسن ہے تمام زمانہ میں کوئی بھی اس کا مخالفت نہ ہو گا اور نہ منکرات لازم آئیں گے جو نماز میں مغل تھے اور شیرینی میں فی نفسہ کچھ حرج نہیں بلکہ حرج اس ہنیت میں ہے بلکہ اس ہنیت کے ساتھ بھی فسادات دُور ہو جائیں۔ فساد لازم بھی فساد متعذی بھی، اور اس کے لئے پچاس برس سے کم میں کافی نہیں سمجھتا جب کہ اصلاح کا سلسلہ برابر جاری رہے اور اصلاح میں اس وقت یہ کافی نہیں کہ خاص لوگ منکرات سے بچ جاویں کیونکہ عوام اپنے فعل کے لئے اُسی کو سند گردانیں گے اور عوام سے جلدی ازالہ منکرات کی توقع نہیں پس اس وقت اصلاح یہ ہے کہ یہ عمل بالکل ہی ترک کر دیا جائے اور پھر اصلاح عقیدہ کا سلسلہ جاری رہے۔ جب عام طور سے عقیدے درست ہو جائیں تب میں بھی اجازت دید و نہکا لیکن اب تو بس ترک ہی کرایا جاوے گا غور کر لیجئے اور لا تقصروا بالصلوۃ کا قصہ نہ کیجئے جہاں شیرینی کا جواز ہے وہاں ان منکرات کی حرمت بھی ہے اور جب تک دونوں جمع ہیں حرمت ہی کو ترجیح ہوگی۔

مُجملہ ان رسوم کے ہمارے قصبات میں ایک یہ رسم ہے کہ عید کے دن سحری کے وقت اذانِ فجر کا انتظار کرتے ہیں، اور اذان کے وقت کہتے ہیں کہ روزہ کھول لو پھر کچھ کھاتے ہیں تو ان کے نزدیک اب تک رمضان ہی باقی تھا شوال کی پہلی رات بھی گزری اور اُن کے یہاں ابھی روزہ ہی ہے۔ حدیث شریف میں تو انظر الرویۃ ہے اور ان کے یہاں ایک شب اور

گزرنا چاہیے اور کوئی یہ نہ کہے کہ افطر الرویتہ پر عمل ہو گیا چاند دیکھ کر افطار کر لیا تھا اب رات میں کھانا نہ کھانا اور اذان کے وقت کھانا اپنا فعل ہے۔ کیونکہ میں کہتا ہوں کہ انکار اکل یا عدم اکل پر نہیں بلکہ یہاں عقیدے میں فساد ہے چنانچہ اس کو روزہ کھولنے سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے اور یہ زیادت فی الدین نہیں ہے تو کیا ہے ایسے موقع پر تو بالقصد رسم توڑنے کے لئے فجر سے پہلے ہی کھانا چاہیے بعض کا خیال یوں ہے کہ عقیدہ بدل دو اور درست کر دو لیکن اعمال کے بدلنے میں عام مخالفت ہوتی ہے اگر عمل باقی رہے جو کہ مباح ہے اور عقیدہ درست ہو جاوے تو کیا حرج ہے لیکن یہ خیال غلط ہے اس لئے کہ ثابت ہوتا ہے تجربہ سے کہ جیسا کہ عقیدہ کو اثر ہے عمل میں ایسا ہی اس کا عکس بھی ہے۔ ایک مدت تک میں اس خیال میں رہا کہ علماء کیوں پیچھے پڑے ہیں نکاح ثانی کے جائز ہی تھے کیا کیا نہ کیا پھر سمجھ میں آیا کہ جرح صدر سے نہیں نکلتا مگر عمل کو ایک مدت تک بدل دینے سے اس لئے رسوم میں عمل کی تبدیلی بھی ضروری ہے اور میرا یہ مطلب نہیں کہ عید کی شب میں کھانا فرض ہے بلکہ اخراج جرح کے لئے ایسا کرنے سے ضرور باجوہ ہو گا اس کی نظیریں حدیث شریف میں موجود ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک مرتبہ منع فرمایا۔ بعضے روغنی برتنوں میں بنید بنانے سے پھر فرماتے ہیں کنت لہتیکم عن الدباء والحنتم فانبذوا فیہا فان الظرف لا یحمل ثیثاً ولا یحرم یعنی پہلے میں نے منع کر دیا تھا اب اس میں بنید بنایا کرو اور علت ارشاد فرماتے ہیں کہ برتن نہ کسی چیز کو حرام کرتا ہے اور نہ حلال کرتا ہے پھر باوجود اس کے بھی منع فرما دیا تھا صرف وجہ یہ تھی کہ لوگ شراب کے عادی ہیں تھوڑے سے نشہ کو محسوس نہ کر سکیں گے اور ان برتنوں میں پہلے شراب بنائی جاتی تھی اس لئے خمر سے پورا اجتناب نہ کر سکیں گے اور گنہگار ہوں گے پس پوسے اجتناب کا طریقہ یہی ہے کہ ان برتنوں میں بنید بنانے سے مطلقاً روک دیا جائے جب طبیعتیں خمر سے بالکل نفور ہو جائیں اور ذرا سے نشہ کو پہچانتے لگیں تو پھر اجازت دے دی جائے اسی طرح ان رسوم کی حالت ہے کہ ظاہری اباحت دیکھ کر لوگ ان کو اختیار کرتے ہیں اور ان منکرات کو پہچانتے نہیں جو ان کے ضمن میں ہیں تو اس کے لئے اصلاح کا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ چند روز صل عمل ہی کو ترک دیں اور یہ بات کہ اصل عمل باقی رہے اور منکرات

عام طور سے دور ہو جائیں سو ہمارے امکان سے تو باہر ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار فرمایا تھا تو ہم کیا ہیں اس کے سوا اور تدا بیریں اختیار کرتے پھر یہ اور جب ایک تدبیر عقلاً بھی مفید معلوم ہوتی ہے اور نقلاً ثابت ہو چکی تو ضرورت ہی کیا ہے کہ اس سے عدول کیا جائے۔

ایک رسم عید کے دن ایک کھانے کی تعین کی ہے کہ سوتیاں ہی پکائی جاتی ہیں اسمیں ایک مصلحت ہے جس کی وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا ہے وہ یہ کہ اس کی نیاری میں زیادہ کچھڑے کی ضرورت نہیں اور دن عید کا کام کاج کا ہوتا ہے اور منتخب ہے کچھ کھا کر عید گاہ کو جانا اس لئے سہل الحصول چیز کو اختیار کر لیا بعد ازاں دوست احباب کے یہاں بھیجنے کا رواج ہو گیا۔ اس کی نظیر میں تہادی الی العروس کو پیش کیا جاتا ہے یہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت ہوا ہے یوں کہتے ہیں کہ جیسے دولہا کے پاس خوشی کا دن دیکھ کر ہدیہ بھیجنا مستحسن ہے اسی طرح عید کا دن بھی خوشی کا ہے احباب کے پاس کیوں تحفے نہ بھیجے جائیں۔ میں کہتا ہوں کہ مقیس علیہ ہی کو دیکھ لیجئے کہ ہر چند کہ تہادی الی العروس فی نفسه موجب زیادتی محبت ہے لیکن واللہ بطریق رسم بھیجنا بغض کو بڑھاتا ہے تجربہ اس پر دال ہے۔ ہاں خلوص کے ساتھ بھیجنے سے محبت بڑھتی ہے جیسا کہ دو دوست آپس میں ہدیہ کبھی کبھی بھیج دیا کریں اور رسم سے تو محبت بڑھتی نہیں۔ محبت اور خلوص کا جو اعلیٰ فرق ہے اس کو دیکھئے کہ رسم کو خصل لینے سے کیا حقیقت اس کی رہ جاتی ہے اور وہ فردہ محبت ہے جو پیر و مرید میں ہوتی ہے کہ ایسی کہیں دو شخصوں میں نہیں پائی جاتی کہ جان سے زیادہ عزیز مرید کے نزدیک شیخ ہوتا ہے اور مال تو کیا چیز ہے اور کبھی کبھی شیخ کی خدمت میں نذر گزارا کرتے ہیں اور اس سے خلوص بڑھ جاتا ہے مگر جب اسی نذر کو رسم قرار دے دیا تو دیکھ لیجئے کہ زمانہ کی پیری مریدی کا کیا حال ہے۔ خلوص تو کیسا جس جگہ پیر صاحب ہنچ گئے مرید آپ کو پھپھنے لگے کہ ایسا نہ ہو کہ چندہ کی فرست آپہنچے دعائیں مانگنی پڑتی ہیں کسی طرح پیر صاحب جلدی ملیں۔ اب فرمائیے کہ فی نفسہ تو شیخ کو ہدیہ دنیا موجب محبت تھا۔ یہاں موجب بغض کا ہے سے ہو گیا۔ صرف رسم سے میرے ایک دوست کا قصہ ہے کہ ایک مدت تک انھوں نے حضرت حاجی صاحب کے

پاس خط نہیں بھیجا میں نے ان سے وجہ پوچھی تو کہا میں اس عرصہ میں خالی ہاتھ تھا۔ فکر میں ہوں کچھ روپیہ کہیں سے مل جائے تو عریضہ لکھوں۔ میں نے کہا اس خیال میں مت پڑو اب تو ضرور بلا ہدیہ خط بھیجو۔ اب دیکھ لیجئے کہ ایک عرصہ تک اس خیال نے ان کو استفادہ سے روک دیا۔ فی نفسہ حق ہو مگر قیدِ رسم سے قہج آگیا۔ ایسے ہی عید کے دن کے ہدیہ ہیں اور اگر غور کیجئے گا تو ان ہدایا کو قرض پائے گا۔ کیونکہ دیتے وقت یہ ضرور نیت ہوتی ہے کہ اس کے یہاں سے بھی آئے گا اور اگر ایک مرتبہ نہ آئے تو اُدھر سے بھی بند ہو جاتا ہے اور ہدیہ کی تعریف میں بلا عوض کی شرط ماخوذ ہے پس یہ ہدیہ بھی نہ رہا پھر قرض دار ہونے سے یا قرض دار کرنے سے کیا فائدہ

حاصل یہ کہ جن اعمال میں فساد ہے ان اعمال سے اجتناب چاہیئے ذرا سی خوبی کو دیکھ کر بڑے بڑے منکرات میں پڑ جانا عقل سے بعید ہے۔ اب بیانِ حتم کرتا ہوں اور اصل مقصود کا خلاصہ پھر مختصراً اعادہ کرتا ہوں کہ روزہ رکھا مگر سپٹ حرام سے بھرا اور دن کو بھی غیبت وغیرہ میں مبتلا رہے تو یہ روزہ کس شمارہ میں ہے۔

حاصل یہ کہ روزہ کے آداب بیکھو اور عورتوں کو بھی سکھاؤ۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کم من صائم ذائقہ الحدیث یعنی بہت سے روزہ رکھنے والے اور قیامِ اللیل کرنے والے وہ ہیں کہ ان کی بھوک اور پیاس کی طرف اللہ میاں کو کچھ حاجت نہیں۔ اور آداب کے موافق اگر ختم کر لیا تو اُس کے حق میں فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ تشفعان

یعنی روزہ نماز و لوگوں شفاعت کریں گے۔ پس اس شخص کے ساتھ دو محافظ موجود ہوں گے۔ عذاب سے بچانے کے لئے پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ جس کے دو محافظ سرکاری موجود ہوں کیا اُن کی نجات نہ ہوگی۔ خدائے تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرما دیں۔ والسلام

تَمَّتْ بِالْخَيْرِ

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوا عَنِّي لَوْ آيَةً

(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)

دعواتِ عہدیت جلد دوم کا

دوسرا و غلط ملقب بہ

حقوق القرآن

منجملہ ارشادات

حکیم الامتہ مجدد الملتہ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمت اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر

محمد عبد المتان غفرلہ

مکتبہ تھانوی، دفنہ الالبقا

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۷
ایم اے جناح روڈ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

دعواتِ عبدیت جلد دوم کا
وعظ دوم ملقب بہ

حقوق القرآن

توبہ	مناجی	کلمہ	تسبیح	منا	من فضیلت	الاستیعون	اشکات
کہاں پڑا	کب پڑا	کتنے پڑا	کھڑے پڑا	کیا غم تھا	کس نکلی	سنا سنائی	متفرقات
مدرسہ خاتم النبیین	۱۳ ربیع الثانی ۱۳۱۳ھ	"	"	ترغیب و تمہید	حجرت نبوی	"	"

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله محمدًا ولسنعمینا وفتنغفرہ ونومن بہ ونوکل علیہا ونعوذ باللہ من شرورہا
انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یرہدہ لا اللہ فلا مفضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ و
نشهد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشهد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلىٰ آلہ واصحابہ وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ - الَّذِیْنَ اَتَتْهُمْ اَنْکُتُکُمْ یَتْلُوْنَہَا حَقَّ تِلَاوَتِہَا اُولَٰئِکَ
یُؤْمِنُوْنَ بِہَا وَمَنْ یُکْفُرْ بِہَا فَاُولَٰئِکَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ۝

یہ آیت سورۃ بقرہ کی ہے ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو تلاوت

کرتے ہیں جیسا حق ہے تلاوت کا ایمان والے یہی ہیں اور جو کتاب پر ایمان نہ لائے وہ خسارہ والے ہیں۔ اس کی دو تفسیریں ہیں مگر دونوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ تلاوت کرنے والوں کی مدح ہے۔ اس آیت میں ہرچیز کہ کتاب سے مراد توریت ہے مگر ظاہر ہے کہ توریت کی تلاوت کے قابل مدح ہونے کا سبب توریت کا کتاب اللہ ہونا ہے محض کتاب ہونا نہیں ہے اور چونکہ قرآن پاک افضل کتب ہے تو اس کی تلاوت اور زیادہ قابل مدح ہوگی اور اسی آیت سے اُس کی فضیلت بطریق اولیٰ ثابت ہوگئی چونکہ اس مدرسہ کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے اس لئے بیان کے لئے یہ آیت زیادہ مناسب معلوم ہوئی۔ اس آیت سے قرآن مجید کے تلاوت کرنے کی اور اس کے حقوق ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوئی ہے اور یہ بات بدیہی ہے کہ تلاوت بلا سکھ ہوئے اور پڑھے ہوئے کیسے ہو سکتی ہے۔ سیکھنا اور پڑھنا اس کا موقوف علیہ ہے اور مقدمہ ضروری کا ضروری ہوتا ہے اگر آپ باورچی کو حکم دیں کہ کھانا پکا تو اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ہانڈی چولہے پر رکھ کر آج دے لا بلکہ بازار سے گوشت لا اور مصالحہ لا اور اناج لا اور پکانے کے برتن ہتیا کر اور آگ جلاتب ہانڈی کو آئینج دے چنانچہ کھانا پکانے کے حکم کے بعد باورچی کا ان سامانوں میں لگا رہنا آپ کے نزدیک امر کاموں کے نہ کرنے کا عذر سمجھا جاتا ہے اور ان کاموں میں اُس کا لگا رہنا پکانے ہی کے حکم کی تعمیل سمجھا جاتا ہے اگر اناج مثلاً نہ ہو اور وہ بیٹھا ہے اور عین وقت پر عذر کرے تو یہ عذر اُس کا آپ ہرگز نہ سنیں گے کہ حضور آپ نے مجھے صرف پکانے کا حکم دیا تھا یہ نہیں فرمایا تھا کہ اناج بھی مگنا ہے اس عذر نہ سننے کی وجہ کیا ہے یہی کہ کسی چیز کا حکم اس کے اسباب و مقدمات کا بھی حکم ہے۔ الشئ اذا ثبت ثبت بلوا (وضہ) (جو چیز ثابت ہوتی ہے تو اپنے تمام لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔) بنا بریں تلاوت کتاب کا مطلوب ہونا اُس کے سیکھنے اور پڑھنے کا بھی مطلوب ہونا ہے جو فضیلت تلاوت کی ہوگی وہی فضیلت سیکھنے کی ہوگی۔ اور جس قدر ضرورت تلاوت کی ہوگی اسی قدر ضرورت سیکھنے کی بھی ہوگی۔ غرض قرآن شریف کا سیکھنا ضروری ہوا اور دیکھئے کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے صرف یتلون نہیں فرمایا بلکہ حق تلاوت کی قید بھی بڑھائی اور اس میں اور اس میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً ایک تو یوں کہیں کہ یہ کام کر لاؤ اور ایک یہ کہ یہ کام خوب سوچ سمجھ کر کر لاؤ۔ اس دوسرے لفظ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نفس کام کرنے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تا وقتیکہ وہ من کل الوجوہ

مکمل نہ ہو اس سے نفس امر کی اور زیادہ تاکید ہو جاتی ہے تو آیت میں نفس تلاوت کی اور زیادہ تاکید ہو گئی۔ پھر نفس تلاوت میں تشدید ہو جانے سے اس کے مقدمہ یعنی سیکھنے کے حکم میں بھی تشدید ہو گئی۔ غرض قرآن شریف کا سیکھنا ضروری بلکہ نہایت ضروری ہوا۔ پھر اتنا سیکھنا بھی کافی نہیں ہوگا کہ نفس تلاوت کا ذریعہ ہو بلکہ اتنا سیکھنا چاہیے کہ حقوقِ تلاوت ادا ہوں۔ اب سمجھئے کہ حقِ تلاوت کیا ہے ہمیشہ یاد رکھتے کہ جس چیز کی فضیلت بیان ہو اور جس چیز کی بُرائی بیان ہو اس کی حقیقت سمجھ لینا چاہیے۔ اگر وہ چیز اپنی حقیقت پر ہو تو قابلِ فضیلت یا برائی ہے ورنہ نہیں یہاں تلاوت کتاب اللہ کی فضیلت بیان ہوئی لہذا اس کی حقیقت سمجھ لیجئے کہ حقِ شجاء تعلق لے لے اپنی کتاب اتاری جو مجموعہ ہے اوراد کا اور قصص اور حکایات کا اور احکام اور جامع ہے تمام بھلائیوں کو قطع نظر نہ نام خوبیوں سے محض کلام اللہ ہی ہونا اس کا مقتضی اس امر کا ہے کہ ہم جیسے ناچیز بندوں کی اس تک رسائی بھی ملے ہوتی۔ کہاں وہ کلام مقدس کہاں ہم حقیر بندے۔ دیکھ لیجئے دنیا کے ذرا ذرا سے بادشاہوں کے دربار کی حاضری کے لئے لوگ کتنی کتنی کوشش کرتے ہیں اور عمریں گزار دیتے ہیں تب کہیں سلام کرنے کا موقع ملتا ہے اور جس کو ایک دو بات کرنے کا موقع مل گیا وہ اپنے آپ کو کتنا کچھ سمجھنے لگتا ہے اور تمام سلطنت بھر میں اس کی کیا عزت ہو جاتی ہے جب کلام شاہانِ دنیا کی یہ عزت ہے تو شاہ شاہان اور حکم الساکین کے کلام کی کیا کچھ عظمت ہونی چاہیے۔ شاہانِ دنیا کا کلام دو چار برس کی تمنا اور کوششوں کے بعد میسر ہوتا تو کلام الہی اگر کچھ بھی نہیں تو دو چار برسوں کی محنت کے بعد تو نصیب ہونا چاہیے مگر نہیں کس درجہ رحمت ہے اللہ میاں کی کہ ہمارے ہاتھوں میں اپنی کتاب دیدی اور اذن عام دے دیا کہ جس کا جس وقت جی چاہے ہم سے باتیں کرے۔ پھر صرف اذن ہی نہیں بلکہ مطالبہ بھی ہے بندوں سے کہ باتیں کرو اب ہم بندے اپنی ذلت اور حکم الساکین کی عزت کو پیش نظر رکھے دیکھیں کہ یہ باتیں کر نیکی فرمائش کیا چیز ہے سوائے اسکے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ محض فضل ہے۔ معلوم ہو گیا کہ تلاوت کتاب اللہ کی حقیقت اللہ میاں سے باتیں کرنا ہے اب اس آیت میں فرماتے ہیں کہ تم ہم سے باتیں تو کرو گے مگر قاعدے اور ادب کے ساتھ کرنا۔ یَتْلُوْنَهُ حَقًّا تِلَاوَتِہٖ فکر کیڈباً تو اخبار ہے مگر مقصد انشاء ہے یعنی تلاوت کرنے والوں کو چاہیے کہ تلاوت

کے حقوق ادا کریں جب تملادت کی حقیقت معلوم ہوگئی تو اب سمجھ لیجئے کہ حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں باطنی اور ظاہری۔ قربان جائیے تعلیم شریعت کے اعمال میں صرف بناوٹ ہمیں سکھائی بلکہ ظاہری حقوق بھی بتائیے اور باطنی بھی اور باطنی کو ظاہری سے زیادہ ضروری رکھا۔ مثلاً ماں باپ کے حق ظاہری کو فرمایا۔ **وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذِّكْرِ** کہ ان کے سامنے پستی اختیار کر دو وضع میں قطع میں تکلم میں نشست و برخاست میں غرض ہر چیز میں اُن سے نازل ہو۔ تو کسی بات میں اُن پر ترفع مت کرو۔ یہ تو حق ظاہری ہے اور حق باطنی کو سبحان اللہ کیسے ذرا سے لفظ سے ادا فرمایا یعنی **«مِنَ التَّخَمُّتِ»** یعنی اُن کے سامنے زہی ظاہری پستی پر اکتفا نہ کرو اس کا کچھ اعتبار نہیں بلکہ اس ظاہری پستی کا نشاءِ رحمت ہو۔ رحمت رقتِ قلب کو کہتے ہیں یعنی اُن کی خدمت دل سے کرو جیسا کہ ظاہر اُن کے سامنے پست کیا ہے۔ باطن کو بھی پست کرو۔ دل کے اندر خشوع بھی ہو خضوع بھی ہو۔ قرآن میں کوئی ضروری بات چھوڑی نہیں جاتی یہ بھی خوبی ہے کلام اللہ کی تعلیم کی کیسی حکیم یا کسی فلسفی کی تعلیم میں یہ بات نہیں پائی جاتی اور اس پر بھی اکتفا نہیں کیا۔ آگے فرماتے ہیں **«وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا»** راد رکھو لے پروردگار ان دونوں یعنی والدین کو رحمتوں سے نواز۔ جس طرح کہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی اور تو اُن حقوق کا حکم تھا جن کی ادا کا عہدِ اسلام والدین کو اور لوگوں کو وقت ادا ہو جائے گا اور اس میں فرما دیا تھا کہ صرف ظاہری بناوٹ نہ ہو اُن کو بھی دل سے ادا کرو یہاں حکم ہے کہ ان کے حقوق کو بھی ادا کرو جن کی اطلاع نہ ہو **قُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا** یعنی ان لوگوں کے لئے دعا بھی کرو۔ یہ بھی ایک حق باطنی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حق تین ہیں ظاہری اور باطنی اور باطن اور تینوں قسم کے ادا کا حکم ہے اسی طرح حق تملادت بھی مختلف ہوتے ہیں۔ میں اس کی ایک مثال دیئے دنیا ہوں جس سے اچھی طرح توضیح ہو جائے گی۔ فرض کیجئے کہ بادشاہ کسی کے ہاتھ میں شاہی قانون دیکر کہے کہ اسکو پڑھو تو اُس کی حالت پڑھنے کے وقت یہ ہوگی کہ ہر لفظ کو صاف پڑھے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا پڑھنا بادشاہ کے ناپسند ہو اور اس کے معنی اور مفہوم کو بھی سمجھتا جائے گا ایک تو اس خیال سے کہ عبارت کا لہجہ بلا معنی سمجھے ہوئے ٹھیک نہیں ہو سکتا اور ایک اس خیال سے کہ شاید کہیں بادشاہ پوچھ بیٹھے کہ کیا مطلب سمجھا تو خفت نہ ہو اور ایک حالت ان پڑھنے والوں کی یہ ہوگی کہ دل میں اس قانون کے

احکام کی تعمیل کا بھی عزم ہوگا اور یہ کسی قرینہ سے ظاہر نہ ہونے لگے گا کہ میں اس کی پابندی میں کچھ کوتاہی کرتا ہوں بلکہ حال سے قال سے یہی ثابت کرے گا کہ میں سب سے زیادہ تعمیل کرنے والا ہوں بس اس مثال کو ذہن میں حاضر رکھئے اور سمجھئے کہ قرآن مجید کی تلاوت میں بھی اسی طرح کے تین مرتبے ہیں۔ ایک مرتبہ الفاظ ظاہری کا ہے یعنی ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ صاف صاف اور اپنے محرج سے ادا کرنا۔ اور ایک مرتبہ معنی کا یعنی مدلول الفاظ کو سمجھ لینا یہ نہیں کہ خیال کہیں ہے صرف طوطے کی طرح سے لفظ ادا کرتے۔ یہ مرتبہ حق باطنی کا ہے۔ اور ایک مرتبہ اس سے بھی ابلطن ہے وہ اس کے احکام پر عمل کرنا ہے جب یہ تینوں باتیں جمع ہوں گی تب کہا جائے گا کہ حق تلاوت کا ادا کیا غرض کل تین حق ہوئے ایک حق ظاہری یعنی تلاوت۔ دوسرا حق باطنی یعنی معنی سمجھ لینا۔ تیسرا عمل کرنا یہ بمقابلہ دوسرے کے بھی باطن ہے تو اس کو ابلطن کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ معاملہ فیما بینہ و بین اللہ ہے۔ ان تینوں میں وجوداً سب سے مقدم حق ظاہری ہے۔ اور نوگد سب سے زیادہ تیسرا درجہ ہے یعنی عمل۔ ان دونوں میں حقیقت اور صورتہ کا فرق ہے اصل چیز حقیقت ہی ہوتی ہے لیکن وجود اس کا لباس صورت میں ہوتا ہے اسی وجہ سے صورت مقدم ہوتی ہے اور ضروری دونوں ہیں پس حقیقت بلا صورت کے باطل ہے اور صورت بلا حقیقت کے طحال غرض ثابت ہوا کہ عمل بھی ایک حق ضروری ہے یہ نہیں کہ محض مرتبہ مستحب ہی میں ہے دیکھئے اللہ میاں لے آگے فرمادیا اُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِالْجَوَازِغِ تِلَاوَتِ كَا حَقِّ اَدَا كَرْتِے ہيں وہي ايمان ركھتے ہيں۔ یعنی کامل انہیں کا ہے پس عمل موقوف علیہ ہے کمال ایمان کا اور کمال ایمان کی تحصیل واجب ہے ضرور عمل بھی واجب ہوگا۔ کمال ایمان کا وجوب اس آیت میں صاف مصرح ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ

۱۱ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ (لے ایمان والو خدا سے ڈرو جیسے کہ ڈرنا چاہیے) اس میں صیغہ امر کا ہے اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ آیت اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ دوسری آیت فَاَتَقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ دجہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو) سے منسوخ ہے تو سمجھ لیجئے کہ نسخ فرع ہے تعارض کی اور ان دونوں میں خود تعارض نہیں بلکہ دوسری آیت پہلی کی موضح ہے کیونکہ جب مَا تَقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ اتوی تو صحابہؓ کو مشہد ہو کہ امر کا ہے فور میں مستعمل ہوتا ہے اس آیت میں کہیں یہی مراد نہ ہو اور ایسے امر عظیم میں فور دشوار تھا اس لئے دوسری آیت میں مراد بیان

فرمادی کہ تکلیف بقدر استطاعت ہے تدریجاً مامور بہ کو حاصل کر لو۔ اس کو بعض روایات میں نسخ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ سلف کی اصطلاح اس لفظ میں اصطلاح مشہور سے عام تھی اور اگر چند کہ امر سے فوراً کا مفہوم ہونا موقوف قرینے پر ہے لیکن صحابہؓ کو بوجہ غلبہ خشیت کے اس کا احتمال ہوا کسی نے خوب کہا ہے ۵

باسایہ ترانے پسندم عشق ست و ہزار بدگمانی
(یعنی یہ بات مجھے گوارا نہیں کہ تو اپنے سایہ کے ساتھ ہی کھڑا ہو کیونکہ عشق و محبت میں ہزاروں بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں)

اس توجیہ سے دونوں آیتوں میں تطبیق ہو گئی اور نسخ لازم نہ آیا۔

غرض حق تلاوت کا تیسرا درجہ منتخب نہیں بلکہ واجب ہے۔ ہاں وجوب فی الفور نہیں تدریجاً ہے مسلمان ہوتے ہی یہ فرض نہیں ہو جاتا کہ جملہ فروغ ایمان پر بھی عبور ہو جائے اور نہ یہ فرض ہو جاتا ہے کہ قرآن شریف کے تینوں حق فوراً ہی ادا کرے بلکہ مہلت دی گئی ہے کہ اس میں سیکھ لینا چاہیے۔ البتہ یہ جائز نہیں کہ بالکل بیٹھ رہے اور کمال کی طرف توجہ نہ کرے۔ غرض حق ظاہری تو یہ ہے کہ ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ترتیل کی یہ تفسیر منقول ہے۔ **تَجْوِیْدُ الْقُرْآنِ وَمَعْرِفَةُ الْقُرْآنِ** ترتیل اس کو کہتے ہیں۔ پھر ہم آجکل کی حالت دیکھتے ہیں کہ ہمارے امام جن کو بڑی بڑی جماعت میں سے منتخب کر کے مقرر کرتے ہیں وہ بھی قرآن صحیح نہیں پڑھتے۔ اس سے تمام مسلمانوں کے پڑھنے کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب امام لوگ جو اقل الناس اور منتخب ہیں وہی غلط پڑھتے ہیں تو عام لوگ کیا صحیح پڑھنے ہوں گے۔ اس ظاہری حق کے ادا کی یہ کیفیت ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترتیل سکھائی ہے اور وہی آج تک چلی آرہی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سکھانا باری تعالیٰ کی تعلیم ہے اسی کو کہا ہے ۵

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

(یعنی ان کا کلام خدا ہی کا کلام ہے اگرچہ (بظاہر) خدا کے بندے کی زبان سے ادا ہو رہا ہے)

اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں **وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ** یعنی آپ کی زبان سے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں نکلتی۔ اس دلیل سے ترتیل باری تعالیٰ کی سکھلائی ہوئی ٹھہری پھر اس

نعمتِ عظمیٰ کی کیا۔ یہی قدر ہے کہ اس کو اس طرح سے غارت کیا جائے جس کی سبباً تعلق لے کر تو اس کا اہتمام کہ حدیث میں ہے لایزال کٹاؤفت من امتی منصورین علی الحق لایضرھم من خذلھم میری امت میں ایک گروہ حق پر ہمیشہ کامیاب رہے گا کہ اس کو کسی کے ساتھ چھوڑ دینے سے نقصان نہ پہنچے گا اس گروہ میں تمام وہ لوگ داخل ہیں جو دین کی کسی قسم کی علمی یا علمی خدمت کر رہے ہیں اسی میں علوم قرآن کی خدمت بھی آگئی پس اس پر خدا مان قرآن کے قائم رکھنے کا وعدہ ہے اور خود قرآن میں بھی وعدہ فرمایا گیا ہے وَإِنَّا لَنَاحِظُونَ کہ ہم خود اس کے محافظ ہیں اور یہ بدیہی بات ہے کہ اللہ میاں نے کسی تالے میں بند کر کے تو اس کی حفاظت کی نہیں۔ اللہ میاں کی حفاظت کی صورت یہی ہے کہ اپنے چند بندوں کو اس کام پر تعینات رکھیں گے۔ معلوم ہوا کہ ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہے گا کہ تصوف پڑھے پڑھائے گا اور ایک گروہ ایسا بھی رہے گا کہ فقہ سکھائے گا اور ایک گروہ ایسا بھی رہے گا کہ حدیث شریف کی خدمت کرے گا اور ایک گروہ ایسا بھی رہے گا کہ تفسیر کا مشغلہ رکھے گا اور ان کے ساتھ ایک گروہ ایسا بھی رہے گا کہ قرآن شریف پڑھے گا۔ اور قرأت کا محافظ ہوگا۔ غرض حق سبحانہ تعالیٰ کو تو اس کا اتنا اہتمام اور ان کے بندوں کو اتنی بے پروائی کہ مسلمانوں میں فی ہزار بھی ایک قاری نہیں افسوس کہ اس طرف توجہ ہی نہیں رہی اور اگر کوئی توجہ بھی کرتا ہے تو اس کی بڑی دوسری ہوتی ہے کہ ضاد اور ظا کا مباحثہ شروع کر دیا اس میں رسالے لکھے جارہے ہیں۔ اور کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں علماء کے پاس استفتے بھیجے جاتے ہیں اور اکثر تو یہی دیکھتا ہے کہ اکثر اس پوچھنے سے اصلی غرض صرف اپنی بات اوچی کرنا ہوتی ہے تحقیق کسی کو مقصود نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے جھگڑے کرنے والے دور ہی سے استفتے بھیجتے ہیں۔ تو فیق نہیں ہوتی کہ کھوڑا خرچ گوارا کر کے دونوں کسی ماہر کے پاس چلے جائیں اور اس حرف کو صحیح طور پر سیکھ لیں۔ میں کہتا ہوں اس استفتے کے جواب میں مجیب کیا لکھے گا سوائے اس کے کہ مختصر بیان کر دے۔ سو یہ نو کتابوں میں بھی لکھا ہے پھر جو اختلاف اور نزاع باوجود کتاب میں خرچ لکھے ہونے کے ہوا ہے وہی اس فتوے کے بعد بھی ہو گا کیونکہ مفتی ضاد کی صورت کو کاغذ پر نہیں لکھ سکتا۔

گر مصوّر صورت آں دلستاں خواہد کشید یک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید
(یعنی اگر یہ تسلیم کریں کہ مصوّر اس دلبر کی تصویر (واقعی) اتارے گا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے
کہ اس کے ناز و ادا کی عکاسی کیسے کرے گا)

علم موسیقی اور قرأت میں تو سننے ہی کی ضرورت ہے لکھ بھیجنے سے کیا ہوتا ہے صوت
کی صورت کا غذیر کیسے آسکتی ہے۔ بعض لوگ فن قرأت کو حاصل نہ کرنے کا یہ عذر پیش کرتے
ہیں کہ ہم قاری تو ہونے سے پہلے اس کے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔ کام ہو تو پوری طرح ہو اور
نہیں تو چھیڑنا فضول۔ صاحبو! یہ محض جیلہ نفس ہے مانا کہ قرأت میں عاصمؓ اور حفصؓ نہیں
ہو جاؤ گے تو اچھا فرقہ میں بھی ابو حنیفہ نہیں ہو جاتے پھر فرقہ کیوں پڑھتے ہو اور دنیا میں بھی تو
ہر شخص بادشاہ نہیں ہو جاتا پھر دنیا کی طلب کیوں کرتے ہو۔ اس میں یہ قاعدہ جاری نہیں
کرتے کہ کام ہو تو پوری طرح ہو ورنہ چھیڑنا فضول ہے۔

صاحبو! قرأت میں عاصمؓ اور حفصؓ ہونے کی اور فرقہ میں ابو حنیفہؒ ہونے کی تکلیف آپ
کو نہیں دی جاتی صرف اس قدر تکلیف دی جاتی ہے کہ بقدر وسع کوشش کرو اور بقدر ضرورت
قرآن شریف کو صحیح کر لو۔ اگر آپ اپنی حیثیت کے موافق کوشش کریں تو قدر ضروری تو حاصل ہو جائیگا
بالفرض اگر کوشش پر کامیابی بھی نہ ہو تب بھی کچھ غم نہیں اللہ میاں کے ہاں تو زمرۂ قرأت
میں لکھ لئے جاؤ گے کسی کا قول ہے ۷

ہیمنم بس کہ داند ما بہ اویم کہ من نیز از خرداران اویم
دیہ ہی ہمارے لئے بہت ہے کہ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ میں اسی کے ساتھ ہوں اور میں
خردایوں اور طلب گاروں میں سے ہوں)

میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا کہ فرماتے تھے طلب مقصود ہے وصول مقصود نہیں اور
ظاہر بھی ہے کہ اللہ میاں نے تکلیف مالا یطاق نہیں دی۔ صرف امور اختیار یہ کی تکلیف
دی ہے اور مقصود تک پہنچ جانا بندے کے اختیار میں ہے نہیں تو اس کی تکلیف کیوں ہوگی
کیا اچھا کہا گیا ہے ۷

گر مرادت ما مذاق تسکراست بمرادی نے مراد دلبراست

اور صاف جو ضروری قرأت کچھ مشکل بھی تو نہیں کل اٹھائیس حرف ہیں اگر ایک ایک دن میں ایک ایک حرف سیکھتے تب بھی اٹھائیس دن میں بقدر ضروری قاری بن سکتا ہے مگر بات یہ ہے کہ شیطان نے رہزنی کر رکھی ہے۔ جب کوئی اس کا ارادہ کرتا ہے تب ہی وہ کہہ دیتا ہے میاں قرأت کہیں تمہارے بس کی ہے۔ جب کسی سے کہا جاتا ہے فترآن شریف صحیح کرو تو کہتے ہیں ہم بڑھے طوطے ہیں اب ہماری زبان کہیں ٹوٹ سکتی ہے۔ اچھا صاحب، آپ تو بڑھے طوطے ہیں بھلا اولاد نے کیا تصور کیا ان کو کیوں نہیں سکھاتے۔ یاد رکھو جیسے اولاد کے اور حقوق آپ پر ہیں ویسے ہی یہ بھی حق ہے اگر آپ نے یہ حق ادا نہ کیا اور وہ تمام عمر قرآن شریف غلط پڑھتے رہے تو اس کی جواب دہی آپ کے ذمہ ہوگی۔ لیکن فترآن کی طرف توجہ ہی نہیں قرأت تو درکنار اس کا تو پڑھنا بھی بہت کم ہوتا جاتا ہے۔ بعضے کہتے ہیں اس سے دماغ خراب ہوتا ہے انگریزی کے قابل نہیں رہتا۔ بعض کو میں نے یہ کہنے ہوئے سنا ہے کہ جب سمجھ میں نہ آیا تو زبے پڑھنے سے کیا فائدہ میں کہتا ہوں کیا فائدہ سمجھنے ہی میں منحصر ہے۔ بس فائدے کا یہ ایک ہی مصداق ہے کیا اور کوئی مصداق نہیں۔ یاد رکھو اس کے بلا سمجھے ہوئے پڑھنے میں بھی فائدہ ہے اور وہ فائدہ یہ ہے جس کی خبر حدیث میں ہے کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں۔ کیا نیکیاں ملنا فائدہ نہیں اور دوسرا فائدہ وہ ہے جو دوسری حدیث شریف میں ہے مَا اِذْنَ اللّٰہُ لَشَیْءٍ مَا اِذْنَ لِنَبِیِّیْہِ بِتَغْنٰی بِالْقُرْآنِ۔ یعنی اللہ میاں کسی چیز کو ایسا کان لگا کر نہیں سنتے جیسا کہ قرآن شریف کو سنتے ہیں جب کہ اُس کو نبی خوش آوازی سے پڑھتے ہوں اس میں نبی کی تخصیص اتفاقی ہے اور تغنی کی تفسیر خود روایات میں آئی ہے کہ خشوع سے پڑھتا ہو تو کیا خدا تعالیٰ کا متوجہ ہونا بندہ کی طرف یہ فائدہ نہیں ہے۔ ایک قصہ یاد آیا میرے مرشد علیہ الرحمۃ فرماتے تھے کہ ایک بار دہلی میں ایک موکان پر گزر ہوا تو کیا دیکھتے ہیں ایک ہجوم ہو رہا ہے اور درمیان میں ایک شخص بیٹھا ہوا رسالہ در دنامہ جو حضرت مرشد کا کلام ہے ذوق و شوق سے پڑھ رہا ہے حضرت بھی اس کو سننے کو کھڑے ہو گئے۔ اور خوش ہوئے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ایک بار پانی پت کو جاتے ہوئے راہ میں پیش آیا۔ غرض قاعدہ یہ ہے کہ مصنف جب کسی اپنی تصنیف

پڑھتے دیکھتا ہے خوش ہوتا ہے اور اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ قرآن شریف کیا ہے حق سبحانہ کی تصنیف ہے جب یہ پڑھا جاتا ہے تو حق تعالیٰ متوجہ ہوتے ہیں کہ میرا بندہ میری تصنیف پڑھ رہا ہے اگر کچھ بھی نہ ہو تو یہ کیا کم ہے کہ اللہ میاں کی خوشنودی ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سے حکام کی خوشنودی کے لئے لوگ کیا کیا کلفیتیں گوارا کرتے ہیں اور کتنے کتنے خرچ کے متحمل ہوتے ہیں کہیں ڈالیاں بھیجی جاتی ہیں کہیں دعوتیں ہوتی ہیں اپنے بہت سے کام حرج کئے جاتے کیا حق سبحانہ تعالیٰ کا اتنا بھی حق نہیں۔ اس غلطی میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں کہ فائدہ کو منحصر جان لیا ہے معافی کے سمجھنے میں اسی وجہ سے کہہ دیتے ہیں کہ بچوں کو قرآن شریف پڑھانے سے کیا فائدہ بس پڑھانا ہی چھوڑ دیا۔ اگر کسی نے پڑھا بھی۔ لیکن حفظ کرنے کا رواج چھوڑ دیا حالانکہ صرف ناظرہ پڑھا ہو قرآن شریف بلا حفظ کے اگر چند روز کو چھوٹ جائے تو پھر دیکھ کر بھی پڑھنا مشکل ہے۔ غرض ہر طرح سے قرآن شریف کو چھوڑ دیا اور اکثر دیکھا ہے کہ قرآن کو چھوڑ کر لوگ وظیفوں پر مرتے ہیں کوئی کہتا ہے تسخیر کا کوئی عمل بتائیے کوئی کہتا ہے دستِ غیب کی ترکیب بتادیجئے۔ کوئی کہتا ہے اولاد ہونے کے لئے کوئی نقش کر دیجئے غرض وظیفوں کو بہت سہل پایا ہے ساری دنیا کے کام وظیفوں ہی سے بیٹھے بیٹھے ہو سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہی بات ہے تو کھاؤ پیو بھی مت نکاح بھی نہ کرو نوکری چاکری کے جھگڑے میں بھی مت پڑو وظیفوں ہی سے پیٹ بھی بھر جائے گا اور انہیں سے اولاد بھی ہو جائے گی اور انہیں سے گھر بیٹھے روپے مل جایا کریں گے آپ یہ کہیں گے کہ اللہ میاں کے نام میں تو بڑے بڑے اثر ہیں۔ اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ غور کر کے دیکھ لیجئے آج کل وظیفوں کی طرف زیادہ میلان کا سبب اللہ میاں کے نام کی عظمت نہیں ہے بلکہ اس کا سبب صرف کم ہمتی ہے جو لوگ اپنی عمر ابتداء میں لہو و لعب میں برباد کر دیتے ہیں۔ جب بارہا اپنے سر پر پڑتا ہے اس وقت حسرت و ندامت ہوتی ہے کہ اس عمر میں کوئی بھی کمال حاصل نہیں کیا جواب کام دیتا اور ضرورت سر پر آہی پڑتی ہے اس لئے چاروں طرف نظر دوڑتی ہے اور ہر کام مشکل اور اختیار سے خارج نظر آتا ہے بس اگر کوئی چیز سہل اور اپنے اختیار میں دیکھ پڑتی ہے تو وہ عمل ہے کہ اس میں نہ کسی کی خوشامد ہے نہ کوئی امتحان دینا ہے نہ کچھ حرج

ہے زبان کا کام ہے۔ تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے پڑھ سکتے ہیں بس یہ وجہ ہے عمل کی طرف میلان کی اور اگر اس کی وجہ عظمت اسم اللہ ہوتی تو سب سے بڑا وظیفہ اور سب سے مفید عمل وہ سمجھتے جس کو اللہ میاں نے نازل فرمایا یعنی قرآن پاک شفاءً وشفاءً لکافی الصدوق اور رَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ خود باری تعالیٰ ہی نے اس کی شان میں فرمایا ہے۔ مگر نہیں فی الحقیقت وجہ وہی ہے جو میں نے نے عرض کی اسی واسطے اُن عملیات سے بھی استنباب نہیں ہوتا جو خلاف شرع ہیں۔ خوب یاد رکھو کہ عملیات میں زیادہ پڑنے میں بہت سے مفاسد ہیں جس کو دستِ غیب کہتے ہیں۔ اس طریقے سے روپیہ حاصل کرنا حرام ہے بحقیق سے ثابت ہو کہ اس عمل کی حقیقت یہ ہے کہ جن تباہ ہو جاتے ہیں اور وہ روپیہ چرچہ کر لادیتے ہیں یہ ایسا ہے کہ جیسے چند بد معاش کوئی نوکر رکھ لے اور اُن سے چوری کر لیا کرے۔ اور اگر کوئی ایسا عمل ہو کہ اس میں وہ اپنے ہی پاس سے لاتے ہوں تو یہ جبر اور غصب ہے کہ ان کا مال جبراً عامل لوگ لے لیتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے عملیات میں خرابیاں ہیں سب سے بہتر اور سہل عمل تو دُعا ہے اسے کیوں نہ اختیار کیا حق تعالیٰ کی اجازت ہے کہ جس کام کے لئے چاہو دُعا کرو بشرطیکہ وہ کام ناجائز نہ ہو، بلکہ دُعا نہ کرنا باعثِ عتاب ہے۔ اگر وظیفوں ہی کا شوق تھا تو قرآن شریف پڑھ پڑھ کر حق تعالیٰ سے دُعا مانگی ہوتی۔ سب سے بڑا وظیفہ یہ تھا جس میں کوئی محذور لازم نہیں آتا مگر افسوس جو لوگ کہ قرآن شریف بھی پڑھتے ہیں اُن کی نیت درست نہیں ہوتی۔ ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ میں مسجد میں قضا سے حاجت کر رہا ہوں۔ یہ خواب ایک بزرگ سے بیان کیا فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے تم کوئی عمل دنیا کے لئے مسجد میں پڑھتے ہو۔ غرض ہر کام کے لئے وظیفوں کو بہت سہل پایا ہے اس کی وجہ صرف کم ہمتی ہے دنیا کے لئے بڑی ہمت کی تو وظیفہ پڑھ لئے اور دین کے لئے ہمت کی تو کہتے ہیں صاحب کچھ سینے میں سے دلوائیے۔ سینہ کوئی خرچین ہے کہ اس میں ہاتھ ڈالا اور جو چاہا نکال کر دیدیا اور اگر دیا بھی جائے تو اسے رکھے گا کون جو چیز بے محنت ملتی ہے اُس کی قدر نہیں ہوتی۔

ہم کہ ادا زراں خرد ادا زراں دہد گوہرے طفلے بقصر نادہد

(یعنی جو شخص آسانی و آرازی سے کوئی چیز حاصل کرتا ہے اسے اولے پونے دوسرے کے ہاتھ

فروخت بھی کر دیتا ہے دیکھتے نہیں اگر بچہ کو کوئی موتی پا جائے تو وہ ایک روٹی کے بدلہ دوسرے

کو دے دے گا،

جو طریقہ ہے حاصل کرنے کا اس طرح حاصل کرو۔ دنیا حاصل کرو تہذیبِ مشروع سے دینے حاصل کرو علم و عمل سے جس کی اصل عظیم قرآن ہے جس کو چھوڑ ہی دیا ایک اس کام کیلئے قرآن شریف رہ گیا ہے کہ جب کسی کے یہاں بچہ ہوا تو اس میں سے نام نکال لیا کہ سات ورق الٹ کر ساتویں سطر میں دیکھ لیا اگر شروع میں الف تھو تو اللہ بخش اور خ تھو تو خدا بخش اور ر تھو تو رمضان اور ع تھو تو عید و نام رکھ لیا کہ بڑا متبرک نام ہے اللہ میاں کے کلام میں نازل ہوا ہے۔

ایک اس کام کے لئے رہ گیا ہے کہ جب کوئی مرا تو تہذیب میں پڑھو ادیا۔ مٹھی مٹھی بھر جنوں کے لالچ میں کسی گت قرآن شریف کی بنتی ہے بہت سے پڑھنے والے بے وضو ہوتے ہیں۔ بہت سے صرف پابندی رسم کی نیت سے شریک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی نہ آئے تو شکایت ہوتی ہے اور اگر آجائے اور عذر کر کے چلا جائے تو شکایت نہیں رہتی۔ معلوم ہوا کہ پڑھنا غرض نہیں صرف رفع شکایت منظور ہے۔ بہت جگہ نقدِ اجرت دے کر پڑھوایا جاتا ہے حالانکہ اجرت علی العبادۃ حرام ہے۔

آپ شاید کہیں گے کہ یہ مولوی لوگ ایصالِ ثواب سے منع کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ بعض اوقات آپ بھی تو نماز سے منع کرتے ہیں حالانکہ افضل اعمال ہے۔ میں آپ سے استفتاء کرتا ہوں کہ عینِ دوپہر کے وقت نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور حیض سے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور جنابت کے ساتھ نماز پڑھنا کیسا ہے؟ سب کا جواب یہ ہے کہ لایمجنون لا یجوز میں کہتا ہوں آپ نماز سے منع کرتے ہیں۔ بس ایسے ہی ہم بھی رسموں سے منع کرتے ہیں۔ جانتے سب ہیں کہ رسموں میں یہ یہ خرابیاں ہیں مگر کسی بات کا رواج پا جانے کے بعد چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔ نیز رسموں میں ظاہری رونق بھی ہے۔ اور ان کے چھوڑنے سے سادگی رہتی ہے اسی لئے بھی چھوڑنا مشکل ہے شادی میں ناچ گانا نہ ہو کہتے ہیں چلو بھائی چنے پڑھ آویں یہ اللہ والوں کی شادی ہے یہ خطاب ہم کو تو بسرو چشم قبول ہے۔

ما اگر قلاش و گردیوانہ ایم مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم
اگر حاجت مند اور دیوانہ نظر آتے ہیں تو کیا ہوا ہمارے لئے یہی بات انتہائی قابلِ فخر ہے
کہ ہم ساقی الٰہ کے نگاہِ کیف بار کے امیدوار اور پیمانہ شریعت کے جرّہ نوش ہیں۔

اور آپ کے اس طعن کا جواب اور بھی ہے مگر تہذیب سے خارج ہے میں دینا نہیں چاہتا بلکہ
بجائے اُن لوگوں کو جواب دینے کے اپنے ہی لوگوں کو کہتا ہوں کہ منکرات کو منع تو کریں مگر اس طرح کہ
نفسانیت کو دخل نہ ہونے پائے۔ پھر انشاء اللہ ضرور اثر ہوگا۔ کسی پر انکار کرنے کا مضائقہ
نہیں ہاں اتنا ہو کہ خلوص ہو ہم میں یہ مرض ہو جانا ہے کہ تقویٰ کی صورت میں نفسانیت کو ادا
کرتے ہیں علماء کو چاہیے کہ اس سے محفوظ رہیں۔

آج کل دیکھا جاتا ہے کہ جس طرح منع کرنے والے تقویٰ کی صورت میں نفسانیت کو برتنے
ہیں اسی طرح تداعی الیٰ الخیر میں خوشامد کی جاتی ہے۔ مدرسے میں جس کا چندہ داخل ہے۔
اس کا مدرسین اور طلبہ سب دباؤ مانتے ہیں سلام اور مزاج پُرسی کے لئے جاتے ہیں بات بات
پر ان کی بے جا مدح کی جاتی ہے۔ حالانکہ اس خوشامد کی ضرورت نہیں۔ یہ کچھ مدرسین کا ذاتی کام
تو نہیں ہے یہ کام تو ہوبی گایہ نہ کریں گے کوئی اور کرے گا وہ نہ کریں گے کوئی اور کرے گا۔

میں سچ عرض کرتا ہوں کہ علماء کو استغنا برتنے کی ضرورت ہے کسی کی خوشامد کی ضرورت نہیں
کوئی اس خیال میں نہ رہے کہ ہم ہاتھ کینچ لیں گے تو یہ کام بند ہو جائے گا۔ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَتَبَدَّلِ
قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ۔ اگر تم مُتّہ پھیرو گے تو تمہاری جگہ دوسری قوم کو کھڑا کریں گے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ علماء کو احتیاج نہیں ہاں اس احتیاج کے کسی کے سامنے لے جانے کی
ضرورت نہیں۔ یہ کام دین کا ہے اور دین کے اللہ میاں کفیل ہیں۔ میں بدخلق نہیں سکھاتا ہوں
خلق ضروری چیز ہے اور ہر شخص سے نرمی کے ساتھ پیش آئیں مگر ان کے اموال پر نظر نہ رکھیں
اور کسی خاص شخص کی اعانت کو دین کا موقوف علیہ نہ سمجھیں۔ البتہ ترغیب اور اظہار
ضرورت کا مضائقہ نہیں یہ طریقہ مسنون ہے۔

اس میں راز یہ ہے کہ فی الحقیقت کام کے کفیل اللہ میاں ہی ہیں اور ظاہری صورت
اس کی تکمیل کی یہ رکھی گئی ہے کہ چند بندے ایک دوسرے کی اعانت کریں اور اسکو انجام دیں۔

اگر بندوں کو اطلاع نہ ہوگی تو وہ کیونکہ شریک ہوں گے۔ یہ ضرورت اُن کو اطلاع کرنے کی ہے اطلاع نہ کرنے میں صورتاً کام کو لگا کر دینا ہے اور خوشامد کرنے میں بندوں پر تکیہ لازم آتا ہے اس میں حقیقتاً کام کو لگا کر دینا ہے۔ اس وجہ سے خوشامد سے منع کیا جاتا ہے غرض محض اگر کوئی ظاہراً معین ہوتا ہے وہ اعانت بھی درحقیقت کارِ سازِ حقیقی ہی کی اعانت ہے۔

کارِ زلف تست مشکِ فشانِ آغا شحال مصاحتِ رتہمتے برآ ہوئی چیں لبہ اند

یعنی درحقیقت مشک جیسی خوشبودار شئی تیری زلفِ نکہتِ ہمیز ہی کی پیداوار ہے۔ عاشقوں نے تو کسی مصاحت کے پیش نظر آہوئے ختن کی جانب غلط نسبت کر دی،

اس لئے کہا جاتا ہے کہ خوشامد نہ کرو اور یہ بد خلقی نہیں۔ بد خلقی اور چیز ہے اور استغنا اور چیز۔ بد خلقی تو دوسرے کے حقوق کا ادا نہ کرنا ہے اور استغنا اپنے حقوق دوسرے کے سامنے نہ لے جانا۔ آج کل اس کی احتیاط بہت کم لوگ کرتے ہیں اپنی احتیاج لوگوں کے سامنے لے جاتے ہیں اور اس کا بھی لحاظ نہیں رکھتے کہ وہ لوگ اس کے اہل میں نہیں بہت سے اُمرا فاق و فاجر ہوتے ہیں۔ ان اہل غرض کو اُن کا فتن و فُجور دیکھنا پڑتا ہے اور چونکہ حاجت مند بن کر گئے ہیں۔ کان نہیں ہلا سکتے۔ یاد رکھو کہ باوجود قدرت کے منکر کی تعبیر نہ کرنا اور سکوت کرنا اس میں شامل ہوتا ہے حدیث شریف قصہ آیا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ایک گاؤں کی نسبت حکم ہوا کہ اس گاؤں کو الٹ دو عرض کیا کہ یا اللہ اس میں ایک ایسا آدمی بھی ہے جس نے کبھی گناہ نہیں کیا، کیا مع اُس کے الٹ دوں حکم ہوا ہاں اگرچہ اُس نے گناہ نہیں کیا۔ لکن تم معرفتِ وجہ قطع یعنی ہماری نافرمانی کو دیکھتا تھا اور کبھی اس کی پیشانی پر بل نہیں پڑتا یہ وبال ہے منکر پر سکوت کرنے کا۔ اس پر بعض پڑھے لکھے لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ سکوت میں مصاحت ہے اس سے چندہ لیتا ہے۔ کیوں صاحب کیا اس کے چندے پر اللہ میاں کا کام موقوف ہے۔ اللہ میاں خود ذمہ دار ہیں۔ چھوڑو مصاحت کیلئے۔

خلیل آسا دُرِ ملکِ یقینِ زن صدائے لا اُحِبُّ الا قلیلِ زن

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مانند عزم و یقین کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے نعرہ لا اُحِبُّ الا قلیلِ زن

کو ادا کرو۔

ایک کام عورتوں نے قرآن شریف سے یہ لیا کہ چادر میں رکھ کر دو عورتوں نے اس چادر کو پکڑ لیا اور نیچے کو اس کے نیچے سے نکال دیا کہ اس سے جملہ بلاؤں کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ اب نہ اس پر جادو چل سکتا ہے نہ نظر لگ سکتی ہے اور نہ کوئی اور آفت آ سکتی ہے یوں کہتی ہیں کہ اللہ میاں کے نام کی برکت سے جو کچھ ہو کم ہے جیسے دعائے گنج العرش جو کوئی بازو پر باندھ لے نہ اس پر تلوار اثر کرے نہ پانی میں ڈوبے نہ آگ میں جلے نہ سولی پر چڑھے۔ دعائے گنج العرش باندھ کر چوری کیا کرو، خوب بیدھڑک ہو کر چوچا ہو سو کیا رو کیونکہ کوئی آفت تو آنے ہی کی نہیں (إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُونَ) ۵

ایک کام قرآن شریف سے چھاپہ خانہ والوں نے لیا کہ اس کو نوٹوں کے ذریعے سے اتنا چھوٹا کر لیا کہ بلا شیشے کے پڑھا نہیں جاسکتا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھوٹا قرآن شریف ایک شخص کے پاس دیکھا تو اس کو دتے سے مارا کہ قرآن شریف کی توہین کرتا ہے اور فرمایا کہ ایک ایک حرف الگ لکھو اور صاف صاف چمکتا ہوا لکھو۔ اور اس کو بڑا کمال سمجھ کر شائع کیا جاتا ہے کہ لو اب تو تمام عملیات اور تعزیدوں کا اصل اصول ہی ایک تعزید کی صورت میں آگیا ہر شخص کو بازو پر باندھنا چاہیے یہ گت۔ نبی قرآن شریف کی کہ تماشے کے طور پر شیشے سے دیکھا جا رہا ہے اور جب تمام عملیات کا اصل اصول ہی پاس ہے تو کسی آفت کا خوف نہیں رہا اعمالِ سینہ کی حیرات بڑھ گئی۔ گھر میں بیٹھے ہیں تب بازو پر بندھا ہے پیچانے میں ہیں تب پاس ہے۔ عورت کے پاس جائیں تب ساتھ ہے جنابت کی حالت میں ہوں تب لئے ہوئے ہیں یہ حق قرآن شریف کا مطبع والوں نے ادا کیا۔

حضرت قرآن شریف وہ چیز تھی کہ دروازے سے آتا ہوا دیکھتے تو ہیبت ہوتی بے اختیار کھڑے ہو جاتے نہ یہ کہ شیشے سے اس کا تماشا بنائیں۔ اس میں جیسے کہ دلی تعظیم اور توقیر کو دخل ہے جہالت کو بھی دخل ہے۔ بڑی چیز کو دیکھ کر خواہ مخواہ بھی قلب میں ایک اثر ہوتا ہے۔

ایک کام قرآن شریف سے یہ لیا گیا کہ نوٹوں گراف میں سورتیں بند کی جاتی ہیں اور دو دو پیسے لے کر سنائی جاتی ہیں۔ یہ اس آیت پر عمل ہے لَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ شَيْئًا قَلِيلًا اللہ میاں کی آیتوں کی یہ قدر کہ کوڑیوں پر بازار میں ماری پھریں فقہا اس میں زیادہ کلام کر سکتے ہیں میں تو کچھ جانتا نہیں ہوں۔ اتنی بات تو ظاہر معلوم ہوتی ہے کہ یہ محض لہو و لعب ہے جہاں کسیوں

کے راگ بھرے ہوئے ہیں قرآن شریف بھی ہے تاکہ جو لوگ راگ گانے سے احتیاط کرتے ہیں وہ اس ذریعے پر نہیں شامل ہوں۔ کہاں کہیوں کے راگ اور کہاں قرآن پاک۔ جہاں برہمن وہیں قصائی۔ غرض قرآن پاک سے بجائے اس کے کہ اسکو پڑھا جاتا اور قرأت سیکھی جاتی آج کل یہ کام لے جاتے ہیں اور قرأت کو بہت مشکل سمجھ رکھا ہے حالانکہ بقدر ضرورت صحت کے لئے صرف اٹھائیس دن کی محنت کی ضرورت ہے جیسا کہ میں اُوپر عرض کر چکا ہوں اور کمال بھی کچھ مشکل نہیں۔

مسلمانوں سے میں یہ نہیں کہتا کہ سب کے سب قاری بن جائیں ہاں یہ سب کے ذمہ ہے کہ بقدر ضرورت قرآن شریف کو صحیح کر لیں اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ایک اُستاد رکھانے والا ہو اور تجربہ سے ثابت ہو کہ سب کے سب رکھنے والا خواہ کسی حد تک کوئی فن سیکھنا چاہے مگر رکھانے والا پورے فن کا ماہر ہونا چاہیے۔ حاصل یہ کہ قرآن شریف صحیح کرنے کے لئے ایک قاری کی ضرورت ہے مگر کام تو باتوں سے نہیں ہوتا جب قاری رہے تو اس کے اخراجات کی کفالت آپ کے ذمہ ہے اور ہر فن کے لئے کچھ آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ قاری کے لئے کچھ کتابیں بھی ہتھیانے کی جائیں اور جتنے امور ضروری ہیں ان سب کی کفالت آپ کو کرنی چاہیے۔ پھر اس کفالت کے دو طریق ہیں، ایک تو یہ کہ ہر شخص کے یہاں ایک ایک قاری رہے اور ہر جگہ کتابیں اور دیگر سامان ضروری منگایا جائے، اور ایک یہ کہ ایک جگہ اس کا انتظام کافی طور سے کر لیا جائے اور سب اُس سے مستفیض ہوں اس میں بہت سہولت ہے۔ آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس مکان میں جہاں آپ بیٹھے ہیں یہ انتظام کیا گیا ہے کہ قرأت سیکھائی جائے اور اس کے لئے جتنے سامان کی ضرورت ہے سب کیجائی ہوتی ہے جمع کیا جائے۔ قرأت سیکھنے اور قرآن شریف کے صحیح کرنے کی ضرورت تو ہر شخص کے لئے ثابت ہوگئی۔ پھر اس ضرورت کے پورا کرنے کے لئے جو بھی طریق ہو تا خواہ کیسا ہی مشکل ہو تا اختیار کرنا ضرور تھا مگر حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے آسانی کر دی کہ اپنے کچھ بندوں کو اس طرف متوجہ کر دیا اور اللہ میاں کا نام لے کر اس کام کو شروع کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دین میں عجب خوبی ہے کہ تھوڑی دقت میں بے بہادرت ملتی ہے۔ کاش اس دولت کی ضرورت لوگوں کو محسوس ہو جائے تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ جب تک کسی چیز کی ضرورت نہیں ثابت ہوتی اس دقت اس میں دیر ہوتی ہے اور جہاں ضرورت ذہن نشین ہوتی پھر کہیں نہ کہیں سے اُس کا سامان ہو ہی جاتا ہے

اُن آدمیوں کو دیکھئے جن کی اوقات بہت ہی تھوڑی ہے اگر اُن سے کہا جائے کہ مسجد یا مدرسے میں چندے کی ضرورت ہے تو غور کریں گے کہ ہم خود مفلس ہیں اور جب شادی ہو تو انہیں کے پاس کہیں نہ کہیں سے مال آجاتا ہے وجہ کیا ہے کہ شادی کے خرچہ کی ضرورت اُن کے ذہن میں ثابت ہوگئی ہے کہ برادری میں نیک کٹی ہوگی اور مسجد اور مدرسے کے چندے کی ضرورت ثابت نہیں ہوئی اور مسجد اور مدرسے کی بھی جہاں ضرورت ثابت ہو جاتی ہے تو بحمد اللہ مسلمان اس کام کو بھی انجام دیتے ہی ہیں۔ مسلمانوں میں جوش تو ہے مگر

لوگ کہتے ہیں چاہ مشکل ہے سب غلط ہے نباہ مشکل ہے
ایسے لوگ کم ہیں کہ اپنی بات کو نباہ دیں۔

چندہ دینے والوں کے لئے دو باتیں ہیں کہ خیال رکھنے کے قابل ہیں ایک یہ کہ اپنی وسعت سے کم مت دو اور خواہ تھوڑا دو مگر نباہ دو احب الاعمال الی اللہ اور مہادان اقل دوسرے یہ کہ چندہ دے کر مدرسے کو اپنی ملکیت مت سمجھو۔ اور تمہیں کی رائے میں دخل مت دو۔ آج کل یہ مرض بکثرت شائع ہو گیا ہے کہ ذرا سا چندہ دے کر حکومت کرتے ہیں۔ ایک پیسہ بھی جس کا مدرسے میں شامل ہے وہ مدرسے کے ہر کام میں دخل دینے کو تیار ہے اور اپنی ہی رائے کو ترجیح دینا چاہتا ہے اور اگر بلا رائے اُن کے کوئی انتظام کر لیا جائے تو چندہ بند کر لیتے ہیں بعض لوگوں کی تو یہاں تک عادت ہے کہ خواہ مخواہ اعتراض کیا کرتے ہیں خود کوئی تدبیر اصلاح کی نہیں کرتے اور دوسروں کی تجویزوں میں عیب چھانٹا کرتے ہیں۔ ان کی وہ حالت ہے کہ ایک لڑائی میں کشت و خون زیادہ ہوا تھا میدان جنگ میں صد ہا مردے پڑے ہوئے تھے ایک صاحب ان میں ایسے بھی پڑے تھے کہ وہ مرے تو نہ تھے مگر زخم ایسے لگے کہ اٹھ نہیں سکتے تھے اتفاقاً لشکر کا بنیائُن کے پاس کوہر نکلا انہوں نے آواز دی کہ بھائی ذرا سنتے جاؤ تمہارے کام کی بات ہے بنیے نے تھوڑی دور کھڑے ہو کر پوچھا کیا ہے کہا میں تو اب مر ہی جاؤں گا۔ میری کمزوری میں یہی ہے کہ تم کھولو تمہارے ہی کام آئے گی مبادا کسی اور کے ہاتھ پڑ جائے بنیے لاپچی ہوتے ہی ہیں یہ آگے بڑھے جب خوب قریب پہنچ گئے تو ان مجروح صاحب نے اپنے پورے زور سے ان کی ٹانگ میں ایک تلوار ماری کہ ہڈی ٹوٹ گئی انھوں نے کہا کم بخت تو نے

یہ کیا حرکت کی ہمیانی تو کہاں رکھی ہے کوئی ہمیانی بھی کمر سے باندھ کر لڑائی میں آتا ہے۔ ہم اس میدان میں رات کو اکیلے پڑے رہتے دوسرا بیت کے لئے تمہیں بھی بلا لیا تو وہ بنیاد کیا کہتا ہے کہ اوت کا اوت نہ آپ چلے نہ اور کو چلنے دے۔ بس یہی حال ان معتز ضبین کا ہے کہ نہ خود چلیں نہ دوسرے کو چلنے دیں۔ ایسے لوگوں سے یہ انہماک ہے کہ ہم نے آپ کے چندے سے دست برداری دی ہمارے کام میں رخنہ مت ڈالو مگر انہماک تو امید نیست بدرساں، ہم لوگوں کی خاصیت کچھو کی سی ہو گئی ہے کہ اُس کی خیر یہی ہے کہ شر نہ پہنچائے سو خود مدد نہ دیں مگر دوسروں کے کام کو نہ بگاڑیں۔ رہا اعتراض کرنا اور عیب لگانا سو بے عیب تو خدا کی ذات ہے جن کو عقل دی گئی ہے وہ نرے عیب پر نظر نہیں کرتے جہاں عیب و ہنر دونوں پاتے ہیں ہنر کی طرف دیکھتے ہیں اور عیب کو چھپا دیتے ہیں یا اصلاح کر دیتے ہیں اور غاد کی تو بات ہی دوسری ہے مدرسوں میں اعتراض پیدا ہونے کیا مشکل ہیں جب کہ مدرسوں کے اصل اصول بھی نہیں چھوٹے چنانچہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کون لاتا ہے آپ نے جواب دیا کہ جبریل علیہ السلام لاتے ہیں کہنے لگے کہ جبریل تو ہمارے دشمن ہیں اگر میکائیل علیہ السلام لاتے تو ہم بھی ایمان لے آتے یہ بھی تو اعتراض ہی تھا۔ ایسے اعتراضوں سے تو کوئی بھی نہیں بچا اہل مدرسہ پر اگر کئے جائیں تو کیا بعید ہے۔ صاحبو! آپ کو تو دل و جان سے امداد کرنی چاہیے نہ کہ عیب لگانا ہاں اگر کوئی عیب آپ کے نزدیک ثابت ہو تو اس کو اس طور سے دفع کیجئے جو اس کا طریقہ ہے حدیث میں ہے (قرآن جائیے شریعت کی تعلیم کے) فرماتے ہیں المؤمن مرأۃ المؤمن لوگوں نے اس کی تفسیر کئی طرح سے کی ہے۔ جو ہمارے مشائخ کے نزدیک ہے وہ یہ ہے کہ مومن کو مومن کے لئے آئینہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس بات میں کہ آئینہ دیکھنے والے کا راز دار ہوتا ہے اُس کے عیب کو اسی کے سامنے ظاہر کرنا ہے دوسروں سے ہرگز نہیں کہتا۔ اس طرح جو کوئی بھی مدرسے کے عیب چھاننا کرے ہماری عین خوشی ہے اس سے اصلاح ہوتی ہے مگر ایسے آدمی کم ہیں آج کل تو مرض یہ ہے کہ چندہ ڈے کر یہ خیال ہو جاتا ہے کہ ہم مدرسے کے مالک ہیں اور جو لوگ اس خیال سے بچنا بھی چاہتے ہیں بسا اوقات ان کو بھی رائے دیتے وقت اشتباہ ہو جاتا ہے کہ عیب جوئی کو نصیحت سمجھتے

ہیں پھر نصیحت کی صورت میں عیب جوئی میں پڑ جاتے ہیں۔ اس سے بچنے کا طریقہ میں نبائے نبی ہوں کہ آپ کے نزدیک جوابات قابلِ اعتراض ہو اس کو علی الاعلان پھیلانے نہ پھرے خلوت میں مہتمم یا کسی مدرس پر ظاہر کیجئے اور پھر یہ انتظار نہ رکھئے کہ ہمارے کہنے کے موافق ہی ہو جائے اس طرح آپ نا صحیحین میں شمار ہوں گے اور عیب جوئی سے بچ جائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ رائے دواور انتظام میں دخل نہ دو۔ مدرسے کو اللہ میاں کا سمجھ کر کام کرو اپنا مت سمجھو۔ یہ وہ گڑھے ہیں کہ اگر اس کا سب لوگ خیال رکھیں تو کوئی بھی خرابی پیدا نہ ہو چندہ دینے والے اس کا خیال اسی طرح رکھ سکتے ہیں جیسے میں نے عرض کیا اور تمہیں یوں رکھ سکتے ہیں کہ اس کی رقم کو امانت سمجھیں اور اپنی اپنی خدمات منصبیہ کو حق اللہ سمجھیں اور ان کو نہایت خلوص کے ساتھ بجالائیں اور خلوص کے دو جزو ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ باطنی تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو عبد اور حق تعالیٰ کو مولیٰ سمجھ کر احکام کی تعمیل کریں اور ظاہری یہ ہے کہ اپنے آپ کو حاکم نہ کہیں بلکہ خادم کہیں وہ نام تک اختیار کریں جن سے حکومت اور ترفع پایا جائے۔ آج کل یہ بھی ایک خبط ذہنوں میں سما گیا کہ کام چاہے کتنا ہی ذرا سا شروع کریں مگر عہدے اور خطابات بڑے بڑے خیر عہدے کر لیتے ہیں کوئی سیکرٹری بننا ہے کوئی جنٹ ہوتا ہے۔ ایک صاحب کا خط میرے پاس آیا جس پر کاتب صاحب ہی کے قلم کا لکھا ہوا تھا راقم فلاں گورنر یتیم خانہ مقام فلاں میں نے کہا کہ بہتر تھا کہ خادم یتیم خانہ لکھتے۔ بہت جگہ تجربہ ہو کہ جہاں یہ خطابات لمبے چوڑے ہوتے ہیں، وہاں کارروائی صرف رجسٹری تک محدود رہتی ہے خارجی وجود کی نوبت نہیں آتی چند روز کے لئے عہدے البتہ مل جاتے ہیں سو یہ بچوں کا کھیل ہی ہو یا کچھ اور سان الفاظ کو اختیار مت کرو۔

اس سے برکت نہیں رہتی یہ غیر قوموں کی تقلید ہے من تشبہما بقوم فهو منہم یہ حدیث لباس اور وضع ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے جس بات میں مشابہت پائی جائے سب اسی کے اندر داخل ہے یہ اچھا ہے کہ تم اپنے آپ کو خادم کہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تسلیم نہ کرنا نام سرفراز رکھیں تَسْبِیْدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ یہ کتنی برکت کا سبب ہے۔ آج لوگوں نے اس کے برعکس کر رکھا ہے کہ بڑے بڑے خطاب لے لیتے ہیں خواہ ان کی اہلیت ہو یا نہ ہو حدیث حدیث میں ہے اذ ملح الفاسق اھترلہ العرش۔ یعنی جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو عرش کا نپاٹھتا ہے اور

آج کل اکثر مدرسے فساق ہی کے ہاتھ میں ہیں اور ان کی مدح ہوتی ہے پھر زمین کانپ اٹھتی ہے تو کیوں تعجب کیا جاتا ہے زلزلہ کو بہت لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے اسکی حقیقت کیا ہے اور کیوں آتا ہے۔ زلزلہ کی نسبت لوگوں کے خیالات عجیب طرح مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے گائے سینگ بدلتی ہے یہ وہ حرکت ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ آج کل جو مدعیان تحقیق ہیں ان کی بڑی دوزیہ ہے کہ مسامات و منافذ بند ہونے سے زمین کے بخارات زور کرتے ہیں اس سے یہ حرکت ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ صرف تخمین ہے اس پر کوئی دلیل قطعی نہیں ہے اور کبھی بخارات سے بھی یہ حرکت واقع ہو تو ہم انکار نہیں کرتے لیکن اس کی کیا دلیل ہے کہ ہمیشہ یہی سبب ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ حرکت کبھی بخارات سے ہوتی ہو اور کبھی اور کسی سبب سے۔ لیکن کسی سبب سے بھی ہو یہ بات تو مستمم ہے کہ سبب میں تاثر بالذات نہیں پھر اگر سبب کو صحیح طور پر معلوم بھی بھی کر لیا تو کیا نتیجہ۔ مسبب ہی کی طرف کیوں نہ رجوع کیا جائے تاکہ بلا ٹلے مگر مرض یہ ہے کہ سبب کی تحقیق میں لگ جاتے ہیں اور جو داہی تباہی سمجھ میں آجائے اسی کو یقینی اور قطعی سمجھ لیتے ہیں۔ زلزلہ کے لئے بخارات کو یقینی سبب جان لیا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر قیامت آجائے اور اس کے بعد ایک اور قیامت آجائے اور اس کے بعد ایک اور قیامت آجائے اسی طرح قیامت ہزاراں ہو جائیں مگر انحصار کی دلیل نہ لاسکیں گے کہ سوائے بخارات کے اور کوئی سبب زلزلہ کا نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی دلیل ہے کسی کے پاس تو میں بھی سننا چاہتا ہوں۔

غرض ان خرافاتوں کا لوگوں کو بہت شوق ہے اور اپنی تخمین کو یقینی دلیل سمجھ لیتے ہیں۔ صاحبو! تمام آفتیں گناہوں سے آتی ہیں۔ گناہوں کو چھوڑو۔ منجملہ گناہوں کے فاسق کی مدح اور ترفع بھی ہے جس سے عرش کو زلزلہ ہو جاتا ہے اگر کبھی زمین کو بھی ہو جائے تو کیا تعجب ہے اور ان بڑے بڑے خطابات میں یہ مدح لازم آتی ہے لہذا یہ الفاظ مت اختیار کرو۔ انکسار اختیار کرو۔

اہل علم کے لئے یہ الفاظ زیبا نہیں ہیں سچ کہتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت میں تشریف رکھتے ہوتے تو ان الفاظ سے ضرور منع فرماتے لفظ ذرا عینا تک سے نہی قرآن شریف میں موجود ہے صرف اس وجہ سے کہ مشابہت کفار لازم آتی ہے چہ جائیکہ یہ الفاظ کہ ان میں علاوہ مشابہت کے ترفع اور مذہبیت بھی ہے اگر فرض کر لیجئے کہ مشابہت کفار بھی نہ ہوتی

تب بھی وجودِ ترقی و تہذیب ہی ان کے منع کے لئے کافی تھا۔ کیا ممبر اور گورنری لفظ رہ گئے ہیں۔ اگر ضرورت ہے تو اپنے قرآن شریف میں سے تلاش کر لو فرماتے ہیں **وَسَاءَ وَرْهُمُ فِي الْأَمْرِ**۔ اس سے رائے دہندوں کا نام مشیر اور مکان کا نام مجلسِ شوریٰ اخذ کیا جاسکتا ہے یہ الفاظ ممبر اور کمیٹی کا کام بخوبی دے سکتے ہیں پھر کیوں دوسروں کی شاگردی کی جائے اور صاحبو تجربہ سے تو یہ ثابت ہونا ہے کہ ان الفاظ کی بھی چنداں ضرورت نہیں کام پورا ہونا چاہیے جہاں خطابات اور ضوابط بڑے بڑے دیکھے وہاں کام خاک بھی نہیں پایا۔

وہاں کی کارروائی صرف رجسٹری تک محدود رہتی ہے۔ ان زوائد کو چھوڑو اور اصل کام خلوص اور تندہی کے ساتھ کرو۔ مدرسے میں صرف ممبر یا مشیر ہی مت بنو بلکہ لڑکوں کو بھیجو اور جو اصل کام ہے یعنی قرآن شریف کی تصحیح اس کو کمال تک پہنچا کر دکھاؤ۔ اللہ میاں یہ نہیں پوچھیں گے کہ ممبری یا گورنری کا خطاب بھی حاصل کیا تھا یا نہیں ہاں یہ پوچھیں گے کہ قرآن کو قرآن ہی کی طرح پڑھا تھا یا نہیں۔ اس کا حق ادا کیا تھا یا نہیں یہ خدمتِ الفاظ کی ہوئی اور دوسری خدمتِ قرآن شریف کی یہ ہے کہ الفاظ کے مفہوم کو سمجھیں جب تصحیحِ الفاظ سے فراغت ہو تو اس کا ترجمہ پڑھیں تاکہ احکام سے آگاہی ہو۔ آج کل اس میں بھی لوگوں نے خطر کر دیا اقل تو ہمت کا منتہا صرف عبارت ہی پڑھتے تک رہتا ہے اور اگر کسی نے شوق کیا اور ترجمہ دیکھنا شروع کیا تو ترجمہ بھی کسی بڑے آدمی کا تلاش کیا جائے گا جیسا کہ دنیاوی امور میں نمونہ اور جاہ ماہہ الامتیا قرار دیا گیا ہے ایسے ہی دین میں بھی بڑا آدمی ہونا دیکھا جانا ہے۔ خیال یہ ہے کہ ڈپٹی صاحب کا ترجمہ بھی ڈپٹی اور تحصیلدار صاحب کا ترجمہ بھی تحصیلدار ہی ہو گا حالانکہ **لِكُلِّ فِرْقٍ رِجَالٌ** ہر کام کے لئے کچھ آدمی ہوتے ہیں۔ کسان کسان ہی کا کام کر سکتا ہے اور بڑھتی بڑھتی ہی کا کام اور لوہار لوہاری کا کام کر سکتا ہے میں پوچھتا ہوں کہ ڈپٹی صاحب تحصیلدار کا کام مولوی لوگ بھی کر سکتے ہیں اور ان کو ان کے کام میں دخل دینا زیبا ہے جواب یہی ہے کہ نہیں کر سکتے اور ان کو دخل دینا نا زیبا ہے پھر ڈپٹی صاحب اور تحصیلدار صاحب کو یہ جرأت کیسے ہوتی کہ ان کا کام کرنے لگے ان سے اپنا ہی کام خوب ہوتا ہے۔ اس خدمت کو انھیں کے لئے چھوڑ دیا ہوتا یہ ان کا کام نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے

فاش غلطیاں کی ہیں قرآن شریف کے ترجمہ کے لئے علماء کا مذاق موزوں ہے کتاب اللہ میں جیسے کہ اصل کتاب میں شانِ سلطانی برستی ہے ایسے ہی ترجمہ میں بھی ہونی چاہیے۔ زبان میں بناوٹ نہ ہو زمانہ پن نہ ہو جب پڑھا جاوے تو یہ معلوم ہو کہ شاہی حکم رعایا کو سنایا جاتا ہے کوئی لفظ آدابِ شاہی کے خلاف نہ ہو قرآن شریف کا ترجمہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ڈھبنا نشیبی کے معنی لکھے ہیں ہم کبڈی کھیلنے لگے حالانکہ قطع نظر اس سے کہ یہ لفظ رکیک ہے خود لغت کے بھی خلاف ہے کیونکہ استباق سبق سے سبق سے مراد آگے بڑھنا استباق سے مراد یہ ہے کہ ہم اس لئے دوڑے کہ دیکھیں کون آگے نکلے اور کبڈی میں یہ مراد مقصود نہیں پھر خود عقل کے بھی خلاف کیونکہ کبڈی میں حافظ متاع نظر سے غائب نہیں ہو جاتا کہ بھڑے کے لے جانے کا عذر ہو سکے لیجئے یہ ترجمہ ہے۔ بات یہ ہے کہ صرف زبانِ عربی جاننے سے ترجمہ نہیں ہو سکتا قرآن مجید کے ترجمے کے لئے مختلف علوم کی ضرورت ہے اور لوگ صرف نیارنگ دیکھ کر ڈھلتے ہیں، اتنا مادہ نہیں کہ بھلے بڑے کو پہچانیں بس خود گمراہ ہوتے ہیں اور اوروں کو گمراہ کرتے ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو قرآن شریف پڑھایا بھی تو اکثر تو یہ ہے کہ بس صرف الفاظ پڑھا دیئے اور اس کے لہجے اور آواز کو سن کر خوش ہوتے ہیں کہ کچھ طوطے کی طرح پڑھتا ہے سو اطمینان رکھتے طوطا ہی رہے گا۔ انشاء اللہ آدمی نہیں ہو گا آدمی ہوتا ہے علم سے اور علم صرف الفاظ ہی کا نام نہیں ہے۔ صاحبو! اُس کو آدمی نہائیے اور وہ علوم پڑھائیے کہ الفاظ کے مفہوم کو سمجھے اور صحیح اور غلط ترجمہ میں تمیز کر سکے ناکہ گمراہی سے خود بھی بچے اور اوروں کو بھی بچائے مگر اس کی تو ضرورت ہی ذہنوں سے نکل گئی اور عام لوگوں کا اعتراض ہے کہ اگر تمام عُمرانِ علوم میں صرف کی جائے تو نہ بڑھتی بڑھتی رہے گا اور نہ لو بار لو بار پھر دنیا کا کام کیسے ہو معاش کی کیا تدبیر ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ تو نہیں کہا جاتا کہ سب کے سب متبحر عالم ہی بن جاوے یہی میں تمکیل کرو بلکہ ضرورت کے موافق احکامِ الہی سیکھ لو اور اس سیکھنے کی صورتیں مختلف ہیں جس کو جس طرح آسان ہو عربی میں ممکن ہو عربی درجہ چھوٹے چھوٹے اردو کے رسالے پڑھ لو اور کچھ بھی نہ ہو علماء سے پوچھ پوچھ کر معلوم کر لو اور اگر عربی کا شوق ہو اور فرصت کم ہو تو ضروری کتابیں پڑھ لو۔ اس ضرورت کو دیکھ کر نصابِ تعلیم کا اختصار کیا گیا ہے کہ جہاں پہلے دس برس صرف ہوتے تھے اس میں صرف دھائی برس لگتے ہیں اس کو

نئی بات سمجھ کر آپ چونکیں نہیں اور یہ نہ کہیں کہ جب ڈھائی برس میں وہی کام ہوتا ہے جو دس برس میں ہوتا تھا تو کیا پہلے علمائے وقت ضائع کرنے کو یہ مدت رکھی تھی کیونکہ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ بعینہ وہی تعلیم جو دس برس میں ہوتی تھی اب ڈھائی برس میں ہو کرے گی بلکہ ضروریات کو منتخب کر لیا گیا ہے کہ ان کو معلوم کر کے آدمی اپنے دین کو مستحکم کر سکتا ہے اور متوسط استعداد کا مولوی ایک گونہ جامعیت کے ساتھ بن سکتا ہے اگرچہ تجربہ نہ ہو مگر اتنی استعداد ہو جائیگی کہ اگر چاہے تو اپنی لیاقت بڑھا سکتا ہے۔

یہ نصاب کم فرصت لوگوں کے لئے تو ضروری ہی ہے اگر وہ لوگ بھی جو نصابِ قدیم کی تکمیل چاہتے ہیں پہلے اس کو پورا کر کے نصابِ قدیم کو پورا کر لیں تو نہایت مفید ہو مجھے تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ کارآمد ہے میں دھوکا نہیں دیتا ہوں میں نے ایک عرصے تک پہلے اپنے عزیزوں پر تجربہ کیا جب پورا اطمینان ہو گیا تب شائع کیا ہے اس کے شائع کرنے سے یہ غرض نہیں کہ نصابِ قدیم بحث ہے اور اس کو بالکل چھوڑ دیا جائے بلکہ جس کو فرصت و ہمت ہو نصابِ قدیم کی تکمیل کرے اور جن کو کم فہم صفتی کا عُذر ہو وہ اُسے اختیار کر لیں۔ کام نکالنے کے لئے کافی ہے۔ چونکہ یہ شکایت عام طور سے زیادہ تر ہو گئی ہے کہ اگر علمِ دین حاصل کریں تو اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بعض اہل رائے کی تجویز ہے کہ دیگر علوم کی گنجائش دینے کو نصابِ جدید پڑھایا جائے اور اس کے لئے ہر شہر میں ایک مدرسہ ہو چنانچہ یہاں بھی ایک شاخ اس مدرسے میں اس کے لئے بڑھائی گئی ہے اب آپ صاحبان کو کوئی عُذر علمِ دین حاصل نہ کرنے کا باقی نہ رہا لیکن یہ سب اس وقت ہے کہ دین کی ضرورت آپ کے ذہن میں ہو اگر ضرورت ہی ذہن میں نہ ہو تو تھوڑی مدت اور بہت سب برابر ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں جس چیز کی ضرورت دلیل سے ثابت ہو چکی اُس کے ذہن میں نہ ہونے کی کیا وجہ ہے کوئی صاحبِ عقل ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کی ضرورت کو تسلیم نہ کرے پھر باوجود ضرورت کے اگر کوئی اُس کو پورا نہ کرے تو اسکو غفلت کہتے ہیں جس کا انجام حسرت و تدامت ہے۔ صابو! اس حسرت سے بچتے دین کی ضرورت دنیا سے زیادہ ثابت ہوتی ہے اس بنا پر تو دنیا کے علوم میں جتنا وقت صرف ہوتا ہے اُس سے زیادہ دین کے علوم میں صرف کرنا چاہیئے اگر زیادہ نہ ہو تو برابر تو ہو لیکن اب تو برابر کو بھی نہیں

کہا جاتا ہے صرف اتنا وقت تجویز کیا گیا ہے جس میں دیگر علوم کی بھی گنجائش ہے اس مدت میں بچے کو جملہ کاموں سے برطرف کیجئے صرف علمِ دین میں مشغول رکھئے پھر اختیار ہے جو فن چاہیئے سکھائیئے پھر انشاء اللہ دین میں اس کے کبھی خلل نہ آئے گا۔ اگر ڈاکٹر کسی بچے کی نسبت کہہ دے کہ تین برس تک انگریزی نہ پڑھاؤ ورنہ دماغ خراب ہو جائے گا تو آپ مان لیں گے خواہ یہی زمانہ اس کے امتحان اور پاس ہونے کا ہو۔ اور آپ جانتے ہوں کہ اگر یہ تین برس خالی رہے گا تو پہلا پڑھا ہوا سب بھول جائے گا اور آئندہ پڑھنے کی عمر نہ رہے گی مگر اس خیال سے ڈاکٹر کا کہا مان لیں گے کہ قدرستی مقدم ہے۔ اگر پاس بھی ہو گیا اور زندگی نہ رہی تو نوکری کیسے کریگا۔ بس اسی طرح سمجھ لو کہ ڈھائی برس کے لئے ہم نے بچے کو ہسپتال میں یعنی دینی مدرسے میں بھیجا ہے پہلے اپنی روحانی صحت کو درست کر لے پھر جسمانی صحت بھی درست کر لے گا۔ اول تو ڈھائی برس میں دنیا کا کوئی نقصان نہیں اتنا اتنا وقت بسا اوقات لہو و لعب میں غارت ہو جاتا ہے اور اگر کچھ نقصان بھی ہو تب بھی مسلمان کے لئے تو دین ہی مقدم ہے احکامِ خداوندی کے سامنے کسی چیز کی بھی وقعت نہیں۔ پہلے ان کی تعمیل چاہیئے پھر اور کام۔ ان کی تعمیل جب ہی ہو سکتی ہے کہ کتاب اللہ کو پڑھے اور کتاب اللہ کے پڑھنے کے معنی یہ نہیں کہ صرف لفظ پڑھ لے بلکہ اس کے مفہوم کو سمجھے جو کہ موقوف ہے تحصیلِ علومِ دین پر تیسری ملاوٹ عمل ہے اور سب سے زیادہ اہم اور مقصود یہی ہے پہلے دونوں حقوق کو اسکے ساتھ ذریعہ کو مقصود کے ساتھ جیسی نسبت ہے میں یہ نہیں کہتا طالبِ علموں سے عمل کی نیت نہ ہو تو پڑھو ہی مت پڑھ تو ضرور ہی لوگو جرات کی بات ہے مگر میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ علمِ دین شروع کرتے وقت اگر نیتِ عمل کی نہ بھی ہو تو پرواہ مت کرو علمِ دین وہ چیز ہے کہ نیت کو بھی ٹھیک کر لے گا۔ ایک بزرگ کا قول ہے تعلمنا العلم لغير الله فابی العلم الا ان يكون الله یعنی ہم نے علم پڑھا تو تھا غیر اللہ کے لئے مگر علم نے خود ہی نہ مانا اور اللہ میاں ہی کا ہو کر رہا مطلب یہ ہے کہ ابتداء میں چنداں خلوص نہ تھا مگر انتہا میں خلوص پیدا ہو ہی گیا۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ اگر عمل کی توفیق نہ بھی ہو تب بھی علم پڑھے جاؤ انشاء اللہ ضرور عمل نصیب ہوگا جب آدمی ہمیشہ فقرا و اہل اللہ کے قصے اور حالات پڑھے گا تو کب تک اثر نہ ہوگا ہاں یہ خیال رکھو کہ معصیت کا بھی عزم مت کرو۔ کیونکہ معصیت سے نورِ علم مٹ جاتا ہے ابتداء میں اگر علماء رحنی کا سا خلوص نہ ہو تو پرواہ مت کرو لیکن مقصد معصیت کے پیچھے مت پڑو اور میاں ک مت ہو جاؤ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ انہوں نے

اپنے استاد سے اپنے حافظہ کی شکایت کی تو انہوں نے جو جواب دیا اس کو اس طرح نقل فرماتے ہیں۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

فان العلم فصل من العلم

پھر تدریس کر کے ہیں اور نفس کے اس کہنے سے کہ صرف الفاظ سے بدن معنی سمجھے کیا فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ فائدہ کہ فہم معنی میں منحصر ہونے کی کیا دلیل ہے؟ لوگ بجائے قرآن شریف کے وظیفوں اور عملیات پر جھک پڑے اور قرآن شریف سے صرف یہ کام لیتے ہیں کہ بچوں کا نام اسمیں سے نکالا جائے یا تیجہ وغیرہ میں پڑھا جائے اور حبابی رسموں سے منع کیا جائے تو کہتے ہیں کہ خیر سے روکتے ہو۔ جواب یہ ہے کہ تم بھی تو بعض وقت نماز سے روکتے ہو جیسے نماز بحالت جنابت (مگر تم ان کا جواب دینے سے اسکو بہتر جانتے ہیں کہ اپنے گروہ سے کہیں کہ خلوص اختیار کریں اور استغناء برتیں)

ایک یہ کام لیتے ہیں کہ بذریعہ عکس پوسے قرآن شریف کو ایک تصویر کی صورت میں کر لیتے ہیں۔ اور ایک یہ کہ چادر میں رکھ کر نیچے کو نیچے سے نکال دیتے ہیں۔ اور ایک یہ گراموفون میں بند کر کے پیسے کھاتے ہیں ورنہ تلاوت یعنی قرآن کو مشکل سمجھ کر چھوڑ دیا میں کہتا ہوں بقدر ضرورت مشکل نہیں۔ ہاں تھوڑے سے اہتمام اور جمع کی ضرورت ہے۔ یہ مدرسہ اسی کا مجمع ہے اس میں سہی کرو اور خیال کھو کہ اپنی وسعت سے کم نہ دو اور اس کو نباہ دو اور انتظام میں دخل نہ دو سب کے سب اللہ میاں کا کام سمجھ کر کرو۔ چندہ دینے والے تو اس طرح جیسا کہ ابھی کہا گیا اور اہل مدرسہ اس طرح کہ اس کے مال کو امانت سمجھیں اور خدمات کو اللہ میاں کا کام اور انکسار کو شعار رکھیں۔ بکبر آمیز القاب تک نہ اختیار کریں کہ بسا اوقات فساد کی مدح لازم آتی ہے اس سے عرش کا نپ اٹھتا ہے اور زمین میں زلزلہ آ جاتا ہے۔

دوسرا حق تلاوت فہم معانی ہے اس میں لوگوں کی حالت یہاں تک ہے کہ صحیحہ و غلط کو نہیں کر سکتے ترجمے بھی ڈپٹیوں اور تحصیلداروں ہی کے بڑے سمجھتے ہیں و جو وہی ہے کہ علم دین صرف بچوں کو ناظرہ قرآن شریف پڑھا دینے تک محدود کر دیا ہے آگے کم فرصتی کا عذر ہے اب آپ کو واضح ہو کہ نصائے قدیم کا اختصار کر دیا گیا۔ صرف ڈھائی برس صرف ہونگے اب یہ عذر نہیں چل سکتا

تیسرا حق تلاوت عمل ہے پر سب سے زیادہ موکد ہے اسکی بہت کرو اور اس کے ذریعے یعنی علم کو اختیار کر و علم کو کسی طرح نہ چھوڑو حتیٰ کہ اگر اول میں عمل کا غم بھی دل میں پناؤ تب بھی پڑھے جاو۔ علم خود دل کو درست کر لیا ہاں قصداً معاشی میں مت پڑو کہ اس سے نور علم مٹ جاتا ہے غرض علم کیلئے کوشش کرو مال سے تمہارا دل سے اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو دُعا ہی سے تمہارے ذرا سے ارادے کی دیگر سب حقوق القرآن داہو سکتے ہیں یتیم بالغیر

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً
(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)

دعواتِ عبدیت جلد دوم کا

تیسرا وعظ ملقب بہ

عِلَاجُ الْكِبَرِ

منجملہ ارشادات

حکیمُ الامتہ مجتہد الملتہ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر

محمد عبد المتان عظیمی

مکتبہ تھانوی، کفتر الالباقہ

متصل مسافر خانہ بسند روڈ کراچی ۷

ایم اے جناح روڈ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
دعواتِ عجدیت جلد دوم

کا
تیسرا وعظ مُلقب بہ

علاج الکبیر

اَلْیَوْمَ	مَسْتِ	کُفْرَ	کَيْفَ	مَلَا	مَنْ ضَبَطَ	الْمُسْتَمْعُو	اَشْتَات
کہن ہوا	کب ہوا	کستنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	ریاضوں تھا	کس نے لکھا	سامین کی تعداد	متفکر
تھانہ بھون مکان حضرت مولانا صاحب	۱۱۳۱ھ	۱۱۳۱ھ	۱۱۳۱ھ	علاج الکبیر	تیسرا وعظ	۱۱۵	نور اللغات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله محمدہ و نستعينہ و نستغفرہ و توکل بہ و نعوذ باللہ من شرہا
انفسنا و من مياتہ اعمالنا من يہدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضلہ فلا ہادی
لہ و نشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشہد ان سیدنا و مولانا محمدًا
عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و سلم آقا بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَلَکَ الْکِبْرِیَّا کَمَ فِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ
(اور اُسی کو بڑا ہی ہے آسمانوں و زمین میں اور وہی زبردست حکمت والا ہے)

اس آیت میں حق سبحانہ تعالیٰ نے خاص نبی ایک صفت بیان فرمائی ہے کہ اگر انسان نظر

میں رکھے توکل مفسد اس سے الگ رہیں۔ خلاصہ اس کا معرفت تعلق انسانی ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بظاہر ہے تعلق امر نسبتی ہے جو طریق کو چاہتا ہے ایک طرف حق تعالیٰ ایک طرف بندہ۔ تو اس کے تعلق کے پہچاننے کا طریق دو معرفتوں کا جمع کرنا ہے۔ معرفت حق تعالیٰ کی اور معرفت اپنے نفس کی اور ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملازم بھی ہے اگر حق تعالیٰ کو پہچان لیا جائے تو نفس کی پہچان ہو جائے گی اور اگر نفس کا علم ہو جائے تو معرفت حق تعالیٰ ہو جائیگی۔ اسی واسطے کہا گیا ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ جس نے اپنی حقیقت پہچان لی اُس نے پروردگار کو جان لیا، اور پہلی معرفت دوسری معرفت سے اس لئے اہم ہے کہ نفس تو حاضر ہے اور اللہ غائب اور غائب پہچانا مشکل ہے حاضر سے اس اہمیت کے سبب اس آیت میں اسی کی تعلیم کی گئی ہے کہ اس میں اپنی ایک صفت ذکر فرمائی کہ اُس صفت سے پہچانیں اور وہ صفت کبریا ہے جو تمام صفات کے درجہ کمال کو شامل ہے اور معنی اسکے بڑائی جس کو حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اور جب یہ حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے تو دوسرے میں نہ ہونی چاہیئے اور بندے میں اس کی بالکل نفی ہونی چاہیئے سو جب تک یہ معرفت محفوظ رہیگی حاشا وکلا جو کوئی مفسدہ بھی ہونے پائے اور جب یہ معرفت نہ رہیگی اور بندہ صفت کبریا کو اپنے اندر لینا چاہے گا تو جو کچھ بھی مضرتیں و عیوب پیدا ہوں کم ہیں۔ اور واقع میں یہی ایک صفت کبر ہے کہ جڑ ہے تمام مفسد کی حتیٰ کہ شرک کی۔ دنیا میں جو کوئی بھی کافر ہوا ہے وہ کافر نہیں ہوا مگر اپنے نفس کے کبر سے ورنہ حق بخفی نہیں رہتا۔

وَتَحَذُّوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا الْآيَةُ ظلم اور علو کو سبب فرمایا ہے حمد کا علو اور کبر ہم معنی ہیں ابو طالب کو ایمان سے کس نے روکا صرف عار نے یوں کہا کہ مرتے وقت ایمان لاؤں گا تو قوم میری کہے گی ابو طالب دوزخ سے ڈر گیا۔ اس کی حقیقت یہی تھی کہ رفعت قوم پر حاصل ہے وہ نہ رہے گی۔ اس رفعت نے سچا نہ چھوڑا یہاں تک کہ کام تمام ہی کر دیا۔

اور کبر کا وجود کسی ایک گروہ میں نہیں بلکہ وہ عام مرض ہے کہ کم و بیش ہر طبقہ کے لوگ اس میں مبتلا ہیں اور دوسرے عیوب میں تو اکثر جاہل لوگ پھنسے ہوتے ہیں تعلیم یافتوں میں وہ عیب کم ہوتے ہیں کیونکہ وہ اُن کے بُرے نتائج کو جانتے ہیں لیکن اس میں جاہل عالم سب کم و بیش مبتلا ہیں۔ مشرکین عرب تو جاہل تھے۔ اب اس گروہ کو دیکھئے جو تعلیم یافتہ کہلاتا تھا یعنی اہل کتاب اُن کو بھی ایمان

لانے میں جو حارج ہوا سو وہی کبر۔ اس مختصر بیان سے بقدر کفایت اس کی توضیح ہوگئی کہ کفر و شرک کا
 مبنیٰ ہمیشہ کبر ہے۔ اب غور کر کے دیکھتے تو یہ بھی ثابت ہو جائیگا اور بہت سے معاصی کا مبنیٰ بھی کبریٰ
 ہے جو کفر و شرک سے نیچے ہیں۔ ایسے گناہ کبر سے اس طرح ہوتے ہیں کہ گناہگار اپنے بُرے عمل کو صرف
 اس عار کی وجہ سے نہیں چھوڑتا کہ لوگ کہیں گے کیا اتنے روضے یہ احمق رہا اس کام کو ہمیشہ سے کیوں
 کرتا رہا جواب چھوڑنا پڑا۔ اس شخص نے عیب صماقت سے اپنے نفس کو بچا یا یہی کبر بڑا مرض ہے اور
 علاج بالصد ہوا کرتا ہے۔ یہ مرض پیدا ہوا عدم معرفت کبر یا رِحق سے تو علاج معرفت کبر یا رِحق ہوگا۔ یعنی
 عظمت حق تعالیٰ کی اس کو حق تعالیٰ لے آیت میں بلفظ حصر اپنے واسطے ثابت کیا ہے وَلِلّٰہِ الْکِبْرِیَاءُ یعنی
 اسی کے واسطے ہے عظمت۔ بلاغت کے قاعدے سے لہٰذا کو مقدم کرنے کا یہی مطلب ہے کہ عظمت مخصوص ہے
 ذات باری تعالیٰ کے ساتھ یہ صفت دوسرے میں بالکل نہیں ہو سکتی نیز یہ نہیں فرمایا وَلِلّٰہِ الْکِبْرِیَاءُ
 الْعَظِیْمَہُ کہ بڑی عظمت تو حق تعالیٰ کے لئے ہے اور چھوٹا موٹا کوئی حصہ اُس کا دوسرے کیلئے بھی ثابت ہے
 بلکہ مطلق کبر یا کبر کو دوسرے سے نفی کر دیا یہی کو حدیث میں اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ الْعَظِیْمَہُ اِزَّارِی
 وَالْکِبْرِیَاءُ اِزَّادَانِی فَمَنْ نَازَعَنِیْہِمَا قَصَمْتُمَا یعنی عظمت میرا تہم بند ہے اور کبر یا میری چادر ہے۔
 جو کوئی ان دونوں کو مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ چادر اور تہم بند فرمانا کیا یہ ہے
 خصوصیت سے معنی یہ ہوئے کہ یہ دونوں صفتیں خاص ہیں میرے ساتھ دوسرا کوئی مدعی ہوگا تو میں کو
 سزا دوں گا جب کبر یا رِحق ہو باری تعالیٰ کا تو اپنے نفس میں اس کا رکھنا مساوۃ ہوئی باری تعالیٰ کے
 ساتھ اور دیگر مغاصی کے لئے تو خود وہی کہ جب تک ان تک نہ پہنچے معصیت نہیں ہوتی مثلاً کھانا
 کہ اتنا زیادہ نہ ہو کہ موجب ہو جائے مرض کا اس وقت تک مباح ہے یا بھوکا رہنا کہ جب تک سبب نہ
 ہو جائے ہلاکت کا جائز ہے مگر وہ کبر معصیت ہے کہ اس کیلئے کوئی حد نہیں بلکہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وآلہ وسلم لا یدخل الجنة من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر یعنی جس کے دل میں ایک ذرہ
 کے برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائیگا۔ بلکہ ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ تشدد ہے۔ آخر جوا
 من النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان۔ یعنی قیامت کے دن حکم ہوگا کہ جس کے دل
 میں ایک ذرہ بھر بھی ایمان ہے اسے دوزخ سے نکالو۔ یہی حدیث سے ملاتی ہے تو کیا نتیجہ نکلنا ہوگا
 فرماتے ہیں ایک ذرہ بھر کبر جس کے دل میں ہے جنت میں نہ جائیگا۔ یہاں فرماتے ہیں ایک ذرہ بھر بھی

ایمان جس کے دل ہے جنت میں جائے گا اس سے صاف یہ بات نکلتی ہے کہ ذرہ بھر کبر بھی جس دل میں ہے اس میں ذرہ بھر ایمان نہیں ہو سکتا۔ اور ذرہ بھر ایمان جس دل میں ہے اُس میں ذرہ بھر کبر نہیں ہو سکتا ہے دونوں میں بالکل تقیضیں ہیں۔ گو اسکی توجیہ یہ ہے کہ جنت میں جانے کے وقت ذرہ بھر کبر نہ ہوگا لیکن آخر اس سے بھی نواس صفت کا مُقصاد ایمان کسی درجے میں ہونا ثابت ہوا۔ اب سمجھ لو کہ کبر کس قدر سخت معصیت ہے اور ہوتا ہی چاہیے کیونکہ سب بڑا گناہ کفر ہے اور کبر خود اسکی بھی اصل ہے اور کفر اسکی فرع تو مسلمان کو چاہیے غور کیا کرے کہ اس کے دل میں کبر ہے یا نہیں۔ مگر ہماری تو عادت ہو گئی ہے کہ سوچتے ہی نہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ نہ دیندار ہمارے خالی ہیں کبر سے نہ دنیا دار خالی ہیں کبر سے جو دیندار کہلاتے ہیں وہ دین کے پیرا یہ ہیں اس میں گرفتار ہیں اور جو دنیا دار ہیں ان کو خبر ہی نہیں۔ کہ کبر کوئی چیز ہے نہیں۔ چنانچہ دیندار لوگ نماز پڑھتے ہیں اور اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہمسم دنیا داروں سے اچھے ہیں جتنی ترقی ان کو نماز پڑھنے سے ہوتی ہے اس سے زیادہ منزل اس پندار سے ہوتا ہے دین کے ساتھ ساتھ بدترین دنیا ان کے قلب میں جگہ کر لے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ نماز میں جب یہ خرابی ہے تو ان کو چاہیے نماز چھوڑ دیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ خرابی نماز میں جب پیدا ہوتی ہے جبکہ حق تعالیٰ کی عظمت قلب میں نہ ہو اور جب عظمت ہو تو دوسری طرف توجہ ہی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اپنی نماز سے آدمی بجائے اسکے کہ ارادے اُلٹا شرمندہ ہوتا ہے اسکی ایسی مثال ہے کہ کسی بہت بڑے شہنشاہ کے حضور میں ایک نہایت ذلیل آدمی کوئی تحفہ بہت کم قیمت لے جانے اور بار کی عظمت و شوکت دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوگی مجتہد یہ ہے کہ اُس ذلیل تحفہ کو پیش کرنے پر بھی اسکو قدرت نہ ہوگی ہاتھ پر پھول جائیں گے اور غنیمت سمجھے گا کہ کسی سزا کا حکم نہ ہو جائے جلدی کی طرح یہاں سے خیریت سے نکل جاؤں۔ ہماری نمازوں کی جو کچھ حقیقت ہے وہ خوب معلوم ہے۔ پھر اس کو حق تعالیٰ اچھے حکم الحاکمین کے سامنے پیش کر کے ذرا شرم بھی نہ آنا اسی وجہ سے ہے کہ عظمت و جلال حق تعالیٰ سے ہم نے قطع نظر کر لی ہے اور اسی سے یہ خرابی پیدا ہوئی کہ دوسری طرف توجہ ہوئی اور اپنی نماز کو کچھ سمجھ کر دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے اس فقریہ سے بخوبی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ نماز پڑھنے یا اور دین کے احکام بجالانے سے اگر دل میں کبر پیدا ہو تو اس کا علاج یہ نہیں کہ اُس عمل کو چھوڑ دیا جادے بلکہ جو سبب ہے اُس کو قطع کیا جائے سبب اس کبر کا تعمیل حکم دین نہیں بلکہ عظمتِ الہی کا دل میں نہ ہونا

ہے سو اس کو پیدا کرنا چاہیے اس سے تقبیل حکم بھی ہوگی اور جو خرابی جو اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے وہ بھی نہ رہے گی۔ اس غلطی میں بہت سے پڑھے لکھے اور سمجھدار بھی مبتلا ہیں خوب سمجھ لو غرض ہمارے دیندار بھی کبر میں مبتلا ہیں اور دنیا دار بھی۔ دنیا داروں میں اس طرح کا کبر تو نہیں ہے جو دینداروں میں ہے ہاں دنیا داروں میں اور طریقے کبر کے ہیں۔ وضع میں لباس میں۔ بیاہ شادی میں۔ کبر میں سب گناہوں سے بڑھ کر ایک خرابی اور ہے وہ یہ کہ مسلمان خواہ کسی درجہ کا ہو مگر اس کے دل میں یہ بات ضروری ہے کہ جب کوئی گناہ ہو جائے کہ تو گدڑتا ہے کسی ضرورت سے لیکن کرنے کے بعد دل میں چوٹ ضرور لگتی ہے اور پشیمان ہوتا ہے مگر کبر کہ یہ گناہ ساری عمروں میں رہتا ہے اور دل پر صدمہ نہیں ہوتا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ بیاہ شادی کی جتنی رسمیں ہیں سب تباہ و برباد ہی پر مبنی ہیں پھر کسی کے دل کو صدمہ تو کیا اور ان سے خوش ہوتے ہیں خاص کر جب کہ ان پر وہ مٹھہ مٹرتب بھی ہو جائے جس کے واسطے کی جاتی ہیں یعنی علو اور شہرت جبکہ کسی کے یہاں تقرب میں بد نظمی نہ ہو اور کوئی اختلاف پیدا نہ ہو اور خیریت سے اختتام کو پہنچ جائے تو نام ہوتا ہے۔ یوں کہتے ہیں اپنی حیثیت سے زیادہ لگا دیا بڑی ہمت کی پانچ روپے کی اوقات میں کھانا کیا اچھا دیا۔ بارات کیسی بڑھیا لایا۔ اس کو کفر نہ کہیے مگر قریب کفر ضرور ہے دیکھئے شرعی مسئلہ ہے اور کتابوں میں لکھا ہے کہ گناہ کو چھوٹا سمجھنا کفر ہے اس کو سب جانتے ہیں مگر اس کو خاص کر لیا ہے معاصی ظاہرہ کے ساتھ کیوں صاحبِ معاصی قلبیہ میں یہ حکم کیوں جاری نہیں حالانکہ وہ امّ المعاصی ہیں پھر کبر کے ساتھ رضا اور فرح قریب کفر بھی نہ ہوگا۔ اب سمجھ لیا اپنے نام آوری سے خوش ہونا کس درجے کا گناہ ہے۔ رسموں کے متعلق ایک یہ دلیل سیکھ لی ہے مستورات نے آج ہی کل نئے مولوی نکل آئے ہیں اگر یہ بُری تھیں تو پہلے کسی مولوی نے کیوں منع نہیں کیا۔ خوب سمجھ لو کہ نصیحت خواہی ہی معمولی سی ہو دل میں جب ہی جتنی ہے جبکہ توجہ ہو تو یہ کہنا تو غلط ہے کہ کسی مولوی نے منع نہیں کیا۔ مولویوں نے ہمیشہ سے منع کیا ثبوت اس کا یہ ہے کہ انہیں کی کتابیں موجود ہیں جن میں منع لکھا ہے ہاں تم نے ان کے منع کرنے کو سنا نہیں کیونکہ توجہ ہی نہیں تھی اب یہ بات اپنے دل سے گھڑی کہ منع نہیں کیا۔ ایک یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رسمیں تو وہ تھیں جو کسی زمانے میں تھیں مثلاً کنگنا باندھنا باسن سے تارِ بخ رکھوانا وغیرہ اور اب تو کچھ رسمیں رہی ہی نہیں ان میں کیا کفر و شرک ہے

بسیو! کیا کفر و شرک ہی علت ہے منع ہونے کی کیا تفاخر اور سراف علت نہیں ہے جس شریعت میں کفر و شرک کو بُرا لکھا ہے کبیرہ گناہ کو بھی تو بُرا لکھا ہے زائد سے زائد گوہ اور موت کا سافرق کہہ لو۔ بلکہ میں کہتا ہوں ایک معنی کر موجودہ رسمیں اُن رسموں سے زیادہ بُری ہیں جو چھوٹ گئیں اس واسطے کہ تمہارے ہی قول کے بموجب اُن کا مبنی کفر پر تھا اور ان کا مبنی اس چیز پر ہے کہ وہ کفر کی بھی جڑ ہے یعنی کبر۔ پہلی رسمیں کفر تھیں لیکن حظ نفس سے خالی تھیں اُن کے ترک میں نفس مزاحم نہ تھا کیونکہ ان میں حظ نہیں تھا اور رسوم موجودہ میں حظ نفس ہے ان سے تنبیہ ہونے کی امید نہیں۔ سمجھ لو کہ کفر و شرک میں حظ نفس نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ نفس کو سب سے زیادہ ناگوار کسی کے سامنے چننا ہے تو جو شخص مشرک ہے اُس کو بہت سوں کے سامنے چننا پڑتا ہے تو اُس میں حظ کہاں۔ جہالت وغیرہ اور داعی اُن کو ہو جاتے ہیں ورنہ نفس کے وہ رسوم خلاف ہیں علی ہذا یہ سمجھنا کہ آج کی رسمیں کچھ رسمیں ہی نہیں ہیں اور زیادہ خطرناک ہے کیونکہ جس گناہ کو آدمی گناہ نہ سمجھے اُس سے توبہ کی کیا امید ہو سکتی ہے کیونکہ توبہ نام ندم یعنی پشیمانی کا ہے اور پشیمانی اسی چیز سے ہو کر کرتی ہے جس کی کچھ بُرائی دل میں ہو۔ جب ان رسموں کی بُرائی ہی دل میں نہیں ہے تو پشیمانی کیوں ہوگی اور جب پشیمانی نہیں تو اس سے توبہ کیسی۔ بعض رسموں کی نسبت یہ کہہ دیتی ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے جیسے چیز دنیا بچوں کو کرتا ٹوپی دینا و لیمہ یا عقیقہ بہ ہیتِ مروجہ کرنا۔ میں پوچھتا ہوں نماز پڑھنا کیسا فعل ہے ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ فعل مستحسن ہے اس میں فرض بھی ہے اور واجب بھی ہے اور سنت بھی ہے کم از کم مستحب تو ہے ہی اب اگر کوئی اس میں ذرا ساقبیر کر کے پڑھے مثلاً قبلہ کی طرف پشت کر کے پڑھے تو بتاؤ یہ نماز کیسی ہے جائز ہے کہ ناجائز اور اگر اس سے منع کریں تو یہ نماز سے منع کرنا کہلائے گا حاشا و کلاً۔ یہ نماز سے منع کرنا نہیں۔ بلکہ قبلہ کی طرف پشت کر کے پڑھنے سے منع کرنا ہے۔ نماز سے منع کرنا کیسا نماز کو درست کرنا ہے یہی حال رسموں کا ہے جہیز دینے سے منع نہیں کیا جانا بلکہ دکھلاوے اور تفاخر اور سراف سے منع کیا جانا ہے جہیز اگر اپنی بیٹی کو محبت کی وجہ سے دیا جاتا ہے تو اس میں اسکو کیا دخل ہے کہ برادری کسٹنے ایک ایک عدد دکھا کر گنو کر دیا جائے اگر اسی کا نام محبت ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی بیٹی سے شادی ہی کی تالیخ میں محبت ہوتی اس سے پہلے نہ تھی کیونکہ پہلی کی عادت تو یہ تھی کہ جو

کچھ کھلایا یا کبھی اس کی تشہیر نہیں کی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ محلے کے دو چار آدمیوں کو بھی جمع کر کے دکھایا ہو کہ لڑکی کے لئے حلو بنایا ہے یا کوئی کپڑا عمدہ سلوایا ہے بلکہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ کسی کو خبر بھی نہ پہنچے کہ پیٹ میں پڑ جائے کسی کی نظر نہ لگے اس وقت جو کچھ پیٹ میں پڑ جائے گا کام آئے گا یہ آج نئی محبت کیسی پیدا ہوئی اگر وہ محبت ہے تو یہ محبت نہیں اور اگر یہ محبت ہے تو اس سے پہلے بجائے محبت کے عداوت تھی پیسہ اور عقل سے کام لو کیا جہیز دینے کی یہ صورت نہیں ہو سکتی کہ کپڑے برتن وغیرہ جو کچھ سامان دینا ہو صندوق بند کر کے بند بھیج دیتے جائیں اور بند بھجنے میں بھی یہ ضرور نہیں کہ لڑکی کے ساتھ جاوے کیونکہ اس میں بھی ضرور ہے کہ وہ وہاں فوراً سب کے سامنے کھلے گا۔ وہی ریا پھر رہی بلکہ جب لڑکی میکے میں آوے اس کو دید و پھر وہ جب چاہے لے جاوے خواہ دفعتاً یا تدریجاً مگر اس کو کوئی گوارا نہیں کرتا ہے۔ ہمارے پاس یہ کافی ثبوت ہے اس امر کا کہ تفخر اور دکھلاوا ہی منظور ہے پھر جہیز میں وہ چیزیں ہوتی ہیں جو کبھی کام نہیں آتیں صرف ضابطہ کی خانہ پڑی کر دیتے ہیں۔ جو کی ضرور دی جاتی ہے جس کا ناپ تول ایسا تجویز ہوا ہے کہ کارآمد نہیں نہ اتنی چھوٹی کہ ہر وقت اٹھانے بٹھانے کے قابل ہو اگر چھوٹی ہوتی تو باورچی خانے ہی میں پڑی رہا کرتی اور اتنی بڑی نہیں کہ نماز پڑھ سکیں۔ ایک عجیب و رد سر ہے ایک جگہ ڈال دیا اور دیکھا کریں پیڑھی نواڑکی مٹی ہونی ضرور ہوتی ہے حالانکہ کبھی کام میں نہیں آتی سوائے اس کے کہ ایک طرف احتیاط سے رکھ دی جائے اور گل کر اور ٹوٹ کر ایندھن ہو جائے کیونکہ پیڑھی کا کام تو یہ ہے کہ چولہے کے پاس اس پر بیٹھ سکیں اور جہیز کی پیڑھی اس قدر نازک سبک اور نکلٹ کی ہوتی ہے کہ چولہے کے پاس رکھنے سے جی دکھتا ہے چولہے کے پاس اس واسطے نہیں رکھی جاتی اور کسی کام کی ہے نہیں۔ بتاؤ یہ کون عقل کی بات ہے اسی کو التزام بالا ملتزم کہتے ہیں جس سے علماء منع کرتے ہیں۔ جہیز کی چیزیں اکثر ایسی ہی ہوتی ہیں جو ایک دفعہ دکھلانے کے لئے بنادی جاتی ہیں اور واقع میں بیس کا راور پرانی ہوتی ہیں حتیٰ کہ بازار والے بھی جانتے ہیں جب خریدنے جاؤ تو پوچھتے ہیں گھر کے استعمال کی واسطے چاہیے یا دینے کے لئے محبت اسی کا نام ہے۔ جہیز بڑھیا ہونے کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ لڑکے کے سارے خاندان کو جوڑے بٹے جلتے ہیں اور خاندان میں کئی کئی پشت تک کے مردے بھی شمار کئے جاتے ہیں ان کے بھی جوڑے

ہوتے ہیں شاید مزدوں کو پہنانا منظور ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ جوڑے پہننے کے قابل ہوتے بھی نہیں صرف ضابطہ کی خانہ پُری کے لئے کپڑوں کے عدد پورے کر دیئے جاتے ہیں۔ پاجامہ کا کپڑا دیکھئے وہ چھوٹا کرتے کا دیکھئے وہ چھوٹا جن کے یہاں پہنچتے ہیں وہ اُن کا پاجامہ کرتا بناتے نہیں کیونکہ بن ہی نہیں سکتا اور کاموں میں لاتے ہیں۔ کیا یہ بائیں عقل کی ہیں۔

یہ حالت تو جہیز کی ہے اب ولیمہ کی سنتے اس پر بہت ہی زور دیا جاتا ہے کہ یہ تو بالیقین سنت ہے سنت کا نام تو سن لیا یہ بھی معلوم ہے کہ سنت کہتے کس کو ہیں سنت نام ہے ماثبت بالسنۃ کا یعنی وہ فعل جو حدیث سے ثابت ہو۔ ولیمہ بیشک حدیث سے ثابت ہے مگر لافقر بوا الصلوٰۃ کی مثل نہ کرو کہ نفس ولیمہ کا ثبوت تو حدیث سے لے لیا اور اسکی کیفیت جو حدیث میں آئی ہے چھوڑ دی جس طرح کہ نفس ولیمہ ثابت بالحدیث ہوئی وجہ سے اختیار کرتی ہو اُسی طرح اس کی کیفیت اور طریقہ بھی کیوں نہیں اختیار کرتیں اگر وہ ثابت ہے تو یہ بھی ثابت ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ولیمہ کی کیفیت سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ صبح کو صحابہ سے فرمایا جو کچھ کھانے کی چیز کسی کے پاس ہو لے آؤ لوگوں کے پاس سفر میں جیسا کچھ نوشہ موجود تھا لا رکھا کسی کے پاس کچھ برتن کسی کے پاس پیڑ تھا کسی کے پاس سوکھی روٹیاں تھیں جو کچھ تھا لا کر رکھ دیا اور سب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بیٹھ کر کھایا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ولیمہ ہو گیا۔ ولیمہ کا ثبوت تو سب کو یاد ہے اس کیفیت کا ثبوت کسی کو یاد نہیں۔ کیا کوئی ایسا کر سکتا ہے۔ یہ حدیث تو فعلی ہے قولی حدیث لیجئے شلا طعاما ولو لیمت یدعی لھا الا غنیا و یتزک الفقراء یعنی بُرا کھانا اس ولیمہ کا کھانا ہے جس میں امیروں کو بلا یا جائے غریبوں کو چھوڑ دیا جائے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سب ولیمے اچھے ہی نہیں بعض بڑے بھی ہوتے ہیں جب بُرا ہے تو منع کر نیکیے قابل ہے یا نہیں۔ آجکل ولیمہ ایسا ہی ہوتا ہے اگر کوئی غریب محتاج مانگے تو کہہ دیتے ہیں پہلے جن کی واسطے پکا ہے اُن کو تو کھالینے دو تم کو پیچھے ملے گا۔ اس ولیمہ کی بُرائی میں نے حدیث سے سنادی پھر علماء اگر منع کریں تو کیا الزام دوسری حدیث سے سنئے تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن طعاما المنباریین یعنی منع فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن دو شخصوں کے کھانے سے جو آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرتے ہوں یعنی بخشا بخشی سے کہلا ہوتے ہوں۔ اب دیکھ لو کہ برادری کے کھانے ایسے ہی ہوتے ہیں یا نہیں۔ اگر

ایک نے گوشت روئی دیا ہے تو دوسرے کی کوشش ہوتی ہے کہ بریائی دے تیسرے کی کوشش ہوتی ہے کہ فربہنی بھی موجود ہو چوتھا بشر مال اور بڑھاتا ہے حدیث شریف کے بموجب ایک کے یہاں بھی کھانا نہ چاہیے دیکھو یہ اُن تقریبوں کی حالت ہے جن کو مسنون بناتے ہیں۔ بزرگوں کا قول ہے طعام المیت میت القلب اس کے معنی متعارف اور مشہور تو یہ ہیں کہ وہ کھانا جو کسی کی موت میں پکا ہوا اس تقدیر میں طعام کی اضافت میت کی طرف بہت ہی بعید ملا بہت سے ہو سکتی ہے میرے نزدیک میت کے معنی عاصی کے لئے جاتیں تو زیادہ مناسب ہے، یہ استعمال قرآن شریف میں بھی آیا ہے اَوْنُكَ اَنْ يَمْنَنَ فَاَخْبَنُكَ اَوْهُ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو دولت حیات بخشی۔ اب معنی طعام المیت کے یہ ہوں گے وہ کھانا جو گناہ کے طریق پر پکا ہوا یعنی اضافہ الی الفاعل ہوگی اس کھانے میں یہ نحوست ہے کہ دل مرجاتا ہے۔ یعنی جس نہیں رہتی۔ مردہ اور زندہ میں احساس اور عدم احساس ہی کا تو فرق ہوتا ہے۔ جب قلب میں جس نہ رہی تو جس گناہ میں بھی پڑ جائے کم ہے۔ یہ برکت ہے ان ولیموں اور عقیقوں اور بھاجیوں کی جن کو کہتی ہو یہ رسمیں ٹھوڑا ہی نہیں۔ انھیں رسم نہ کہواؤ کہہ لو۔ یاد رکھو یہ سب رسمیں ہی ہیں یہ کیا ضرور ہے کہ رسم وہی ہو جو کفر و شرک ہو لگے زمانے کی رسمیں بڑی رسمیں تھیں یہ اُن کے مقابلے میں چھوٹی ہسی مگر میں تو رسمیں ہی اور ان کو چھوٹا بھی تنزیلاً کہتا ہوں ورنہ درحقیقت اُن سے کچھ نہیں بلکہ من وجہ زیادہ ہی ہیں جیسا ابھی میں نے بیان کیا کہ رسوم متروکہ مبنی علی الکفر تھیں اور یہ مبنی علی الکبر ہیں اور کبر کفر کی جڑ ہے۔ غرض موجودہ رواج بھی سارے کے سارے رسوم ہی ہیں تغافل کی وجہ سے ذہنوں میں سے اُن کا قبح جاتا رہا ہے۔ رسمیں سب چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔ ان میں جتنی مصالحتیں بتائی جاتی ہیں سب من سمجھوتی ہیں حقیقت میں سب التزام مالا بلترزم ہے اچھے سمجھداران میں یہوقوف بن جاتے ہیں اور بیروی کئے جاتے ہیں۔ بہت سی رسموں کی مصالحت اور وجہ ایجاد معلوم بھی نہیں مگر اسی ہمتیت کے ساتھ دابر برہوتی ہیں جب کوئی وجہ بھی اُن کی ذہن میں نہیں تو تقلید محض ہوتی یا نہیں اور کسی کی تقلید شریعت کی تو درکنار کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کسی عقلمند کی بھی تقلید ہے۔ حاشا وکلا ایں سوائے اس کے نہیں کہ جہلا کی تقلید ہے اور رسم محض ہے مصالحت کا نام بھی لینا غلط ہے اور غضب یہ ہے کہ بہت سی رسمیں اب بھی برکت حاصل کرنے کیلئے اُرا جاتی ہیں جب تک فلاں فلاں کام نہ ہوں شادی منزاوار نہیں ہوگی۔ بغور باللہ اور انھیں رسموں کی

نسبت جن کی بنا پر تقلیدِ جہلا پر ہے۔ قرآن شریف میں ہے وَلَا تَبْرَحْ الْجَاهِلِيَّتَ الْأُولَىٰ
اور اَفْخِمْ الْجَاهِلِيَّتَ الْبَاقِيَةَ۔ ازواجِ مطہرات کو حکم ہے کہ جیسا جاہلیہ میں بے دھڑک نکلتی تھیں
اب نہ نکلو۔ اور بطور انکار فرماتے ہیں کیا جاہلیت کا حکم پسند کرتے ہیں بہت لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ رسموں کا
شریعت میں کہیں ثبوت نہیں تو منع کا بھی ثبوت کہاں ہے۔ کیا اچھے کپڑے پہننا منع ہے اپنی اولاد کو دینا
ناجائز ہے ہمالوں کی خاطر داری بُری بات ہے میں کہتا ہوں منع کا ثبوت قرآن سے تو مذکور ہوا اب حدیث
لیجئے۔ ارشاد ہے مَنْ لَبَسَ ثَوْبَ الشُّهُرِ وَالْبَسَمُ اللَّهُ تَوْبُ الذَّلِيلِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ یعنی جو کوئی کپڑا دکھائے
کے لئے پہنے گا اس کو قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنایا جائے گا۔ یہ حدیث کپڑے کے بارے میں
بالکل صریح ہے اور رسوم کو باشرک عِدَّت شامل ہے اس وعید کی علت شہرت ہے جس کام
میں شہرت کا قصد کیا جائے سب اُس کے اندر آگئے خواہ اُس کو بیٹی کا دنیا کہہ لویا ہمالوں کی خاطر
سمجھا کر وجہ عقل سے کام لوگی تو حقیقت میں بنار ان رسموں کی صرف دکھلاوے اور التزام مالا
یلتزم ہی پر پاؤگی۔ پیسہ اگر ان رسموں میں بھلائی ہوتی تو دونوں جہان کے بادشاہ جناب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح میں ضرور تہیں کیا حضور صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں کہیں کی کبھی حق تعالیٰ جو چاہتے دیدیتے۔ آپ کی منگنی کا قصہ میں بیان کرتا
ہوں۔ اول یہاں کی منگنی کے خرافات سنئے یہاں شادی سے پہلے اُس کے مقدمہ ہی میں جس کی
حقیقت سوائے زبانی پُخت و پز کے کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا کیا کچھ طومار پھیلانے جاتے ہیں اس کا بھی
پوا ایک قانون مرتب ہے دور دراز سے سفر کر کے لڑکے والا جائے۔ اپنا وقت ضائع کرے روپیہ برباد
کرے اتنے دنوں میں جو کچھ کتنا اُس کو سوخت کرے تب اُس سے بات قرار پائے یہ بہت جمال کے
ساتھ بیان ہو ورنہ جو قیدیں منگنی میں طرفین سے مقرر ہیں سب جلتے ہیں۔ حاصل یہ کہ جو کام دو
پیسے کے خط سے نکلتا اُس میں صد ہارو پے ضائع کئے جاتے ہیں کیوں صاحب اس میں کیا مصلحت
ہے اگر یہ کہو کہ خط پہنچانہ پہنچا کیا اعتبار ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ خط کو جڑبڑی کرا دیا ہوتا یا بیمہ کرا کے
بھیجا ہوتا اگر اس میں بھی ضائع ہونے کا احتمال ہے تو یہ احتمال غیر ناشی عن دلیل ہے اور اُس کو ضبط
اور دہم کہتے ہیں۔ ہم جس مکان میں بیٹھے ہیں اس میں ہر وقت امکان عقلی موجود ہے کہ گرجائے لہذا
چاہیے کہ بھاگیں پھر جس مکان میں جائیں گے وہاں بھی یہی احتمال ہے نتیجہ یہ کہ بھاگے پھریں

یہ پاگل پن ہے یا کچھ اور ایسے احتمالات پر اگر حکم کریں تو دنیا کا ایک کام بھی نہ چلے۔ ہزار ہا روپیہ کے نوٹ ڈاک ہی میں بھیجے جاتے ہیں پارسل ڈاک ہی میں جاتے ہیں اگر ضائع ہونے کا خوف ہے تو سب کاموں کے لئے آدمی ہی بھیجا کیجئے غرض مگنی کے لئے اس قدر درد دہری کرنے میں مصلحت کچھ بھی نہیں صرف پابندی رسم ہے ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔

میں کہتا ہوں اسی میں غور کیا ہوتا کہ ہمیشہ سے کب سے ہوتا چلا آیا ہے۔ ہندوستان میں پہلے مسلمان نہ تھے۔ اب دو حال سے خالی نہیں یا تو جب مسلمان ہندوستان میں آئے ان رسموں کو بھی اپنے ساتھ لائے یا یہاں کی رسمیں تھیں مسلمانوں نے بھی لے لیں۔ شق اول تو غلط ہے کیونکہ اگر یہ رسمیں اسلامی رسمیں ہوتیں تو مسلمانوں کی کتاب میں ہوتیں حالانکہ ایسا نہیں لہذا ثابت ہوا کہ شق ثانی ہی صحیح ہے یہ سب رسمیں ہندوؤں کی ہیں انھیں کی صحبت سے مسلمانوں میں بھی آگئیں۔ رسموں کے نام خود بتاتے ہیں کہ ہندوستان کی ایجاد ہیں مثلاً بری لفظ ہندی ہے برودہا کو کہتے ہیں۔ اگر کسی اور ملک کی رسم ہوتی تو فارسی یا عربی میں نام ہوتا۔

اسی طرح بہوڑا ٹھیکہ ہندی لفظ ہے عقل صاف کہتی ہے کہ ہندوؤں کی رسمیں ہیں ہندوؤں سے خلا ملا ہونے سے مسلمان بھی سیکھ گئے مَنُ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ چنے جس قوم کی مشابہت کی وہ اسی میں سے ہے بہت مشہور حدیث ہے مگر تعجب ہے کہ اس کا مصداق صرف کوٹ اور تپلون یعنی انگریزی وضع کو قرار دے رکھا ہے حالانکہ تشبیہ عام ہے لباس میں ہو یا رسم و رواج میں۔ ایک قصہ مجھ کو یاد آیا۔ ایک بزرگ تھے وہ ہولی کے دن باہر نکلے تو ہندوؤں کی ہر چیز کو رنگین پایا حتیٰ کہ جانوروں کو بھی۔ راستے میں ایک گدھا پڑا۔ ہنسی میں کہنے لگے۔ تجھ کو کسی نے نہیں رنگا اور یہ کہہ کر اس پر پان کی پیک ڈال دی مرنے کے بعد کسی نے خواب میں دیکھ کر حال پوچھا فرمایا کہ اس پیک ڈالنے پر مواخذہ ہوا کہ اس کو ہولی کھیلنے والوں کے ساتھ لے جاؤ۔ تشبیہ ایسی چیز ہے محمود بادشاہ نے جب ہندوستان کو فتح کیا اور سومات کا مندر توڑا تو تمام بت توڑ ڈالے جو بت سب سے بڑا تھا اس کو بھی توڑنا چاہا پجاریوں نے بہت الحاح و زاری کی اور کہا اس کے برابر ہم سے سونالے لیا جائے اور اس کو نہ توڑا جائے محمود نے ارکان سے مشورہ کیا سب نے کہا ہم کو فتح ہو ہی چکی اب ایک بت کے چھوڑ دینے سے ہمارا کیا جاتا ہے اس قدر مال ملتا ہے شکر اسلام کے کام آئیگا۔ چھوڑ دینا

چاہیے مجلس میں سید سالار مسعود غازی بھی تھے فرمایا یہ بُت فروشی ہے اب تک بادشاہ بُت شکن مشہور تھا اب بت فروش کہلائے گا۔ محمود کے دل کو یہ بات لگ گئی مگر گو نہ تردد باقی تھا دو بہر کو سویا تو خواب میں دیکھا کہ میدانِ حشر ہے اور ایک فرشتہ ان کو دوزخ کی طرف یہ کہہ کر کھینچتا ہے کہ یہ بُت فروش ہے دوسرے فرشتے نے کہا کہ نہیں یہ بُت شکن ہے اس کو جنت میں لے جاؤ اتنے میں آنکھ کھل گئی فوراً حکم دیا بُت توڑ ڈالا جائے اُس کو جو توڑا تمام پیٹ میں جواہرات بھرے ہوئے نکلے حق تعالیٰ کا شکر کیا کہ بُت فروشی نے بھی بچا اور جس مال کی طمع میں بت فروشی اختیار کرتا تھا اس سے زیادہ مال بھی مل گیا۔ یہ جنت اور دوزخ کی طرف کھینچا جانا اس تردد کی صورت دکھائی گئی جو محمود کے قلب میں تھا خیال کرنے کی بات ہے کہ بت کو چھوڑ دینا حقیقت میں بت فروشی نہ تھا لیکن صورتِ بت فروشوں کی مشابہت تھی جس کا نتیجہ ہوا خدا پناہ دے مسلمانو! اس میں سب کفار کی رسمیں ہیں مزید برآں مل گیا ہے ان میں تفاخر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت اور بدعات ظلمات بعض ظن نہ بتہ تاریکیاں شر کے اندر سرگھسا ہوا ہے۔ ہاں سنئے بی بی صاحبہ کی منگنی کیونکر ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود جاکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ فاطمہؑ کا نکاح مجھ سے کر دیجئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی سے منظور فرمایا یہ منگنی ہو گئی۔ یہاں کچھ بھی نہ ہو

فقط دو لہا مجمع میں بول بھی اٹھے تو غضب آجائے کیسا بے چارہ لہا ہے۔ اب بی بی صاحبہ کے نکاح کی سنئے اور بارات کا سامان سنئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اور چند صحابہؓ کو بلا بھیجا اور نکاح پڑھ دیا۔ مواہب لدنیہ میں ہے کہ حضرت علیؑ اس وقت موجود بھی نہ تھے نکاح ہو جانے کے بعد آپ کو خبر پہنچی تب آپ نے قبول کیا۔ یہ بات تھی کہ نواسہ بھی ندارد پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام ایمن کو حکم دیا یہ ایک لونڈی تھیں کہ فاطمہؑ کو علیؑ کے گھر پہنچاؤ۔ بی بی صاحبہ منہ پیٹے ہوئے ہاتھ پکڑائے اپنے گھر پہنچ گئیں۔ یہ رخصتی ہوئی۔

جہیز دیارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مگر نہ اتنا کہ گھر لٹا دیا نہ کسی کو دکھایا جہیز دینے سے منع نہیں کیا جاتا۔ ہاں جس طرح دیتے ہیں وہ بیشک منع ہے۔ ایک ایک عدد اٹھا اٹھا کر سب کو دکھایا جاتا ہے جوڑوں پر گوٹہ پیٹا جاتا ہے کہ جو کوئی نہ بھی دیکھے تو اُس کی چمک نے نگاہ اٹھ جائے سیوا

یہ تو جائز نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں نے سچکل اسکی یہ اصلاح کی ہے کہ جہیز کھول کر دکھاتے اور گنواتے نہیں ہند وقوں میں بند کر کے برادری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ اُس سے بھی بدتر ہے کھول کر دکھانے سے تو ایک حد اور مفادِ اس کی ذہنوں میں آجاتی ہے اُسی کے موافقِ محبتیں و آفریں ہوتی ہے اور بند چیز کی نسبت یہی خیال ہوتا ہے کہ خدا جانے کیا کیا کچھ ہوگا اس سے دینے والے کے نفس کو اور زیادہ بُرائی کا موقع ملتا ہے۔ جہیز کو رخصتی کے وقت بالکل بھیجو ہی مت گھر میں رکھا رہنے دو جب لڑکی کا گھونگھڑے کھل جائے تب لے جاؤ اور اسکے ہاتھ میں فہرست دو اور گنواؤ اور کنجیاں اُس کے حوالے کر دو کہ یہ تیرا جہیز ہے یہ طریقہ تو ہے محبت سے دینے کا باقی سب ریا و موند ہے یہ طریقہ اس رواج سے بہتر ہے کہ جس کا جہیز ہے اُس کو خبر بھی نہیں ہوتی بس سرائ والوں کو بُنی دیدی جاتی ہے اگر کوئی چیز جاتی آتی رہتی ہے تو تمام عمر کی لڑائی بندھ جاتی ہے اور ایسا ہوا ہے کہ سسرالویرو کی بدبیتی سے یا غفلت سے چیزیں ضائع ہو گئی ہیں۔

اب چوتھی اور چالائینی بہوڑا سنئے نکاح سے اگلے دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا ذرا سا پانی لاؤ اور حضرت فاطمہ سے فرمایا تم بھی ذرا سا پانی لاؤ اور دونوں پر پانی چھڑکا اور دعا دی پس سے معلوم ہوا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس وقت گھر چلتی پھرتی تھیں۔ یہاں کی طرح بُت بنی نہیں بیٹھی تھیں۔ یہاں یہ بھی ایک تکلف ہے کہ بہو بالکل بُت ہوتی ہے حیوان متحرک کی جگہ حیوان غیر ذی حرکت بن جاتی ہے۔ بچانہ پیشاب کو بھی بلا دوسرے کے نہیں جاسکتی۔ ہنس بول نہیں سکتی۔ سچ جج کے جس بیجا میں رکھی جاتی ہے کئی کئی دن پہلے سے کھانا کم کیا جاتا ہے اس خوف سے کہ پاخانہ کی حاجت ہوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ بہو ایسی ہوتی چاہیے جس کے پیچھے حاجاتِ انسانی نہ ہوں انسانیت سے خارج ہو بولتی نہ ہو گونگی ہو۔ اس جس بے جا کو یہاں تک بڑھایا ہے کہ بہو نماز بھی نہیں پڑھتی۔ اول تو نمازی ہوتی بہت کم ہیں اور جو کوئی نمازی ہوتی بھی تو نماز کے وقت اگر کوئی سہیلی موجود ہے تو دبے دبائے پڑھ لی اور نہیں تو یہ عذر ہے کہ کوئی تھا نہیں کون پڑھواتا۔ اکیلی کس طرح پڑھتی۔ تفت ہے اس پر سے پر بہت جگہ اس قید سے لڑکیاں بیمار ہو گئی ہیں اور جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ ہم لوگوں نے جو بات اختیار کی ہے افراط و تفریط سے خالی نہیں پردہ ہو تو اتنا گہرا اور نہ ہو تو بالکل نہیں دیورہیٹھ

خاتمہ چھوڑنے کے لوگوں سے بالکل پردہ نہیں حالانکہ حدیث شریف میں ہے۔ المحمولوت یعنی دیور موت ہے۔ سفر میں جب چلیں گی تو ریل جیسے آسان سفر میں نمازیں قضا صرف اس عذر سے کہ قبلہ معلوم نہ تھا یا وضو کے لئے پانی کہاں سے آتا پانی مانگنے یا قبلہ پوچھنے میں بے پردگی ہوتی ہے کیوں پسینو! جس گاڑی میں تم بیٹھی ہو اگر اُس میں کوئی حادثہ ہو جائے مثلاً آگ لگ جائے یا کوئی چور ڈاکو گھس آئے تو اُس وقت بھی نہ بولو گی اُس وقت تو وہ دُہائی مچاؤ گی کہ قیامت برپا ہو جائے اس وقت پردہ کہاں جائے گا۔ بات یہ ہے کہ وہ دنیاوی حادثات کی تو ہول دل میں ہے اور اخروی حادثے یعنی گناہ کے انجام کچھ سمجھ نہیں جاتے بہت ہلکی اور معمولی چیزیں ہیں۔ یہ خبر ہے کہ گاڑی میں آگ لگنے یا چور ڈاکو کے ہاتھ سے زائد سے زائد جان جاتی رہیگی یہ تھوڑی سی دیر کی تکلیف ہے کہ ہوئی او گزر گئی اور ایک نماز کے بدلے ہزاروں برس اُس عذاب میں رہنا ہو گا جس کے سامنے دوزخی موت کی تمنا کریں گے بہو بیچاری حیوان غیر حساس کو یہ عذر ہے کہ کوئی پاس نہ تھا نماز کیسی پڑھتی گھر والوں کو اور سب کاموں کے ہوش ہیں کھانا کھلانے دینے دلانے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوتی ہاں نماز پڑھوانے کا بیشک خیال نہیں رہتا خوب سمجھ لو کہ سارے گھر والے مجرم ہیں گناہ ایک بہو پر ہی نہیں سکو سزا ہو گی بغرض پردہ میں جہاں افراط ہے وہاں اس حد تک اور جہاں تفریط ہے وہاں بالکل اڑا ہی دیا۔ یہ سب تراشی ہوئی رسمیں ہیں یا نہیں کیا ان کا کوئی ثبوت ہو سکتا ہے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خود اٹھ کر پانی لائیں کسی سہیلی نے لا کر نہیں دیا۔

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اگلے مولویوں نے کبھی ان رسموں کو نہ لیا ساری نصیحت آج ہی کل کے مولویوں کے حصے میں آگئی اس کا جواب ایک تو میں پہلے دے چکا ہوں کہ نصیحت جب ہی دل میں پڑتی ہے کہ جب توجہ ہو ورنہ دیوار کو سُنانا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہمیں کچھ بحث نہیں مولویوں نے منع کیا ہو یا نہ کیا ہو جب حدیث میں موجود ہے تو آگے کچھ حجت کی ضرورت نہیں نیز میں کہتا ہوں اگلے مولویوں نے بھی ضرور منع کیا فقہانے عورتوں کو اُس مجمع میں جانے سے منع کیا ہے جس میں یہ مفاسد ہوں دیکھو روالختار میں لکھا ہے۔

یہ مسئلہ ایک طالب علم بھی بتا سکتا ہے مگر یہ ترکیب غضب کی ایجاد ہے کہ مفاسد کو مفاسد ہی نہ کہو موجودہ رسموں کو رسم ہی نہ کہو کہ اُن پر منع وارد ہو۔ یہ جہل مرکب اور قلب کی موت ہے

کرنے کو جو چاہو کر گزرو مگر یہ یاد رکھو کہ گناہ کا گناہ ہونا منہا رہے سمجھنے نہ سمجھنے پر موقوف نہیں واقع میں جو اثر گناہ کا ہے وہ ضرور ظاہر ہو گا۔ اگر کوئی زہر کھالے اور دل میں خیال کرے کہ زہر نہیں شکر ہے تو کیا وہ شکر ہو جائیگا ہرگز نہیں۔ تھوڑی سی دیر میں مزہ دکھائیگا حتیٰ کو اختیار کر لیا باطل کو۔ ایک طرف کا بوجھانا اس سے بہتر ہے کہ غلطی میں پڑے رہو اور اس کو غلطی نہ سمجھو۔ جو شخص غلطی میں مبتلا ہو مگر اس کو غلطی سمجھتا ہے تو کبھی نہ کبھی یہ امید ہے کہ اس کو چھوڑ دے گا۔ اور جو شخص غلطی کو غلطی ہی نہیں سمجھتا اس سے کیا امید ہو سکتی ہے خود تو متنبہ کیوں ہونے لگا۔ اگر کوئی اور بھی خبردار کرے تو جواب میں کہے گا واہ اس میں بھی کچھ بُرائی ہے جو میں چھوڑ دوں ایسا شخص ہمیشہ گناہ میں مبتلا رہے گا۔ موت کے وقت بھی تو بے نصیب ہونے کی کیا اُمید ہے غرض یہ خیال بالکل غلط سمجھو کہ موجودہ رسمیں رسمیں نہیں ہیں اور ساتھ ہی اس کے رسمیں چھوڑنے کی بھی ہمت کرو۔ اُن کو ہلکا نہ سمجھو یہ اُس اصل کی فرع ہیں جو تمام گناہوں کی حتیٰ کفر و شرک کی بھی جڑ ہے۔

یہ میں نے چند نظرسِ کیر کی بطور مثال کے بیان کی ہیں اُن کو اور ہر اُس عمل کو جو کبر کی فرع ہو چھوڑ دو جیسے غیبت حسد و خیرہ غیبت کوئی جب ہی کرتا ہے کہ جب اپنے آپ اس سے اچھا سمجھتا ہے جس کی غیبت کرتا ہے کسی مریض کو ہنستا ہی شخص ہے جو خود دندہ رست ہو اور اگر اپنے آپ کو اُس سے بھی زیادہ مریض پائے تو کہیں نہیں دیکھا ہو گا کہ وہ اپنے سے کم مریض کو ہنستا ہو یہ اچھا سمجھنا ہی کبر ہے۔ علیٰ ہذا دوسرے کی نعمت کو دیکھ کر جو آدمی جلتا ہے (جسے حسد کہتے ہیں) اُس کی بنا پر بھی اس پر ہے کہ اُس صاحبِ نعمت سے زیادہ اپنے آپ کو اُس نعمت کا اہل سمجھتا ہے یہ بھی اپنے نفس کی بُرائی ہے جس کو کبر کہتے ہیں غرض اکثر گناہوں کو ٹٹولگی تو بنا کبر ہی پر پاؤ گی۔ لہذا سب کو چھوڑ دو حتیٰ کہ معاصی کی اصل ہی دل میں سے نکل جائے کیونکہ بُرائی کو حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص فرمایا ہے کسی دوسرے کا اس میں حصہ نہیں تو جو شخص کبر کو نہیں چھوڑتا وہ نہیں پہچانتا کہ یہ کس کا حق تھا اور کس کو دیتا ہے لوہں نے نہ نفس کا حق پہچاننا حق تعالیٰ کا اس سے بڑھ کر جاہل کون ہو گا یہ شخص معاصی سے کبھی چھوٹ نہیں سکتا جس گناہ میں بھی پڑ جائے کم ہے کیونکہ معاصی کی جڑ اُس کے دل میں موجود ہے ایک سے بچے گا دوسرے میں پڑ جائے گا۔ اس واسطے حق تعالیٰ نے ایک ایسا علاج اس کا بتایا کہ جب اُس کو مستحضر رکھا جائے تو نہ چھوٹا

گناہ ہونہ بڑا وہ علاج یہ ہے کہ اپنی ایک صفت کو بیان فرمایا کہ جب خیال رکھو گی کہ یہ کسی دوسرے کے لئے کسی وقت اور کسی حالت میں ثابت نہ ہونے پائے تو گناہ تم سے خود بخود چھوٹتے جائیں گے۔ وہ صفتِ عظمت ہے **وَلَكُمُ الْكِبَرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالدَّرَجٰتِ** اور اسی کو زبہن اور آسمانوں میں بڑائی حاصل ہے، یہ اصل کل ہے تمام گناہوں سے حفاظت کی اور جب صفتِ کبر یا یعنی عظمت مختص ہوئی ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ تو نفس کے واسطے کیا رہ گیا۔ تذلل یہ اصل ہے تمام عبادات کی تو جس شخص نے صفتِ کبر یا کو مختص مان لیا حق تعالیٰ کے ساتھ اُس نے حق تعالیٰ کو بھی پہچان لیا اور نفس کا بھی اس سے بڑھ کر کوئی عالم یا محق ہو سکتا ہے انھیں کی شان میں ہے **وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰلِدُ الْاَلْبَابِ** یعنی عقلمند لوگ ہی ہیں جب آدمی کے دل میں سے تمام گناہوں کی اصل نکل گئی اور تمام عبادات کی جم گئی تو سبھی کچھ اُس نے پالیا اس کو دنِ دُنی رات چو گئی ترقی ہوگی۔ اس کے ساتھ آنا اور سمجھ لو کہ یہ اصل کلی بہت مختصر الفاظ میں سمجھائی گئی ہے مگر بعض اوقات بلا تفصیل کے اس پر عمل دشوار ہوتا ہے یعنی جب تک ہر عمل کی نسبت معلوم نہ ہو کہ اس کا منشاء کبر کس طرح ہے اُس کا ترک آسان نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے سہل اور مفید تدبیر یہ ہے کہ کتابوں کا مطالعہ کیا جائے بلکہ کسی سے سبقاً سبقاً پڑھ لیا جائے اور جو کوئی پڑھ نہ سکے وہ کسی عالم سے وقتاً فوقتاً سُن لیا کرے۔ واقعات کو پوچھتا رہے اور وعظ سنا کرے اور عورتوں کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ جہاں اُن کی ہانڈی چولہے کا ایک وقت ہے کتاب کے پڑھنے یا سننے کا بھی ایک وقت ہونا چاہیے لیکن افسوس کے ساتھ کہ جتنا ہے کہ مستورات کو اس سے بالکل متسلک بھی نہیں مرد کو بھی کوئی مسئلہ پوچھ بھی بیٹھتے ہیں مگر عورتوں کو نہ کہیں زبانی پوچھواتے دیکھانہ کوئی تحریر کسی کی آتی ہے (الَا مَا شَارَ السَّيِّئُ) حالانکہ بعض مسائل عورتوں کے اس قدر پیچیدہ ہیں کہ جواب دینا بھی ہر ایک کا کام نہیں مثلاً پاک اور ناپاکی کے مسائل کی کہ فقہ کی تمام بحثوں سے اوقِ بحث یہ مشہور ہے صورتیں مشکل سے شکل پیش آتی ہیں مگر اس پر عمل ہے کہ نہ پڑھی نہ قضا ہوئی۔ کچھ عورتیں تو شرم کے مارنے نہیں پوچھتیں اور بعض جو کسی قدر پڑھی لکھی ہیں وہ کسی اُردو کی کتاب میں دیکھ کر جو التماسدھا سمجھ میں آیا کہ گزرتی ہیں حیف کی بات ہے کہ اگر کوئی مرض شرم کا ہو جاتا ہے تو اس کے علاج میں یہ نہیں کرتیں کہ بلا سے

جان جاتی رہے مگر شرم نہ جائے۔ علاج کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر ایسی نکال لیتی ہیں کہ شرم بھی نہ جائے اور علاج بھی ہو جائے۔ بیسیو! کسی مسئلہ کا تحقیق کر لینا تو آج کل کچھ بات بھی نہیں دو پیسے میں چاہے جہاں سے جواب منگا لو اگر خود نہ کر سکو اپنے خاوند کی معرفت پوچھو لو یا اور کسی بی بی کے ہاتھ سے لکھو اگر دریافت کر لو اگر نہ خود لکھ سکو نہ شوہر موجود ہو۔ مگر بات یہ ہے کہ یہ سب جب ہو جب دین کا خیال ہو اس غفلت کو چھوڑو اور دین کو دنیا سے بھی زیادہ ضروری سمجھو۔ دنیا ختم ہو جائے گی اور آخرت ختم نہ ہوگی۔ جو طریقہ میں نے بیان کیا اس سے بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ گھر میں جب مسائل کا تذکرہ ہو گا بچوں کے کان میں پڑیں گے اور ساری عمر ان کو یاد رہینگے جو لوگ تمہارے تابع ہیں ان کی اصلاح ہوگی ان کی اصلاح بھی تمہارے ذمہ ضروری ہے حدیث میں ہے **كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ** یعنی ہر بڑے کو چھوٹے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محافظ فرمایا کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ ذمہ دار ہے اور اس کی جواب دہی اُس کے ذمہ ہے اگر نوکری تمہاری نماز نہیں پڑھتی ہے تو وہ گنہگار ہے مگر تم بھی اُس کے ساتھ گنہگار ہو اور جواب دینا ہو گا کہ اُسے نماز کیوں نہیں سکھائی تھی بعض لوگوں نے اس کا جواب یہی اختیار کر لیا ہے کہ ہم نے تو بہترین تاکید کی مگر وہ نماز پڑھتی ہی نہیں۔ کیوں بیسیو!۔ اگر کھانے میں وہ نمک کم و بیش کر دے تو تم کیا کرتی ہو کیا ایک دو دفعہ سمجھا کر کہ نیک بخت نمک ٹھیک رکھا کر خاموش ہو رہتی ہو اور پھر نمک ویسا ہی کھا لیتی ہو جیسا اُس نے ڈال دیا ہو۔ یہ تو کبھی بھی نہ کرو گی چاہے نوکری نہ رہے نہ رہے اسے سمجھاؤ گی پھر مارو پیلو گی۔ اگر کسی طرح نہ مانے گی تو نکال باہر کرو گی۔ بیسیو! دین کا اتنا بھی خیال نہیں جتنا تمک کا جو نماز کے مقابلے میں بالکل غیر ضروری چیز ہے۔ دین کا خود بھی خیال کرو اور جن پر تمہارا قیام ہو چل سکتا ہے ان کو بھی دین دار بناؤ تمہاری کوشش سے جو کوئی نویدار بنے گا تمہیں بھی اسی کے برابر ثواب ملے گا۔ اس کا طریقہ وہی ہے جو میں نے بیان کیا کہ جہاں دنیا کے دس کاموں کا وقت ہے ایک دین کے کام کا بھی وقت نکال لو۔ جو بی بی خود کتاب پڑھ سکیں وہ کتابوں کو دیکھ کر اپنی اصلاح کریں اور جو خود نہ پڑھ سکیں کسی اپنے رشتہ دار سے پڑھوا کر سنیں علماء سے وعظ اپنے مکانوں میں کہلوا یا کریں جو واقعات پیش آیا کریں ان کی پوچھ پاچھ کیا کریں علماء سے اُن سے

کی بی بی کی معرفت پہ خطا کے ذریعے سے جواب منگالیا کریں اس سے دین میں ایسی بصیرت پیدا ہو جائے گی کہ رفتہ رفتہ ہر ہر عمل کی نسبت حکم معلوم ہو جائے گا جب کسی چیسر کی بُرائی معلوم ہو جاتی ہے تو کبھی نہ کبھی تو دل میں اُس سے بچنے کا ارادہ پیدا ہوتا ہی ہے اس صورت میں اگر ذرا سی بھی ہمت سے کام لوگی تو دن دو دن رات چو گنی ترقی ہوگی۔ اور اسی میں شدہ شدہ تمام مفاسد کی جو یعنی کبیر بھی قلب سے نکل جائے گا۔ اسی کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے گو اور تمام مفاسد کا علاج بتا دیا کہ اس ایک صفت کو حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص مان لو۔ یہ صفت کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتی وہ صفت کبریا ہے یہ ایک جڑ ہے جس کے ہزاروں شعبے ہیں اجمالاً نہیں بلکہ تفصیلاً اس کے تمام شعبوں کو حق تعالیٰ کے ساتھ خاص کر دو اور میں یہ نہیں کہتا کہ سب کی سب متبخر مولوی بن جاؤ بلکہ جہاں تک موقع ملے غفلت نہ کرو جیسا روپیہ اور زیور کے جمع کرنے کا سب کو شوق ہے یہ یقینی بات ہے کہ تمام بیبیاں اپنا دل بھر کے زیور اور روپیہ نہیں پاسکتیں مگر غریب ہے تو امیر ہے تو ہر بی بی کو کوشش ضرور ہے کہ زیور اور روپیہ مل جاوے جتنی کوشش سے ایک مقدار روپیہ کی مل سکتی ہے اتنی کوشش سے بلکہ اُس بزم سے دین کی بہت بڑی مقدار مل سکتی ہے بہت نہ ہارو کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا۔ تم ایک حصہ کماؤ گی تو خدا تعالیٰ کی طرف سے دس حصے مرحمت ہوں گے۔ آگے اس مضمون کو حق تعالیٰ نے وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (وہ غالب و صاحبِ حکمت ہے) سے مؤکد کیا اُن لوگوں کے چوںکانے کے لئے جو اس مفسدے سے کسی طرح بچتے ہی نہیں۔ اور اپنے عجیب پر اُن کی نظر پڑتی ہی نہیں جب اُن کو سمجھانے اور اُن کی بھلائی سوچھانے سے اثر نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں میں عزیز یعنی غالب بھی ہوں اگر تم کہنا نہ مانو گے تو میرے ہاتھ سے کہیں جا نہیں سکتے جیسی چاہوں سزا دوں گا۔

اور اگر کسی بڑے عمل پر فوراً سزا ملے تو مطمئن مت ہو جاؤ میں حکیم بھی ہوں کسی مصلحت سے مہلت دیتا ہوں بعض لوگ رشوت لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں رشوت سزاوار ہے صابو! اس دھوکے میں نہ رہو خدا کے غضب کو مت بھولو۔ اول تو دنیا ہی میں سزا ملے گی اور اگر دنیا

میں کسی حکمت اور مصلحت سے مل ہی گئی تو آخرت تو دارالبحر ہے نہ دارالہاں کی سڑائیں اور زیادہ سخت ہیں وہاں کی سڑا سے تو دنیا ہی کی سڑا بھگت لینا اچھا ہے۔ وہاں کے اہوال و آفات کو سوچتے رہنا چاہیے۔ نصرتِ موجود ہے وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّ هَمَّتْ لِعِطٍ بَعْثِنِ چاہیے کہ خیال رکھے ہر شخص کا کہ کل کے لئے کیا سامان کیا ہے۔ اور اسی کے یاد دلانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں زُورُ رُؤُوسِ الْقُبُورِ وَالْكَثْرُؤُا ذِكْرُ مَا دِمَ اللِّذَاتِ یعنی قبروں پر جایا کرو اور لڈتوں کو مٹانے والی چپینر یعنی موت کو بہت یاد کیا کرو۔

(اس سے عورتیں یہ فتوے نہ نکال لیں کہ قبرستان میں جانا جائز ہے عورتوں کے پردے سے نکلنے میں بہت سی خرابیاں ہیں مراد تذکرہ آخرت و قیامت ہے۔ جس طرح بھی ہو کسی مغرب سے کتاب میں قیامت کے حالات پڑھیں یا سُنیں، اور یہ موت اور قیامت کی اجمالی حالت کافی نہیں کو کوئی موت کی تسبیح پڑھا کرے بلکہ موت کو یاد رکھنا یہ ہے کہ جب کوئی کام کرے سوچ کے بعد موت کے اُس پر کوئی جواب دہی تو میرے ذمہ عائد نہ ہوگی۔ ہمیشہ اس کا خیال رکھو اور اگر کچھ کام قابلِ جواب دہی ہو گئے ہیں تو اُن سے توبہ کرو اور برابر توبہ کرتی رہو۔ اب دُعا کرو کہ خدا تعالیٰ اس کی توفیق دیں

عہ معتبر کتاب قیامت کا سچا نوٹو یعنی احوالِ الآخرت مکتبہ تحفِ انویٰ بندر روڈ کراچی ۱
سے طلب فرما کر پڑھیں۔

قَالَ سَأُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلَّغُوا عَنِّي فَلَوْ آيَةٌ
(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)

دعواتِ عبدیت جلد دوم

چوتھا و غلط ملقب بہ

حیوۃ طیبہ

منجملہ ارشادات

حکیم الامتہ مجدد الملتہ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

..... ناشر

محمد عبد الملتان غفرلہ

مکتبہ تھانوی، دفتر الالباقام

متصل مسافر خانہ بند روڈ کراچی ۷
ایم اے جناح روڈ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دعواتِ عبدیت جلد دوم کا چوتھا و عطا ملقب بہ

حیوة طیبہ

ربنا	مَنِّجْ	حَمْدُ	یٰ مَنِّجْ	مَاذَا	یٰ مَنِّجْ	اَلَسْمِعُوْنَ	اَلَسْمِعُوْنَ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے	سامعین کی تحقیقی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	رجب ۱۳۲۹ھ یوم جمعہ	نماز جمعہ سے وقت عصر تک	بیٹھ کر	ثمرات اطاعت	مولوی عبدالحق صاحب	تقریباً ۱۰۰	

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ مُحَمَّدٌ وَنُسْتَعِیْنُهُ وَنُسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنُتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ
اَلْاَفْسَاوِیْمِیْنَ سَيِّاَتِ اَعْمَالِنَا مِنْ یَّهْدِیْهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ یُضِلُّهُ فَلَا هَادِیَ لَهُ وَنَشْهَدُ
اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِیْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٌ عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ
صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ
الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذِكْرِ اَوْ اُنْشِیْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَمْ يَحْصِیْهُ
حِیوة طَیِّبَةً وَ لَنْ جَزِیَّتْ هُمْ اَجْرُهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ه

ترجمہ آیت شریف کا یہ ہے کہ جو شخص عملِ نیک کرے مرد یا عورت اور وہ مومن ہو پس بیشک ہم اس کو
پاکیزہ زندگی عطا فرما دیں گے اور بیشک ہم اُن کا اجر بدلہ میں دیں گے بسبب اُن کے اچھے اعمال کے
اس آیت شریف میں حق تعالیٰ نے اپنے مطیع بندوں کے لئے اطاعت پر دو بڑی دولت کے عطا فرمانے
کا وعدہ فرمایا ہے اور نیز اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتلایا ہے اول ایک مضمون بطور مقدمہ
سمجھنا چاہیے اُس کے بعد آیت کریمہ کا مضمون بخوبی ذہن نشین ہو جائے گا دُنیا میں جس قدر غفلت

ہیں کہ جن کے افعال کی غایت ہوتی ہے اُن میں ہر ایک شخص ایک شے کا طالب ہے کوئی مال کا طالب کوئی جاہ کا کوئی صحت کا کسی کو درویشی مطلوب ہے کوئی علم کا دیوانہ ہے کسی کو تجارت میں لطف آ رہا ہے کوئی اولاد کی دُھن میں ہے کوئی مکانات کی تعمیر کا شوق رکھتا ہے کسی کو باغ لگانے کی حرص ہے غرض کوئی ایسا نہیں جو طلب سے خالی ہو۔ بعضے ان میں ہی خدا کے ہی طالب ہیں۔ ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اشیائے متعدّدہ مختلفہ کے طالب ہیں لیکن اگر غور کیا جائے اور نظر کو عمیق کر کے دیکھا جائے تو فی الواقع ہر شخص کا مطلوب صرف ایک شے ہے۔ صرف اختلاف اُس کے تعین طریق میں ہے کسی نے سمجھا کہ وہ شے تجارت سے حاصل ہوگی وہ تجارت میں مشغول ہو گیا۔ کسی نے خیال کیا کہ علم ہے اُس کی تحصیل ہوگی وہ علم کا طالب بن گیا۔ کسی نے اولاد میں اُس مطلوب کو گمان کیا وہ اولاد کا شیفتہ ہو گیا آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہر شخص کا مقصد جُدا ہے اور تم کہتے ہو کہ سب کا ایک ہی مقصد ہے۔ اختلاف طرق میں ہے اس لئے اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیے ایک شخص کے پاس دس سائل آئے ایک نے روٹی طلب کی دوسرے نے چاول پختہ مانگے تیسرے نے پیسہ مانگا چوتھے نے روپیہ پانچویں نے غلہ چھٹے نے آٹا۔ ساتویں نے کوریان، آٹھویں نے چنے بھنے ہوئے۔ نویں نے کچے چاول دسویں نے حلوائیں اس مثال میں بظاہر مطلوب ہر ایک کا جُدا ہے۔ لیکن درحقیقت مقصود واحد ہے طرق مختلف ہیں مقصود پیٹ بھرنا ہے کسی نے سمجھا پکانے کا کون قصہ کرے اس نے پکّی ہوئی روٹی مانگی کسی نے خیال کیا کہ کچی جنس ملے گی تو اپنی مرضی کے موافق پکا کر کھائیں گے کسی نے یوں ہوس کی کہ روپیہ پیسہ ملے گا تو جنس بھی اپنی خواہش کے موافق خرید کر پکائیں گے اس مثال سے آپ کو مختلفات کا جمع کرنا آسان ہو گیا ہوگا اسی طرح ان لوگوں کے مطلوب کو دیکھنا چاہیے۔ کہ اُن کا مقصود کیا ہے تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کو شے واحد مقصود ہے اور وہ لذت و راحت ہے طرق کا اختلاف ہے کسی نے سمجھا کہ روپے کے حاصل ہونے میں مزہ ہے وہ اس کا طالب ہو گیا کسی نے سمجھا کہ جاہ میں مزہ ہے کسی نے اولاد میں لطف بکھا کسی نے تجارت میں کسی کی سمجھ میں آیا کہ دنیا کے مزے تو سب فانی ہیں مزہ اصلی تو آخرت میں ہے۔

الغیر ذلک من الطرق مکرر حاصل سب کا ایک ہے کہ قلب کو چین ہو راحت ہو مسرت ہو انبساط ہو۔

دوسری مثال اور لیجئے کہ تاجر مختلف اشیاء کی تجارت کرتے ہیں کوئی بساطی ہے کوئی بزاز ہے کوئی بقال ہے اور کوئی لکھنوی تجارت کرتا ہے کوئی کلکتہ میں کوئی بمبئی میں تو یہ سب ایک شے کے طالب ہیں وہ شے کیا ہے نفع مگر اس کے طرق مختلف ہیں کسی نے سمجھا کہ بزاز کی دکان میں نفع ہے کسی نے خیال کیا کہ بساط خانہ میں بہت نفع ہے اُس نے اسی کو اختیار کر لیا کسی نے سمجھا کہ لکھنؤ میں چکن اچھی ہوتی ہے وہ وہاں جا پہنچا کسی نے یہ خیال کیا کہ کلکتہ میں تجارت سے بہت نفع ہوگا وہ وہاں پہنچ گیا چنانچہ اگر کسی تاجر سے کہا جائے کہ تم کو جو نفع کلکتہ میں ملے وہ ہی نفع تم کو ہم یہاں دیتے ہیں وہ ہرگز کلکتہ نہ جاوے گا کیونکہ مقصود اس کو حاصل ہو گیا غرض یہ امر بالکل اب واضح ہو گیا ہوگا کہ لوگ بظاہر اشیاء مختلفہ کے طالب ہیں مگر حقیقتاً مطلوب ایک ہی اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس مطلوب یعنی لذت و راحت کے حاصل کرنے میں راتیں مختلف ہیں کسی کی رائے تجارت کی ہے کسی کی زراعت کی ہے اور گاہے آپس میں ایک دوسرے کو خامی بتاتے ہیں چنانچہ جو تجارت کرتا ہے وہ حیانا زراعت کرنے والے کو خطا پر بتاتا ہے اور زراعت کرنے والا تاجر کو خامی بتاتا ہے اور ان ہر طالبین میں نیچے بھی ہیں وہ بھی اسی مطلوب یعنی لذت و راحت کے حاصل کرنے میں مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں لڑکیاں گڑیاں کھینتی ہیں لڑکے کوئی گیند کھیلتا ہے کوئی کنکواڑا لے کر کوئی مینے کا مکان بناتا ہے ان کے مکان کو ہم یہودہ شغل سمجھتے ہیں اور ہم جو قرض لے لیکر مکان بناتے ہیں اس کو بے ہودہ نہیں سمجھتے وجہ یہ ہے کہ اپنے مکان کو پائیدار سمجھتے ہیں اور معتد بہ راحت کا آلہ پس معلوم ہوا کہ اس مقصود کے باوجود کہ اس کے کہ وہ واحد ہے درجات مختلف ہیں ایک معتبر اور قابل شمار اور دوسرے غیر معتبر اور ناقابل شمار اور مجموعہ تقریباً دو امر معلوم ہوئے ایک یہ کہ مقصود کے طرق میں اختلاف ہے دوسرے یہ کہ اُس مقصود یعنی لذت و راحت کے افراد بعض قابل شمار ہیں اور بعض نہیں ہیں اب یہاں دو امر تنقیح طلب ہیں کہ مقصود یعنی لذت و راحت کا کون فرد حقیقتاً معتبر ہے اور دوسرے یہ کہ اس کا طریقہ تحصیل کا کیا ہے پس اس کا فیصلہ ایسا شخص کر سکتا ہے کہ جو حقائق اشیاء اور آثار اشیاء سے من کل الوجہ واقف ہو اور نیز وہ خود غرض نہ ہو کیونکہ کسی کا علم اگر ناقص ہو گیا کوئی خود غرض ہوگا تو وہ ہرگز ان دو امور کے متعلق فیصلہ نہیں کر سکتا تو اب دیکھنا چاہیے کہ جس میں یہ دو صفتیں علی وجہ الکمال موجود

ہوں وہ کون ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مخلوق میں یہ دونوں صفتیں ناقص ہیں جو عالم نظر آتا ہے اس سے زیادہ اور عالم موجود ہے **وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلَيْهِ** اور استغنا اور بے غرضی کی صفت میں بھی مخلوق ناقص ہے جس کو دیکھتے وہ خود غرض ہے اگر کہا جاوے کہ بعضے ہمدردانِ قوم ایسے ہیں کہ دوسروں کو بلا غرض نفع پہنچاتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں بعضے ثواب کے طالب ہیں اور بعضوں کی ایسی طبیعت ہوتی ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچا کر ان کے دل کو ٹھنڈک اور راحت پہنچتی ہے یہ ازاحتہ رقتِ جنیت بھی ایک غرض ہے اسی طرح ماں باپ اور جملہ اقرباء جو کچھ کرتے ہیں سب اپنی شفاعتِ قلب کے واسطے کرتے ہیں اگر کوئی کہے کہ بعضے لوگ ایسے طور سے دیتے ہیں کہ نہ دینے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لینے والا کون ہے اور نہ لینے والے کو دینے والے کا حال معلوم ہوتا ہے اس میں کون سی غرض ہے جواب یہ ہے کہ یا تو اسکو ثواب مطلوب ہوگا اور اگر ثواب مطلوب نہ ہو تو نفسِ عطا سے اس کے دل کو حظ ہوگا یہ بھی ایک غرض مطلوب ہے بالجملہ مخلوق میں ایسا کوئی نہیں جو علم اور استغنا کی صفت علیٰ وجہ الکمال سے موصوفہ ہو ایسی ذات پاک تو حق تعالیٰ کی ہی ہے علم کی توان کے وہ شان ہے کہ عالم الغیب والشہادۃ ہیں اور بے نیازی ایسی ہے جیسا مولانا فرماتے ہیں ۔

من نکردم حلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگاں جو دے کم

میں نے مخلوق اس لئے نہیں پیدا کی کہ میں کوئی نفع حاصل کروں بلکہ اس لئے پیدا کیا تاکہ اپنے بندوں پر عنایت کروں اور خدا تعالیٰ کو اپنا نفع مقصود نہ ہو نہیں سکتا اس لئے کہ نفع جو ہم کو مقصود ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے اندر ایک نقصان تھا اس نفع کے حاصل ہونے سے اس کی تکمیل ہوگئی اور حق تعالیٰ کی ذات خود کامل اکمل ہے اگر حق تعالیٰ کو بھی اپنا نفع مقصود ہو تو نعوذ باللہ ذاتِ باری میں نقصان اور شکمال بالیغیر لازم آتا ہے بہر حال نہ خدا تعالیٰ کی برابر کسی کا علم ہے اور نہ کوئی ایسا بے غرض ہے لہذا ان دونوں مسئلوں کا فیصلوں حق تعالیٰ سے ہی کرنا چاہیئے ۔

چنانچہ کلام اللہ کی ان آیات میں ان دونوں امور کا فیصلہ فرمادیا کہ بطور حاصل ارشاد ہے کہ اے بندو تم جو اپنے مقصود یعنی راحت کو مختلف چیزوں میں ڈھونڈتے ہو کوئی مال میں راحت نہ لذت کا طالب ہے کوئی بیوی بچوں میں اپنے مطلوب کو تلاش کرتا ہے کوئی جاہ میں کوئی مکانات

میں مشغول ہے ہم تم کو راحتِ حقیقی کے تحصیل کا طریقہ بتلاتے ہیں وہ یہ ہے مَنْ عَلَّمَ صَالِحًا الْجَنَّةَ مطلب یہ ہے کہ جو شخص نیک کام کرتا ہے اور اس میں شرط یہ ہے کہ وہ مومن ہو یعنی عقیدہ اس کا درست ہو ہم اس کو مزہ دار زندگی عطا فرمادیں گے اور ہم اُن کو جزا دیں گے بسبب اُن اعمال کے جو کیا کرتے تھے اس ترجمہ سے دونوں امر شفیق طلب جو اوپر مذکور ہوئے معلوم ہو گئے یعنی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مقصود معتبر کیا ہے اور اس کا طریق تحصیل کیا ہے مقصود درو چیزیں ہیں حیاتِ طیبہ اور سبب اور اس کا طریق بھی دو چیزوں کا حاصل کرنا ہے عملِ صالح اور عقائدِ صحیحہ۔

اور حیاتِ طیبہ اور اجر کا حاصل ایک ہی ہے یعنی لذت اور مسرت کیونکہ حیاتِ طیبہ جس کو فرمایا ہے اس کی تکمیل حیرتِ خدای سے ہوگی اس لئے کہ جس حیات کے بعد اجر نہ ہو وہ حیاتِ طیبہ نہیں اس لئے کہ جب اس کو معلوم ہے کہ یہ آرام و راحت دنیا ہی میں ہے اور بعد اس حیاتِ دُنیوی کے پھر تکالیف کا سامنا ہے تو وہ حیات بھی مزہ دار نہ ہوگی مثلاً کوئی شخص نہایت ہوادار اور شاندار پُر لطف کمرے میں ہے اور کھانے پینے کی اشیاء سب موجود ہیں اور آرام کے سب سامان مہیا ہیں لیکن اُس پر ایک مقدمہ فوجداری کا قائم ہے اور اس کو معلوم ہے کہ فلاں دن میرے لئے پھانسی کا حکم ہوگا تو اس کو یہ زندگی اور یہ ظاہری تمتع و بال جان ہوگا اور ہر شے اس کو خوار نظر آئے گی اسی طرح دنیا کا حال ہے کہ یہاں خواہ کتنا ہی آرام ہو جب یہ معلوم ہو کہ یہ فانی ہے تو کیا لطف ہے اور دنیا تو خواہ ملے یا ملے نہ ہو صورت میں پریشان کرنے والی ہے ۷

اذا ادبرت کانت علی ملأ حسرة وان اقبلت کانت کثیرا ھو ھما

اگر نہ ملے تو نہ ملنے کا افسوس اور حسرت رہتی ہے اور اگر ملے تو طرح طرح کے افکار اور ہوم ہوتے ہیں۔ ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے یہاں خیریت ہے وہ سخت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ خیریت ہوگی تمہارے یہاں ہمارے یہاں تو بفضلہ تعالیٰ کچے بچے چھوٹے بڑے موجود ہیں آج فلاں بیمار ہے کل اس کو بخار ہے کوئی مرتا ہے کوئی جیتا ہے جس کے یہاں کوئی نہ ہو اُس کے یہاں خیریت ہوتی ہے۔ غرض دنیا میں پریشانی ہی پریشانی ہے۔ اگر جس صحیحہ ہو تو واقعی سخت مصیبت کی جگہ ہے کسی طرح چین نہیں، ایک مقصود اگر حاصل ہوتا ہے دوسرے کی منکر ہوتی ہے مثلاً شادی بھی ہوگئی مال و دولت سب کچھ ہے

اولاد نہیں ہے تو اولاد کا ہر وقت فکر ہے کہ اولاد ہو ہی دھن کی یہی فکر ہے شب و روز اسی میں گزرتا ہے کبھی خیال ہوتا ہے کہ یہ سب جائیداد وقف کر دوں کبھی خیال ہوتا ہے کہ کسی کو میتنی بناؤں خدا خدا کر کے اولاد ہو گئی اب شب و روز اسی دھن میں ہیں کہ کسی طرح کہ یہ جلدی پرورش ہو جائے تو اس کے ختنے دھوم دھام سے ہوں اور اس کی شادی ہو۔ اللہ اللہ کر کے اولاد سیانی ہو گئی اور شادی بھی ہو گئی اب رات دن یہی فکر ہے کہ اولاد کے اولاد نہیں ہے اسی غم میں گھلتے ہیں غرض ساری عمر عزیز اسی میں صرف ہو جاتی ہے اور کوئی وقت اللہ کی طرف مشغول ہونے کا میسر نہیں ہوتا ہے

رحمۃً احدھنا لسانۃ لا ینتھی ارب الا الی ارب
 بہ خلاف اُس شخص کے کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو وہ پھر بہ نسبت اُس شخص کے راحت میں ہے اُس کا تو یہ حال ہے

لنگے زیر لنگے بالا نے غم زد و نے غم کالا
 ایک رئیس تھے اُن کے ایک بچہ تھا اتفاقاً وہ بیمار ہو گیا تمام جائیداد و سامان اُن کو تلخ معلوم ہوتا تھا۔ یہ حالت دنیا کی ہے سچ ہے و ان اقبلت کانت کثیرا ہنومہا حاصل یہ ہے کہ اگر تمام نعمتیں میسر بھی ہوں اور آخرت میں اُس کے لئے کچھ نہ ہو تو سب ہیچ ہے اس لئے حیاتِ طیبہ اسی وقت ہوگی جب کہ اجر بھی ہو اسی واسطے فَانْجِیْئُکَ الخ کے ساتھ وَکُنْجِیْئُکَ الخ فرمایا حاصل تو زوالِ کاحیات کاملہ ہوئی خلاصہ یہ ہوا کہ گویا حق تعالیٰ بطورِ مصلحت ارشاد فرما رہے ہیں کہ اے دنیا میں بھٹکنے والو تم میں سے ہر ایک جو مقصودِ معتد بہ کا طالب ہے ہم بتاتے ہیں کہ مقصودِ معتد بہ حیاتِ طیبہ کاملہ ہے اور اس کے طرق میں جو تم غلطیاں کر رہے ہو تو اس کے طریق کو بھی متعین کرتے ہیں وہ اطاعت اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے گویا تمام آئینہ کا حاصل یہ ہوا کہ اطاعت کا نتیجہ و ثمرہ لطفِ اتم ہے یہ ایک دعویٰ ہے اور یہ ایسا دعویٰ ہے کہ اگر ہم اس کا صدق مشاہدہ بھی نہ کرتے تو بھی ہم کو بلا تامل تصدیق کرنا چاہیے اس لئے کہ یہ ایسی ذات کا فیصلہ ہے کہ جس کا علم کامل ہے اور بے غرض اور مستغنی بالذات ہے چہ جائیکہ اس کا صدق ہم کو کائناتِ شمس فی نصف النهار نظر بھی آ رہا ہے مشاہدہ و زہد نہ ہو سکتا ہے کہ جیسا کہ ہم اس کو آئندہ چل کر واضح بیان کریں گے اس وقت فَانْجِیْئُکَ

حیوۃ طیبہ کی تفسیر کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے کہ اس میں اختلاف ہوا ہے کہ حیاتِ طیبہ سے کیا مراد ہے دنیا کی حیات یا برزخ کی کیونکہ عالمِ تین ہیں عالمِ آخرت عالمِ دنیا عالمِ برزخ اور آخرت کو گو مشاہدہ نہیں کیا مگر اہل ملت میں بلکہ حکماء و فلاسفہ قدما میں بھی اس کے منکرین کم ہیں حتیٰ کہ سوائے اہل اسلام کے اور لوگ بھی اس کے قابل ہیں اس لئے اس کا کوئی نمونہ دنیا میں بنلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بخلاف برزخ کے کہ اس کے منکرین بہت ہیں حتیٰ کہ اہل اسلام میں معتزلہ نے اُس کا انکار کیا ہے اور حدیثوں میں جو آیا ہے کہ جب آدمی مرتا ہے قبر میں دو فرشتے منکر نکیر آتے ہیں ان کا معاملہ مختلف ہوتا ہے اگر بندہ مومن ہوتا ہے اُس کے پاس نہایت اچھی صورت میں آتے ہیں و اُس سے سوال کرتے ہیں وہ پسندیدہ جواب دیتا ہے پھر اُس کے لئے قبر کشادہ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ جہاں تک اُس کی نگاہ جاتی ہے۔ اس کو ایک وسعت نظر آتی ہے اور اس کو کہا جاتا ہے نَمُکِنُوْمَتِ الْمَعْدُوْسِ اور اگر وہ کافر ہوتا ہے اُس کے پاس نہایت ہولناک صورت میں آتے ہیں اور جو سوال اس سے کیا جاتا ہے وہ جواب میں لا اَدْرِیٰ یعنی میں نہیں جانتا کہتا ہے اس کے لئے قبر تنگ ہو جاتی ہے اور اس کو اس قدر دباتی ہے کہ اسکی پسلیاں ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر ہو جاتی ہیں گرزوں سے اس کو مارتے ہیں اور سانپ بچھو اس کو ڈسنے میں غرض انواعِ انواع کے عذاب میں مبتلا رہتا ہے معتزلہ اور ہمارے نو تعلیم یافتہ ان احادیث کا بالکل انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو قبر کو کھود کر دیکھتے ہیں نہ اس میں فرشتہ ہے نہ گرز ہے نہ وسعت ہے نہ سانپ ہیں نہ بچھو ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ایک آدمی کو بھیڑ یا کھالے یا دوشیر کھالیوں تو وہاں کس طرح یہ سوال و جواب ہوں گے اور کیسے وہاں وسعت ہوگی اور وہاں سانپ بچھو کہاں ہیں ہم تو سرِ تاج دیکھتے ہیں کہ بھیڑ بچے اور شیر کے پیٹ میں نہ سانپ ہیں نہ بچھو ہیں نہ گرز ہے بات یہ ہے ۷

جنگ ہفتاد و دولت ہمہ را عذر نہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زند
اسلام کا دعویٰ کرنے والوں میں سے بہتر فرقوں میں سے ہر ایک نے اپنی لڑائی کے لئے عذر تلاش
کھا ہے جو حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا وہ قصہ کہانیوں کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔

وجہ یہ کہ خود علم نہیں اور علماء کی اتباع سے عار آتی ہے حالانکہ سلامتی کی بات یہ ہے کہ اپنے سے زیادہ جاننے والے کا دامن پکڑنا چاہیے کاش اگر ہم پوچھ لیتے تو پتہ لگ جاتا ان تمام شبہات کا منشاء یہ ہے کہ قبر نام اس گڑھے کا رکھ لیا ہے۔ حالانکہ قبر سے مراد احادیث میں یہ گڑھا نہیں۔ بلکہ مراد قبر سے عالم برزخ ہے اور عالم برزخ اُس گڑھے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ برزخ اس حالت کا نام ہے جو آخرتہ اور دنیا کے درمیان کی حالت ہے اگر قبر میں دفن کر دیا وہی اس کا برزخ ہے اس سے وہاں ہی سوال و جواب و ثواب و عذاب ہوگا اور اگر بھڑپئے و شیر نے کھا لیا اُس کے لئے وہی برزخ ہے اور اگر جلا دیا تو جہاں جہاں اس کے جنراں اس سے وہاں ہی یہ سب واقعات پیش آئیں گے لیکن چونکہ شریعت میں دفن کرنے کا حکم ہے اس لئے عالم برزخ کو قبر سے تعبیر فرمایا ہے اور دفن کرنے میں بہت سی حکمتیں ہیں اول تو یہ کہ رُوح کو مرنے کے بعد اس جسدِ خاکی سے ایک تعلق رہتا ہے جیسا کہ مثلاً آپ یہاں موجود ہیں اور آپ کا گھر مثلاً جلال آباد ہے تو آپ کو گھر سے تعلق ہے تو اگر مردہ کو جلا دیا جاوے گا اور قبر میں دفن نہ کیا جائے گا تو رُوح کو حسین نہ ہوگی اور اس کو اس جسدِ عنصری کے جلنے کا ٹرن ہوگا جیسے کسی کے گھر میں آگ لگا دی جاوے اس کو رنج ہوتا ہے یا جیسے مثلاً کسی شخص کا کچھ اسباب ایک جگہ رکھا ہے اور کچھ دوسری جگہ اس کی طبیعت پریشان رہتی ہے اسی طرح اگر اس جسم کے اجزاء منتشر ہوتے ہیں تو رُوح کو ایک پریشانی ہوتی ہے ایک حکمت یہ ہے کہ دفن کر لے میں اتھائے نفع باطنی ہے یعنی اگر کسی صاحبِ کمال کی وفات ہو جائے اور ان کو دفن کر دیا جائے تو بعد وفات باطنی نفع ان سے زیادہ ہوگا۔ بہ نسبت اس کے کہ جلا یا جاوے یا اجزاء اس کے کسی اور وجہ سے منتشر ہو جاویں اور ایک حکمت دفن کرنے میں یہ بھی ہے کہ عنصرِ غالب خاک ہے تو مقتضائے عقل کا بھی یہی ہے کہ اس کے ہی جنس میں ملا دیا جائے اسی بنا پر ایک بزرگ کہتے تھے کہ ہندو جو جلاتے ہیں اُس کی غالباً ایک وجہ ہے وہ یہ کہ آدمیوں سے پہلے زمین پر جن تھے اُن کی شریعت میں عجب نہیں کہ جلانے کا حکم ہو اس لئے کہ ان میں عنصرِ غالب نار ہے تو جلانے سے نار نار میں مل جائے گی ہندوؤں نے اس مسئلے میں ان کی تقلید کی اور یہ نہ سمجھے کہ ان میں تو جزوِ غالب نار تھا اس لئے جلانے کا حکم ہوا اور ہم میں جزوِ غالب خاک ہے

اس لئے ہم کو دفن کا حکم ہوا حاصل یہ کہ قبر کے متعلق جس قدر شبہات ہیں وہ سب اس پر مبنی ہیں کہ قبر کی حقیقت نہیں سمجھتے اسی استبعاد کی وجہ سے چونکہ اس کا بکثرت انکار کیا جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسی حکمت سے اس کا ایک نمونہ دنیا میں پیدا فرمایا ہے وہ کیا ہے خواب یعنی سونا سوتے ہوئے آدمی دیکھتا ہے کہ سانپ نے کانٹ لیا ہے دریا میں ڈوب گیا ہے کسی نے لٹھ مار دیا ہے اور اُس کو الم محسوس ہو رہا ہے حالانکہ وہ نرم نرم بستر پر لیٹا ہوا ہے اگر گرمی ہے تو پنکھے ہوئے ہیں خس کی ٹیٹیاں لگ رہی ہیں یا دیکھتا ہے کہ وہ مسند پر سریر آرائے سلطنت ہو رہا ہے اور باندیاں اور غلام صاف بہ صاف دست بستہ کھڑے ہیں اور طرح طرح کے آرام و راحت کے سامان ہیں حالانکہ وہ زمین پر لیٹا ہوا ہے نہ مکہ ہے نہ بستر ہے نہ کوئی پرسان حال ہے بیمار ہیں سخت درد میں مبتلا ہیں یہ سونے والے اگر ان حکایات کو بیان کرتے ہیں تو ان سے کوئی دلیل عقلی کا ان واقعات پر مطالبہ نہیں کرتا۔ بلکہ اگر کوئی دلیل عقلی پوچھے تو اُس کو احمق بنایا جاتا ہے اور اس کو وہ سونے والا کہے گا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی سوتے نہیں خدا کرے تم سوؤ تو تم کو یہ سب باتیں واضح ہو جائیں گی پس ہمارا بھی یہی جواب ہے کہ جب مر گئے معلوم ہو جائے گا بقول شخصہ

پُر سید کیے کہ عاشقی چسیت گفتم کہ چو ماشوی بدانی

کسی نے پوچھا کہ عاشقی کیا چیز ہے میں نے کہا کہ جب تو میرے جیسا ہو جائیگا تجھے معلوم ہو جائیگا یعنی عشق سمجھانے کا چیز نہیں، عرض کہ خواب برزخ کا پورا نمونہ ہے کہ جیسے ہم سونے والے کو دیکھتے ہیں کہ وہ آرام سے لیٹا ہوا ہے حالانکہ وہ سخت تکلیف کا مشاہدہ کر رہا ہے یا یہ کہ وہ تکلیف میں ہے اور خواب میں مزے لوٹ رہا ہے۔ اسی طرح مڑے کا حال ہے کہ اگر قبر کو کھود کر دیکھا جاوے تو جس طرح دفن کر آئے تھے اسی طرح ہے لیکن وہاں کے واقعات اس پر سب گذرے ہیں لیکن اس تقریر سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ بس معلوم ہو گیا کہ برزخ کے واقعات خواب جیسے ہیں جس طرح خواب کی کوئی اصل نہیں اسی طرح فی الواقع یہ کوئی شے نہیں مڑے کو یہ واقعات محض متخیل ہونے ہیں اس لئے کہ ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ خواب نمونہ ہے یعنی خواب مشابہ برزخ ہے مائل نہیں کیا عالم برزخ کے واقعات حقیقت رکھتے ہیں تحقیق اس کی یہ ہے کہ یہ نوظاہر ہے کہ روح اس جسم سے تو مفارق ہو جاتی ہے۔

اس لئے اس جسم کو تو عذاب و ثواب تکلیف آرام کچھ نہیں ہوتا ہاں اس جسم سے روح کو تعلق قدیم کی وجہ سے ایک تعلق خاص ہوتا ہے جیسا کہ آدمی کو اپنے گھر سے یا کپڑے سے وہ گھر اور کپڑا اس سے مفارق ہے لیکن اُس سے تعلق ہے اور اسی تعلق کی بنا پر اگر مُردے کے جسم کو کوئی مارے تو روح کو ایک قسم کی کوفت ہوتی ہے پس اس جسمِ عنصری کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی تعلق نہیں رہتا مگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عذاب و ثواب کا مورد جسم ہی ہوتا ہے پس معلوم ہوا کہ برزخی ثواب عقاب اور تمام برزخی واقعات اور سوال و جواب کے لئے روح کو ایک اور جسم عطا ہوتا ہے کہ اس کو جسمِ مثالی کہتے ہیں اور یہ تکلیف و راحت سب اس کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جسمِ مثالی کی حقیقت یہ ہے کہ یہ سوائے اس عالمِ ظاہر کے ایک اور عالم ہے کہ صوفیہ کو اُس کا انکشاف ہوتا ہے اور نیز اشارات کتاب و سنت سے بھی اس کا وجود معلوم ہوتا ہے اس عالم میں تمام اشیاء اور تمام اعمال و افعال کی صورتیں ہیں خواب میں جو کچھ آدمی دیکھتا ہے وہ بھی اسی عالم کی صورتیں ہیں مثلاً خواب میں دیکھتا ہے کہ میں کلکتے گیا ہوں اور وہاں کوٹھیاں نیگلے اور بازاروں کی سیر کر رہا ہوں تو یہ سب صورتیں چونکہ عالمِ مثال میں موجود ہیں اس لئے وہ خواب میں نظر آتی ہیں میں نے ایک رسالہ سستی الفتوح فی الاحکام الروح لکھا ہے اس میں روح کے متعلق مفصل بحث لکھی ہے اُس کے دیکھنے سے انشاء اللہ تعالیٰ سب شبہات جاتے رہیں گے۔

بہر حال اس تقریر سے مقصود یہ ہے کہ ایک عالم اور ہے جس کا نام برزخ ہے کل بین عالم ہوئے۔ عالم دنیا۔ عالم برزخ۔ عالم آخرت۔ اس میں اختلاف ہے کہ حیۃ طیبہ سے مراد کونسی حیات ہے۔ حیات برزخیہ یا حیاتِ دنیویہ میں کہتا ہوں کہ دونوں مراد ہوں اور لَنْجَرِیْنَهُمْ کو آخرت کے ساتھ خاص کیا جاوے اس تقدیر پر حاصل آیتہ کا یہ ہوگا کہ جو شخص عملِ صالح کرے اور عقائد بھی اس کے صحیح ہوں اُس کو ہم دنیا میں اور مرنے کے بعد برزخ میں مرفوعہ زندگی عطا فرمادیں گے اور آخرت میں بعد قیامت کے اُن کے نیک اعمال کی وجہ سے اجر کی جزا دیں گے اور ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حیاتِ طیبہ سے مراد حیاتِ دنیویہ ہو اور برزخ اور آخرت لَنْجَرِیْنَهُمْ میں داخل ہو کیونکہ برزخ میں جو کچھ ہوگا وہ بھی جزا ہوگا

خلاصہ یہ کہ دو چیزوں کا وعدہ ہے اول حیاتِ طیبہ دوسرے اجر کہ جو مکمل ہے حیاتِ طیبہ کا ان میں سے ایک نئے یعنی حیاتِ طیبہ کو تو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں بلکہ مشاہدہ کر سکتے ہیں دلیل تو یہ ہے کہ قاعد عقلی ہے کہ تجربے سے جب ایک شخص کا صدق ثابت ہو جائے تو اس کو ہر امر میں صادق مانا جائے گا ہر امر پر دلیل کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے گا جب کہ حق تعالیٰ کے اخبار کا صد ہا ہزار جگہ صدق ہم نے مشاہدہ کر لیا تو یہ خبر بھی بلا تاثر صادق ہے مشاہدہ یہ کہ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں مطیع اور غیر مطیع دیکھ لیجئے کہ ان میں سے راحت اور آرام میں کون ہے ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ غیر مطیعین طاہرین دنیا ہر وقت پریشانی میں ہیں کسی وقت ان کو چین نہیں بخلاف مطیعین کے کہ وہ جس حالت میں ہیں راحت میں ہیں شاید ہر شخص کہے کہ میں مطیع ہوں اس لئے کہ نماز پڑھتا ہوں روزہ رکھتا ہوں اسکی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص کہے کہ فلاں بہت خوبصورت ہے کیونکہ اس کے خسار ایسے ہیں سراپا ہے آنکھیں ایسی ہیں ایک شخص دُور سے دیکھنے آوے دیکھے تو میاں نکلتے ہیں تو ان کا سارا حسن و جمال اس ناک نہ ہونے سے کالعدم ہے اور عقلاً اس کو ہرگز حسین نہ سمجھیں گے۔ ایسے ہی ہم لوگوں کا دین ہے کہ دوچار باتیں اسلام کی لے کر سمجھتے ہیں کہ ہم دیندار ہیں تو ایسے دینداروں کی نسبت یہ وعدہ نہیں ہے کہ اگر کوئی پورا دیندار ہو ایمان اور عمل اس کا کامل ہو تو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اس کو مزہ دار زندگی عطا ہوتی ہے بلکہ کامل الاطاعت کے پاس تک پریشانی نہیں آتی۔ اطاعت کاملہ میں ایک جز اور بھی قابلِ تنبیہ ہے وہ یہ کہ اطاعت کاملہ کے معنی یہ سمجھئے کہ بس ظاہر درست کر لیں یعنی صوم و صلوٰۃ حج و زکوٰۃ و معاملات کی پابندی کر لیں بس کامل فرماں بردار ہو گئے خواہ اخلاق کسی درجے میں ہوں تو یاد رکھنا چاہئے کہ ایسا شخص بھی کامل دیندار نہیں ہے کامل دیندار وہ ہے جس کا ظاہر اور باطن دونوں آراستہ ہوں واللہ ہم میں جو دیندار کہلاتے ہیں ان میں سے بہت سے لوگوں کی حالت یہ ہے۔ اَلْسِنَتُھُمْ اَحْلٰی مِنْ السَّکْسِ و قُلُوبُھُمْ قُلُوبُ الذَّائِبِ نازکے بھی جماعت سے پابند ہیں روزے کا بھی اہتمام ہے داڑھی بھی بڑھائی ہے۔ نیچا کرتے ہیں غرض تمام وضع شرعی سے آراستہ ہیں لیکن اخلاق کے اعتبار سے صفر ہے قلب میں کبر و عجب تحق و غضب

وغیرہ کی بلائیں موجود ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ متکبر ہیں لیکن اپنے کو متواضع سمجھتے ہیں حالانکہ وہ تواضع کی حقیقت سے واقف نہیں جیسے ایک شخص کر سیا پڑھتے تھے اس میں تواضع کا بیان آیا استاد نے پوچھا کہ تواضع جانتے ہو کیا شے ہے کہنے لگے کہ تواضع یہی ہے کہ کوئی گھرا اپنے گھر آئے پہلے کو حقہ پان ٹے دیا اس کو کھانا کھلا دیا۔ اس کی آؤ بھگت کر لی۔ آج کل بڑے بڑے سمجھدار تواضع کی حقیقت اسی قدر سمجھ ہوئے ہیں اور جو زیادہ سمجھدار ہیں وہ جانتے ہیں کہ تواضع یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے نرمی سے پیش آوے۔

صاحبِ تواضع یہ نہیں ہے نہ ایسے شخص کو حقیقتہً متواضع کہتے ہیں ایسے شخص کو متواضع کہنے کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی نقال کسی تحصیلدار کی نقل کرے اُس کو کوئی بے وقوف تحصیلدار سمجھنے لگے تواضع حقیقت میں ایک صفت کا نام ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے دل میں اپنے نفس کو سب سے کم سمجھے یہ صفت دنیا میں بہت مفقود ہے ایسے تو بہت نکلیں گے جو تقریراً تحسیراً اپنی مذمت کرتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں میں بڑا نالائق ہوں بڑا ناکارہ ہوں۔ بعض اپنے کو حقیر فقیر عاصی پُر معصی مکتے ہیں لیکن جب وہ یہ کلمات فرمادیں اس وقت اگر کوئی کہدے کہ ہاں صاحب آپ بڑے نالائق ہیں۔ پھر دیکھئے ان کی کیا حالت ہوتی ہے سُن کر تملکلا ہی تواجبات گے وضعداری سے چاہے چپ ہو ہیں مگر دل میں تو یہ آئے گا کہ اس کو کھا جائیں۔ ہاں اگر دل میں ذرا بھی بُرا نہ مائیں اور کچھ بغیر نہ ہو تو واقعی متواضع ہیں یہ بڑا عمدہ امتحان ہے مگر ایسے کہاں ہیں آج کل تو ظاہری نیاز مندی خضوع شروع سب کچھ ہے لیکن دل میں کچھ نہیں بس یہ حالت ہے۔

از بروں چوں گور کا فہر چلزل وز دروں فہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر با۔ بزید وز در دنت ننگ مے دارد یزید

یعنی باہر سے بن کو دیکھو تو ایسے معلوم ہوں جیسے کسی بد بخت کا فری شاندا قبر ہے اور اندر سے دل کو دیکھو

تو بس خدا کا غضب نازل ہو رہا ہے اپنی ظاہری ریاکاری سے تو ایسا بتا ہے کہ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ

کی بھی غلطیاں نکالتا ہو اگر تیرے دل کی اندرونی حالت دیکھی جائے تو یزید جیسے بزم کو بھی شرم آنے لگے اور نفرت کرے

خلاصہ یہ کہ ایسے لوگ کامل دنیدار نہیں ہیں اس لئے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے ان سے دنیدار

ہونے کا مطالبہ فرمایا ہے ویسے نہیں بنے اور میں تم کو بتاتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے کیسا چاہا ہے اور میں دو لفظوں میں خلاصہ بتاتا ہوں اور میں کیا خود اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں اگر تفصیلاً بیان کیا جاوے کہ خدا تعالیٰ نے کیسا چاہا ہے تو دفتر کے دفتر ختم ہو جاویں پھر بھی بیان نامکمل ہی رہے۔ اس لئے گرو کی بات عرض کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ خَلَاصۃً آیت کا یہ ہے کہ امور اختیار میں ایسے بن جاؤ اور ایسے ہو کر آؤ کہ جیسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں گویا حق تعالیٰ نے ہمارے پاس ایک نمونہ بھیج دیا ہے اور گویا فرمادیا کہ ہم تفصیلاً کہاں تک بیان کریں کہ یہ صفت پیدا کرو وہ وہ صفت چھوڑ دو ہم ایک نمونہ بھیجے دیتے ہیں ایسے بن جاؤ اپنے اخلاق و عادات کھانا پینا سونا بیٹھنا اٹھنا چلنا پھرنا وضع طرز انداز چال ڈھال ایسا ہو جیسا ہمارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ بس اب غور کر لیجئے کہ اگر ایک صفت کی بھی کمی ہوئی تو ہم نمونہ کے موافق نہ ہوئے اسکی ایسی مثال ہے کہ درزی سے ہم کو ایک اچکن سلوانا منظور ہے ہم نے نمونہ کیواسطے ایک اچکن بھیج دیا کہ ایسا ہی لاؤ اب تبدلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آستین اسقدر رہوں سلائی اس طرح کی ہو۔ اس قدر نیچا ہو وہ سی کر لایا تو دیکھا کہ اس کے مطابق ہے لیکن ایک آستین بڑھی ہوئی ہے تو اس درزی سے کہا جاوے گا کہ ظالم تیرے پاس ہم نے نمونہ بھیج دیا تھا پھر بھی تو نے اس کے موافق نہ کیا اور اس اچکن کو ہرگز نمونے کے موافق نہ کہا جائے گا وہ اچکن اس درزی کے منہ پر ماریں گے اور اسکو سزا دیں گے تو صاحب جب ہم حاکم حقیقی کے سامنے پیش کئے جائیں گے اور ہماری نماز ایسی نہ ہوگی۔ جیسی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی وضع لباس طرز انداز ایسا نہ ہوگا جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کا تھا تو کچھ عجب نہیں کہ کمال دیئے جائیں۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا وَاَحْشِرْنَا فِيْ رُضْوٰتِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ایک حکایت بطور تمثیل کے یاد آئی کہ بادشاہ عالمگیر جب صاحب تخت و تاج ہوئے تو تمام اہل فن و اہل حرفہ و صنعت کو موافق دستور شاہی انعام دیا گیا بہرہ و پئے آئے لیکن عالمگیر ایک مولوی آدمی تھے اس لئے اُن کو دنیا نا جائز سمجھا لیکن صراحتاً اُن کو مانا اور صاف جواب دینا مناسب سمجھا یہ چاہا کہ کسی جلد لطیف سے ان کو مانا دیا جائے کہا کہ جب ایسی شکل آؤ کہ ہم نہ پہچانیں تو انعام دیں گے وہ مختلف شکلوں میں آئے مگر عالمگیر نے پہچان لیا جب دکن کی ہم پیش آئی اور عالمگیر نے دکن کا سفر کیا تو سفر میں عالمگیر کا طریق یہ تھا کہ راستے میں جس صاحب کمال کو سنتے تھے اس سے جا کر ملتے

تھے دکن کے سفر میں بھی حسبِ عادت اہل کمال سے ملتے جاتے تھے ایک مقام پر سنا کہ یہاں ایک درویش بڑے باکمال ہیں اول وزیر کو ملنے کے لئے بھیجا وزیر نے ہر طرح ان کو جانچا وہ ہر بات میں پورے اترے آکر عالمگیر سے بہت تعریف کی اور کہا کہ اُن کو تکلیف دینا بے ادبی ہو آپ خود تشریف لے جا کر ان سے ملنے عالمگیر خود گئے اور مل کر بہت خوش ہوئے عالمگیر کو بعض مسائل تصوف میں کچھ شبہات تھے وہ پیش کئے سب شبہات کے شافی جواب پائے بالکل اطمینان ہو گیا اور نہایت متاثر ہوئے اور ایک ٹوڑا اشرافیوں کا پیش کیا۔ درویش نے ایک لات ماری اور کہا کہ مجھ کو بھی اپنی طرح دینا دار سمجھتا ہے عالمگیر اور زیادہ متاثر ہوئے اور اُس ٹوڑے کو اٹھالیا اور وہاں سے چلے راہ میں وزیر سے دیر تک اُس درویش کا ذکر مذکور رہا جب لشکر میں پہنچے تو سامنے دیکھا وہ بزرگ تشریف لائے ہیں اور بادشاہ کو جھک کر سلام کیا اور انعام مانگا ، عالمگیر حیرت میں ہو گئے اور غور کر کے پہچانا اور اس کو کچھ انعام دیا اور یہ پوچھا کہ میں نے اب تسلیم کر لیا کہ تو بڑا ہوشیار اور اپنے فن کا کامل ہے مگر یہ تباہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اس وقت میں نے تجھ کو اس سے کہیں زیادہ دیا تھا اُس کو تو نے رد کر دیا اور یہ دفعہ اُس سے بہت کم ہے یہ خوشی سے لے لیا۔ اُس نے کہا کہ جو نقل میں نے کی تھی وہ لینا اُس کے خلاف تھا اس لئے نہیں لیا تو صاحبو ہم لوگ تو اس نقال سے بھی گئے گئے گئے ہوتے ہم سے تو نقل بھی دین کی نہیں ہوتی حاصل یہ کہ دیندار کامل تو وہ ہے کہ ظاہر بھی دیندار ہو اور باطن بھی کیونکہ اعمال کی دو قسمیں ہیں ظاہری اور باطنی ۔ ظاہری تو روزہ نماز حج زکوٰۃ وغیرہ اور باطنی ۔ السنّ رضا شوق صبر قناعت وغیرہ ہیں اور ان کے مقابلے میں بد اخلاقیات غضبِ حق تعالیٰ بے صبری حرص ہیں ۔ یہی وہ چیزیں ہیں کہ جو مشائخ کے یہاں ملتی ہیں اساتذہ کے یہاں تو ظاہر درست ہوتا ہے اور مشائخ کے یہاں یہ اخلاق درست ہوتے ہیں اور اسی کا نام بزرگی ہے آج کل تو درویشی اور بزرگی کشف و کرامت کہلاتے ہیں مجھ کو ایک شیخ صاحب کے ارشاد پر تعجب ہوا کہ انہوں نے ایک شخص سے کہا کہ میاں تم فکر و شغل کرتے ہو کچھ نظر بھی آتا ہے ۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آتا تو ہنس کر فرمایا خیر بھائی ثواب جمع کئے جاؤ آہ افسوس ہے کہ ان شیخ نے ثواب کی کچھ بھی قدر نہ کی میں تو اسی دن سے انکی مشیخت سے بے اعتقاد ہو گیا جو شخص خدا تعالیٰ کی رضا کو چھوڑ کر کشف کو ڈھونڈھے اسکی مثال ایسی ہے

کہ جیسے وزارت کو چھوڑ کر گھاس کھودنے لگے اس لئے کشف کا حاصل بعض غیر معمولی غیر مقصود اشیاء کا معلوم ہو جانا ہے سو یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ ظاہر اور باطن موافق شریعت کے ہو پس ایسے شخص کے لئے میں دعویٰ کر کے کہتا ہوں کہ اس کو حیات طیبہ نصیب ہوگی اور کسی قسم کی پریشانی اس کو نہ ہوگی اگر کوئی کہے کہ ہم تو بچشم خود دیکھتے ہیں اور سنتے آئے ہیں کہ اکثر اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین تکالیف میں مبتلا ہوتے ہیں پھر مزید از زندگی کہاں ہوتی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بیشک مسلم ہے کہ ان حضرات کو بلا اور مصائب کا سامنا رہتا ہے بلکہ اوروں سے زیادہ لیکن ان کو ان مصائب میں بھی مزہ آتا ہے اور جس کا نام پریشانی ہے وہ نہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کسی پر عاشق ہو جائے اور محبوب اُس سے مدتوں گنہ بڑا ہو اور وہ اس کی یاد میں گھلتا ہو، ایک روز دفعۃً محبوب آ پہنچا اور آکر لپٹ گیا اور اس کو خوب دبایا اور اس متدرد بایاکہ پسلیاں ٹوٹ لگیں لیکن اگر وہ سچا عاشق ہے تو واللہ اس کو اس قدر مسرت ہوگی کہ دنیا و مافیہا سے بڑھ کر اس کو سمجھے گا اور کہے گا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس کے واسطے تمام عمر کھودی اور مال و دولت ابرو اس پر نثار کر دیئے اگر محبوب کہے بھی کہ اگر تکلیف ہو تو چھوڑ دوں تو وہ کہے گا کہ خدا نہ کرے وہ دن کہ تم مجھ کو چھوڑ دو بلکہ یوں کہے گا کہ

اسیرتِ نخواہد رہائی ز بند شکارت بخوید خلاص از کمند

رتیرا قیدی کہی قید سے رہائی نہ چاہے گا اور تیرا شکار کہی تیرے پھندے سے باہر نکلا پسند نہ کرے گا

اور اگر وہ کہے کہ میں اُس رقیب کو جو پاس کھڑا ہے دباؤں اور نرم کو راحت دوں گا تو کہے گا کہ

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاکت بغت سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن تو یہ چاہتا ہے کہ تیری تلوار ٹوٹ جائے مگر ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ الہی دشمن کا کہنا پورا ہو

دوستانوں کا سر سلامت چاہیے تاکہ تو اپنے خنجر کی مشق کرتا رہے۔

اور کہے گا کہ

سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیر پائے ہے کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جاتے ہے

۵

مرنے جو موت کے عاشق بیاں کہی کرتے مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

دیکھتے لوگوں کے نزدیک سب سے زیادہ مصیبت موت ہے اور عشاق کے نزدیک وہی موت عجیب دولت ہے کہتے ہیں ۵

خترم آں روز گزین منزل و بیاں بروم راحت جاں طلبم وز پی جانان بروم
نذر کردم کہ گر آید بسرایں غم رونے تادہ میکده شاداں و غم نخواں بروم
یہ دنیا محبوب کے بغیر دراصل ایک دیرانِ منزل ہے وہ دن کس قدر خوشی کا ہوگا جس دن اس اُڑے
گھر کو چھوڑوں گا اور میری جان کو آرام ملے گا اور میں اپنے محبوب کے ساتھ ساتھ پھروں گا میں نے میرت
مانی ہے کہ جس دن دنیا کے فکر و غم سے نجات مل گئی یعنی موت آگئی تو حق تعالیٰ کے دربار تک
خوشی خوشی اور غریب پڑھنا ہوا جاؤں گا۔

اور یہ تمنائیں تو ان حضرات کی موت آنے سے پہلے ہوتی ہیں لیکن عین موت کے وقت بھی یہی ہوتا ہے۔ ایک بزرگ وفات کے وقت کہتے ہیں ۵

وقت آں آمد کہ من عسریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم
آج وہ وقت آگیا ہے کہ میں دنیا کے ہر قسم کے بوجھ سے خالی اور ہلکا ہو گیا ہوں اور جسم کو
چھوڑ کر صرف روح ہی روح رہ گیا ہوں،

ابن فارضؒ کا جب انتقال کا وقت آیا تو آنٹھوں جھٹیں اُن کے لئے کشوف ہوئیں دیکھ کر

منہ پھیر لیا اور فرمایا ۵

اِنْ كَانَ مُؤَيَّرٌ لِّبَنِي الْحَبِّ عِنْدَ كُهُ
مَا قَدْ رَأَيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ أَيَّامِي

یعنی اگر میرا مرتبہ عشق میں آپ کے نزدیک یہی ہے جو میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنا وقت ہی
ضائع کیا یعنی میرا مقصود تو آپ کی ذاتِ پاک ہے اگر آپ نہ ہوئے تو جنت کو لے کر کیا کروں گا
اس کے بعد ان پر تجلی حق ہوئی اور اسی میں رحلت فرمائی سبحان اللہ اب فرمائیے کہ جب موت سے
بھی یہ حضرات پریشان و ہراساں نہیں ہوتے تو فقر و فاقہ میں افلاس و تنگی میں تو کیا تکلیف و پریشانی
ہے حضرت ہنولؒ نے کسی بزرگ نے پوچھا کہ کس حال میں ہو فرمایا کہ ایسے شخص کا کیا حال پوچھتے
ہو کہ جو کچھ عالم میں ہو رہا ہے سب اس کی مرضی کے موافق ہو رہا ہے وہ کچھ مزے میں ہوگا۔ اُن
بزرگ نے کہا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی مخلوق کے لئے ایسا کب ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے

سب اس کی خواہش کے موافق ہونا ہے یہ شانِ توحق تعالیٰ ہی کی ہے انھوں نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنے ارادے کو ارادۃ اللہ میں فنا کر دیا ہو تو جو امر ارادۃ الہیہ کے موافق ہو گا وہ اس کے ارادے کے بھی موافق ہو گا۔

حاصل یہ کہ ہم اپنے نفس کو اپنی رائے کو حق تعالیٰ کی رضا میں فنا کر چکے ہیں جس حالت میں ہیں خوش ہیں بات یہ ہے کہ پریشانی کی دو وجہ ہو ا کرتی ہیں اول تو جس سے معاملہ ہو اس سے محبت نہ ہو جب پریشانی ہوتی ہے اور اگر محبت ہو تو پریشانی کسی طرح نہیں ہو سکتی مثلاً محبوب اگر یوں کہے کہ مجھ سے دو گھنٹے دھوپ میں کھڑے ہو کر باتیں کرو اگر وہ کہے کہ نہیں تو دعویٰ محبت میں جھوٹا ہے اور اگر سچا ہے تو اس کی یہ حالت ہوگی ۔

ہر کجا یوسف رنخے باشد چو ماہ جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ
باتو دوزخ جنت ست اے جانفزا بے توجنت دوزخ ست اے دلربا

(میرا محبوب جو حضرت یوسف علیہ السلام کے جیسے چہرے والا چاند کی طرح ہے جس جگہ موجود ہو پھر چاہے وہ جگہ اندھا کنواں ہو مگر میرے لئے تو وہی جنت کی طرح ہے اے میرے محبوب میرے ساتھ ہو تو میرے لئے تو دوزخ بھی جنت ہے اور اگر تو میرے پاس نہ ہو تو میرے لئے جنت بھی دوزخ کے برابر ہے

یہ قضایا شرطیہ ہیں یعنی اگر آپ کی معیت ہے تو دوزخ بھی جنت ہے اور اگر معیت نہیں ہے تو جنت بھی دوزخ ہے اور یا قضایا شرطیہ کے صدق میں مقدم کا واقع ہونا ضروری نہیں ہوتا ملازم کافی ہے اس لئے دوزخ میں تو معیت باری تعالیٰ کی ہو ہی نہیں سکتی اور جنت جو مطلوب ہے محب کو وہ بھی لہذا مطلوب نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ مقامِ رضائے محبوب ہے اور دوزخ سے جو نپاہ مانگی جاتی ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ مقامِ محبوب کی نارضا مندی کا ہے اگر فرضاً جنت مقامِ غضب ہو تو محب اُس سے بُعد کو چاہے گا اور بالفرض اگر دوزخ مقامِ رضا ہو تو محب کو وہی مطلوب ہو گا۔ ملکہ النار نار میں ہیں لیکن خوش ہیں کیونکہ ایک شے خوش کن یعنی رضائے حق اُن کے ساتھ ہے اگر اُن سے کہا جاوے کہ جنت میں رہو لیکن اللہ تعالیٰ تم سے وہاں راضی نہ ہوں گے وہ ہرگز اس پر راضی نہ ہوں گے۔

دوسری وجہ پریشانی کی یہ ہوتی ہے کہ خلافتِ امید کوئی امر پیش آوے کہ سوچا کچھ اور

ہو گیا کچھ مثلاً طاعون آیا ہم چاہتے تھے کہ تندرست رہیں نہ رہے چاہتے تھے کہ تجارت میں نفع ہو نہ ہو اچاہتے تھے کہ اولاد ہو نہ ہوئی تو اس وقت پریشانی ہو گی اور جو شخص اپنی رائے کو فنا کر چکا ہو اور اپنے ارادے کو رضائے مولے میں مٹا چکا ہو اس کو پریشانی کی یہ وجہ بھی نہ ستائے گی۔ حضرت بہلولؓ سے کسی نے کہا کہ انج بہت گراں ہو گیا ہے سر مایا کچھ پرواہ نہیں ہمارے ذمہ یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ذمہ ہے کہ ہم سب کو حسبِ وعدہ رزق دیں۔ ایک بزرگ نے اپنی توبہ اور رجوع الی اللہ کا قصہ بیان کیا کہ ایک سال تخط بہت تھا مخلوق بہت پریشان تھی اُسی حالت میں ایک غلام کو دیکھا کہ بے فکری سے گاتا ہوا خوش بخوش جا رہا ہے اُس سے کسی نے پوچھا کہ مخلوق تو پریشان ہو رہی ہے اور تو اس طرح بھیکر ہے۔ اُس نے کہا کہ میں بے فکر کیوں نہ ہوں میرے مالک کے یہاں دو گاؤں ہیں اس وقت نفس کو ایک تازیانہ لگا اور یہ بات ذہن میں آئی کہ اے نفس جس کے مالک کے پاس دو گاؤں ہیں وہ توبے فکر ہے اور تیرے مالک کے قبضے میں آسمان و زمین عرش کرسی ہے اور تو پریشان ہے اسی وقت سے توبہ الی اللہ کی توفیق ہوئی افسوس کہ اس وقت معاملہ بالعکس ہو گیا ہے دنیا کمانے اور شب و روز اسی دُھن میں رہنے کو ترقی اور اولوالعزمی سمجھتے ہیں اور بے فکری اور توکل کو پستی کہتے ہیں اور طرہ یہ ہے کہ اپنے کو خیر خواہ اور ہی خواہ قوم کہتے ہیں، جو شخص رات دن ہوائے نفسانی میں مبتلا ہو اور سوائے دنیا کمانے کے کوئی مشغلہ نہ ہو اس سے دوسرے کی خیر خواہی کیا ہو سکتی ہے حقیقی خیر خواہ انبیاء علیہم السلام اور بزرگانِ دین ہیں، حق تعالیٰ فرمانے ہیں لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسِكَ اَنْ لَا يَكُوْنُ لَكَ اٰمُوْعٌ مِّنْ يَّهٍ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ جو شب و روز ان کی فکر میں گھلتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید اسی فکر میں کہ یہ ایمان نہیں لاتے آپ اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے۔ ان حضرات کا مشرب یہ ہے کہ ۵

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست بہ تسبیح و سجادۃ و دلق نیست

در روشنی باتصوّت کا طریقہ صرف یہ ہی نہیں ہے کہ تسبیح ہاتھ میں لے لی اور مصلے پر ہر وقت بیٹھے رہے

اور فقیروں جیسی گدڑی یا کھلی اوڑھ لی بلکہ درویشی یہ ہے کہ مخلوق کی صحیح خدمت کی جائے،

شاہِ اسحق صاحب کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا کہ حضرت فلاں شخص کے نام

ایک رقعہ لکھ دیجئے اُس سے میرا ایک کام ہے آپ کا رقعہ دیکھنے سے وہ کر دے گا وہ شخص حضرت کا سخت مخالف تھا حضرت نے رقعہ لکھ دیا اس نے جا کر اس شخص کو دیا اُس نے اس رقعہ کی بتی بنا کر دی اور یہ کہا کہ شاہ صاحب سے کہو کہ اس کی بتی بنا کر فلاں جگہ رکھ لو، اس شخص نے اسی طرح آ کر یہ مقولہ شاہ صاحب کی خدمت میں نقل کیا شاہ صاحب نے فرمایا کہ بھائی اگر اس فعل سے تیرا کام چلتا تو مجھے اس سے بھی دریغ نہ ہوتا یہ جواب اس کو پہنچا وہ شخص یہ بات سن کر زڑپٹ گیا اور اس قدر متاثر ہوا کہ شاہ صاحب کی خدمت میں آ کر اس نے معذرت کی اور اس کو ہدایت ہو گئی دس برس کے مجاہدہ میں بھی وہ بات نہ ہوتی جو شاہ صاحب کے ایک کالمہ میں ہو گئی اب بتلائیے کہ ایسی نفع رسانی آج کس میں ہے آج ترقی کا دم بھرنے والے اس کو پست ہمتی کہتے ہیں ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو انہوں نے فرمایا کہ دنیا اللہ کا گھر ہے اور ہم اس کے ضیف ہیں اور ضیافت بروئے حدیث تین دن ہے اور اللہ کے نزدیک ایک دن ایک ہزار برس کا ہے چنانچہ فرمایا ہے **وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ** **كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ** (تہارے حساب سے جتنے دن ایک ہزار برس ہوتے ہیں تیرے پروردگار کے نزدیک صرف ایک دن شمار ہوتا ہے) تو تین ہزار برس تک تو دعوت ہی ہے اس کے بعد پوچھنا، میرا مطلب ان حکایات سے یہ نہیں ہے کہ روپیہ نہ کماؤ اور جاگیر گھر لڑو مقصود یہ ہے کہ اس میں کھپ مت جاؤ بلکہ ضرورت پر نظر رکھو اور ایسے خصائل حاصل کرو جیسی کہ بزرگوں میں تھیں و مال جمع کرنے کی مالعت نہیں کرتا بلکہ بعض بزرگ روپیہ بہت رکھتے تھے مگر وہ اپنے نفس کیلئے نہیں بلکہ خدمتِ خلق کے لئے جیسے خزانچی اور تحصیلدار ہوتا ہے یہ حضرات بھی اسی طرح سے روپیہ رکھتے ہیں اور بلا اذن اس میں سے خرچ نہیں کرتے جیسے سلیمان علیہ السلام کو سلطنت دی گئی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلافت ملی یوسف علیہ السلام کو مصر کی بادشاہی ملی لیکن حالت کیا تھی کہ جب مصر میں فحط پڑا تو یوسف علیہ السلام پریت بھر کر کھانا نہ کھاتے تھے اور اگر اہل اللہ میں کوئی خوش خوراک لباس پایا جاوے تو وہ بھی باذنِ الہی ہے مثلاً ایک شخص ہے اس کو یہ ثابت ہوا کہ خلق کی ہدایت میرے متعلق ہے اور موعظ سے تقریر سے تدریس سے لوگوں کو ہدایت کرنا اُس کا مشغلہ ہے سو اگر وہ کھی دو دھاغذیہ مقویہ کا استعمال چھوڑ دے تو دماغ میں خشکی

آوے گی اور کچھ کام اُس سے نہ ہو سکے گا اور دماغ کی حفاظت کر کے گا تو سب کام ہو سکیں گے یہ نفس بطور مزدور کے ہے اور یہ دماغ سرکاری مشین ہے اگر اس کو مزدوری ملتی رہے اور مرمت ہوتی رہے تو کام دیتا رہے گا پس وہ خدمتِ نفس کی اس اعتبار سے نہیں کہ وہ ہمارا ہے بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ سرکاری خدمت سے تعلق رکھتا ہو کسی نے خوب کہا ہے نازمِ کچیم خود کہ جمالِ تودیدہ است اُفتم بیائے خود کہ بکویت رسیدہ است ہر دم ہزار بوسہ زخمِ دستِ خویش را کہ کو دامت گرفتہ لبیوم کشیدہ است حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ان لنفسک علیک حقا ولز وجک علیک حقا ریشک تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے اور فرماتے ہیں المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف رطاف نورِ مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے اور بعضوں کے کچھ نفعِ خلق کا متعلق نہیں ہوتا اُن کو اپنے ہی نفس کے اصلاح کی فکر ہوتی ہے ان کا مذاق یہ ہوتا ہے اے احمد تو عاشقی بہ مشیخت ترا چہ کارہ دیوانہ باش سلسلہ شردن شردن شدہ اے احمد تو عاشق ہے تجھے ولی یا بزرگ بننے کی فکر کیوں ہے۔ ارے دیوانہ کہ جیسا بن جا اور کام کرتا رہے پھر چاہے کچھ مرتبہ حاصل ہو یا نہ ہو اور کہتے ہیں اے خلق میگوید کہ خسر و بت پرستی میکند آرے آرے میکند یا خلق و عالم کا زمیت اے خسرو تجھے مخلوق کہتی ہے کو تو بت پرستی کرتا ہے ہاں ہاں تم یہ ہی سمجھو کہ وہ بت پرستی کرتا ہے لیکن اس مخلوق اور دنیا سے اسے کوئی تعلق نہیں ہے تو یہ کسی قسم کی بدنامی سے نہیں ڈرتے ایک وہ ہیں جو شبہ سے بھی بچتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں معتفک تھے کہ حضرت صفیہؓ جوازِ وجہ مطہرات سے ہیں تشریف لائیں جب اُس تشریف لے گئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پہنچانے کے لئے لبِ مسجد تک تشریف لائے تھے کہ سامنے سے دو شخص آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذرا کھڑو اور پھر فرمایا اِنَّهَا صَفِيَّةٌ یعنی یہ صفیہ ہیں یہ بات اُن کو بہت بھاری ہوئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توبہ توبہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہم کچھ گمان کر سکتے تھے فرمایا کہ شیطان ابنِ آدم کے رگ دریشے میں بجائے خون کے دوڑتا ہے مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں منہ لہلہ میں کوئی دوسرہ مذالہ غرض اولیاء مختلف رنگ کے ہوتے ہیں سرکاری گلدستہ ہے اُس میں گلاب بھی ہے جنیلی بھی ہے بیلا بھی ہے اور خار بھی ہے حاصل یہ ہے کہ جس شخص کا یہ مذاق ہو انصاف کیجئے اور سوچئے کہ اُس کو کیا کلفت ہوگی ہرگز نہیں وہ ہر وقت راحت میں ہے پریشانی اُس کے پاس نہیں اگر کوئی کہے کہ ہم نے انبیاء کی حکایتیں

سنی ہیں کہ اُن کو غم ہوئے نہیں۔ یعقوب علیہ السلام ایک مدت تک یوسف علیہ السلام کی جدائی میں مغموم رہے۔ یوسف علیہ السلام سخت مصائب میں مبتلا رہے۔ یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے ایذا پہنچائی۔ جواب یہ ہے کہ ان حضرات کو رنج و غم تو ہوا لیکن پریشانی نہیں ہوئی غم اور شے ہے۔ پریشانی اور چیز ہے اور غم ہونا کمال کے منافی نہیں بلکہ عین کمال ہے۔ بعض بزرگوں کا حال آیا ہے کہ ان کے بیٹے کا انتقال ہوا اور وہ مہنس رہے تھے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم محض تھے ظاہر ہے کہ کمال وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ جو مغموم نہیں ہوتے انہوں نے تو صرف حق تعالیٰ کا حق ادا کیا اور جن کو غم ہوا انہوں نے اولاد کا بھی حق ادا کیا اور اللہ تعالیٰ کا بھی۔ کالمیں کو جو غم دیا جاتا ہے اس میں یہ حکمت ہوتی ہے کہ صبر کی فضیلت حاصل کریں اس لئے کہ صبر بدون غم کے نہیں ہوتا اور دوسری حکمت یہ ہے کہ حزن سے تصفیہ ہوتا ہے قلب کا۔ اگر کوئی کہے کہ جب حزن ہوا تو حیاتِ طیبہ کہاں ہوتی بات یہ ہے کہ عین واقعہ رنج میں دو حیثیتیں ہیں، باعتبار مصیبت ہونے کے تو وہ الم رساں ہے اور باعتبار من المحبوب ہونے کے وہ مرضی ہے اور ان حضرات کے ہر واقعہ من اللہ ہونا ہر وقت پیش نظر رہتا ہے اس لئے خواہ کسی طرح کی مصیبت پیش آوے وہ اس حیثیت سے پسندیدہ ہے اور اُن کے اطمینان قلب میں کسی طرح خلل انداز نہیں ہاں تکلیف پہنچا امر آخر ہے اسکی حقیقت جو بفضلہ تعالیٰ آج ہی سمجھ میں آئی ایک مثال کے ضمن میں یہ ہے کہ طیب ہونے کے دو درجے ہیں اول مرہ دار ہونا اور نافع ہونا دوسرے صرف نافع ہونا مثلاً کہتے ہیں کہ یہ غذا طیب ہے تو معنی یہ ہیں کہ مزیدار بھی ہے اور نافع بھی اور کہتے ہیں کہ یہ دوا طیب ہے تو اس کا طیب ہونا یہ ہے کہ شفا ہو جاوے امراض زائل ہو جاویں پس حزن مثل دوا کے ہے دوا کا کڑوا ہونا جو طبع کے خلاف ہے لیکن گوارا ہے کڑوی دوا بھی خوشی کو پی لی جاتی ہے اور تانخی اسکی برداشت کی جاتی ہے اور یہ بھی حصول لذت کے لئے ہر اسلئے کہ دوا سے صحت ہوگی اور صحت لذت ہے تو دوا بھی اس قاعدے سے لذت ہوگی اور اس میں بھی ایک گونہ مسرت ہوگی بشرطیکہ اس کا نافع ہونا پیش نظر ہو۔ بحمد اللہ اس تقریر سے سب شبہات رفع ہو گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان حضرات کو خواہ مصیبت ہو رنج ہو فقر و فاقہ ہو وہ ہر وقت خوش ہیں وصال میں خوش

کرنے والی ان کو محبت ہے چونکہ ان کو حق جل و علا شانہ سے محبت ہے اس لئے تقاضا حق کے انتظار میں ان سب کو سہل ہے دنیا میں دیکھ لیجئے اگر کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہو کہ فلاں وقت وہ ہم سے ملے گا تو اس وقت کے انتظار میں سب بلائیں اس کو سہل ہیں یہ انتظار کہ خدا تعالیٰ ہم سے خوش ہوں گے یا اس وقت ہم سے خوش ہیں اس کی ایسی خوشی ہوتی ہے کہ سب مصائب سہل ہو جاتے ہیں یہ سب محبت کی برکت ہے۔ خدا کی قسم یہی وہ شے ہے جس کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم تمام امتنہ میں ممتاز ہوئے اور یہی وہ دولت ہے کہ جس کے سبب سے سلفِ رحیم اللہ کے آج تذکرے لکھے جاتے ہیں صحیح۔ اور اصل سبب ترقی کی یہی شے ہے آج کل صحابہ کرام کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے یوں ترقی کی یوں کی اور اس امر میں ان کا اپنے نزدیک اقتدار کرتے ہیں اور اصل روح اور سبب ترقی سے من تنگ نہیں اور نہ ترقی کی حقیقت سے واقف ہیں دنیا سمیٹنے کو اور جاوہ مذموم کے تحصیل کا نام ترقی کر رکھا ہے صحابہؓ نے جو فتوحات کی وہ سب اللہ بن تھی دنیا ان کے پاس تنگ نہ تھی سو ایسی ترقی کو کون منع کرتا ہے باقی صحابہ اور نیز دیگر سلف صالحین میں بھی مختلف رنگ کے لوگ تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گھر تک نہیں بنایا حضرت سلیمان علیہ السلام صاحبِ سلطنت ہوئے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ مال جمع کرنے کو بالکل حرام فرمایا کرنے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ اے ابوذرؓ میں تمہارے لئے وہ پسند کرتا ہوں تم دو شخصوں کے درمیان کبھی فیصلہ مت کرنا اور نہ یتیم کے مال کے ولی بننا اس لئے کہ میں تم کو کمزور دیکھتا ہوں یعنی تعلقات کی برداشت نہ ہوگی یہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا ہی جگر تھا کہ مدینہ طیبہ میں چٹائی پر بیٹھے ہیں اور روم و شام و مشرق و فارس کا انتظام کر رہے ہیں۔ غرض انبیاء اور صحابہ اور اولیاء اللہ میں بھی ہر ایک کا جُدا رنگ ہے اور ان کے لئے وہی رنگ مناسب ہے۔ بعضے روپے پیسے اس لئے گھبراتے ہیں کہ میاں کون جھگڑے میں پڑے ہم سے حقوق ادا نہ ہوں گے زکوٰۃ عشرت ربانی وغیرہ وغیرہ سینکڑوں حقوق ہیں یہ بڑا قصہ ہے ایسے لوگوں کے لئے البستہ یہ بڑا ہوتا ہے کہ ان کو کچھ نہیں دیتے اور ہمیشہ وہ مفلس رہتے ہیں جیسے

حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ کی سلطنت چھوڑ دی اور حبیبیہ حضرت شاہ ابوالمعالی قدس سترہ کہ ہمیشہ فقر و فاقہ میں گذرتی تھی۔ ایک روز کا قصہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں ان کے بیرومرشد تشریف لائے حضرت مکان پر تشریف نہ رکھتے تھے بی بی بھتیس انہوں نے تعظیم و تکریم سے پیر کو کٹھنرہا لیکن حسبِ عادت شاہ صاحب کے یہاں اس روز بھی کچھ کھانے پینے کو نہ تھا بی بی نے پڑوس میں سے آٹا اُدھار مانگنے کے لئے خادمہ کو بھیجا۔ پڑوسیوں نے اُدھار بھی نہ دیا کہ ان کو اُدھار دے کر کہاں سے لیں گے۔ پیر صاحب خادمہ کو برا بھلا جاتا دیکھ کر فراق سے سمجھ گئے پوچھا کہ کس منکر میں ہو۔ بی بی نے سمجھا کہ ان سے کیا چھپانا واقعی یہ حضرات خدا کے نائب ہوتے ہیں ان سے اپنا کوئی حال چھپانا نہ چاہیے۔ بی بی نے صاف کہہ دیا کہ حضرت آج ہمارے یہاں کچھ نہیں ہے۔ پیر صاحب نے ایک روپیہ عطا فرمایا آج کل کے پیر تو مریدوں کا ہی کھا جاتے ہیں۔ کچھ خیال نہیں کرتے کہ ان کے یہاں کہاں سے آیا ہے اور کس طرح بچا رہے لائے ہیں الفقہ پیر صاحب نے فرمایا کہ اس ایک روپیہ کا اناج لاؤ اور ہمارے پاس لانا۔ چنانچہ غلہ حضرت بیرومرشد کے پاس لایا گیا حضرت نے ایک تعویذ لکھ کر غلہ میں دبا دیا اور یہ فرمایا کہ اس تعویذ کو مت نکالنا پیر صاحب تو رخصت ہوئے اب روزمرہ اس میں سے غلہ نکالاجاتا تھا اور لپکایا جاتا تھا اور وہ کم نہ ہوتا تھا کئی روز ہو گئے کہ صبح و شام کھانا آنے لگا یہ دیکھ کر حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ باتیں یہ کیا بات ہے کئی روز ہوئے فقر و فاقہ نہیں ہے بی بی نے فرمایا کہ پیر صاحب تعویذ دے گئے تھے اس کی برکت ہے فرمایا کہ ہمارا فاقہ اختیاری ہے اضطراری نہیں اب یہ مقام بڑی کشاکشی کا تھا کہ پیر کا تعویذ اگر رکھا جائے تو اپنے مذاق کے خلاف اور نہ رکھیں تو پیر کے تعویذ کی بے ادبی مگر سبحان اللہ ان حضرات کو حق تعالیٰ ایسا نور باطن عطا فرماتے ہیں کہ ان کا ہنم نہایت صیحیح اور عقل ان کی کامل ہو جاتی ہے فرمایا کہ اس تعویذ کا حقدار تو میرا سر ہے مٹکا نہیں ہے لاؤ وہ تعویذ میں اپنے سر میں رکھوں گا۔ تعویذ مٹکا کر سر میں رکھ لیا اور اناج فقراء کو تقسیم کر دیا شام کو پھر فقر و فاقہ ہوا شکر حق تعالیٰ کا

اداکیا اور بعضوں کو جانتے ہیں کہ اگر ان کو نہ ملے گا تو پریشان ہوں گے اور یہ جانتے ہیں کہ ان سے برداشت حقوق کی ہوگی اُن کو خوب دیتے ہیں عرض اولیاء اللہ کے مختلف طبقات ہیں مگر جس حال میں ہیں خوش ہیں سے

بدرود و صاف تراجم نیست دم و کوش کہ انچہ ساقی مارنجیت عین الطافست
 رنجیہ نیچے کا تھوٹ ملے یا صاف شراب تجھے اس بات کی اجازت نہیں کہ کوئی اعمت راض کرے کیونکہ
 ہمارے ساقی نے جو کچھ ہم کو دیا ہے اس کی مہربانی ہے۔

اور کہتے ہیں سے

تو بندگی چو گدایاں لیش طر مزو مکن کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند
 دو محتاجوں کی طرح مزدوری کی شدہ طر عبادت مت کر کیونکہ ہمارا آقا خود ہی اپنے بندوں
 کی پرورش کے طریقے سے واقف ہے)

قبض کی حالت میں فرماتے ہیں سے

باغبان گر نچر وزی صحبت گل بایدش بر جھائے خارِ ہجران صبر بلبس بایدش
 ایدل اندر بند زلفش از پریشانی منال مرغ زیرک چوں بدام آفتد تحمل بایدش
 (اے باغ کے مالے اگر تو چند روز کے لئے پھول کی صحبت میں رہنا چاہتا ہے تو جدائی کے کانٹوں
 کے ظلم پر تجھ کو صبر بلبس اختیار کرنا چاہیئے اے دل محبوب کی زلف کی قید میں پھنس کر پریشان ہو کر مت
 جھج عقلت پرندہ جب جال میں پھنس جاتا ہے تو اس کو صبر برداشت سے کام لینا چاہیئے۔

اور اس سے زیادہ فرماتے ہیں سے

فراق و وصل چہ باشد خصائے دوست طلب کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے
 (جدائی اور ملاقات کا خیال چھوڑے اور صرف محبوب کی رضامندی کو تلاش کر کیونکہ اس سے
 سوائے اس کی ذات کے دوسری چیز کی طلب کرنا افسوسناک ہے)

اب میں پوچھتا ہوں کہ جس کا یہ حال ہو اس کو کیا پریشانی ہوگی وہ تو ہر وقت مسرور
 ہے۔ ہر وقت خوش ہے حیاتِ طیبہ یہ ہے اور اس کے ماسوا پریشانی ہے اور
 بے حاصلی ہے لیکن سے

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تانہ بخشہ خدا سے بخشندہ
 یہ کامیابی اپنی قوت اور محنت سے حاصل نہیں ہو سکتی جب تک بخشش کرنے والا
 خدا خود بخشش نہ کرے،

مگر ہاں کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ مرتبہ کس کو حاصل ہو سکتا ہے ہم لوگ تو دنیا دار ہیں۔
 سینکڑوں طرح کے اشغال ہمارے ساتھ لگے ہوتے ہیں سو یہ خیال شیطانی ہے اور نشا
 اس کا یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام کاروبار دنیا کے چھوڑ کر حجرے میں بیٹھ کر تسبیح ہلاؤ ہرگز
 نہیں ہر شخص کے لئے جہاد کا یہ طریق ہے اگر اس مقام پر ہر ایک کی تفصیل بیان کی جاوے
 تو ایک طویل وقت درکار ہے اور پھر بھی کافی نہیں اس لئے کہ یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ
 میرے لئے کونسا طریق نافع ہے اس لئے میں تم کو ایک مختصر سی بات بتلاتا ہوں اور جھگڑے
 کی بات بالکل نہیں بتاتا وہ یہ کہ مرشدِ کامل کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بے فکر ہو جاؤ۔
 لَحْدَ وَ كَيْفَ كُوْچھوڑ دو اپنے کو اس کے سپرد کر دو اور اپنی رائے کو ہرگز دخل نہ دو جو وہ
 طریقہ بتائے اس پر عمل کرو انشاء اللہ تعالیٰ کامیاب ہو گے ۵

بودمورے ہو سے دشت کہ در کعبہ رسید دست بر پائے کبوتر زرد دنا گاہ رسید
 یعنی ایک چوٹی کو موس ہوئی کہ خانہ کعبہ میں پہنچے لیکن اپنے ضعف و عجز کو دیکھ کر یائوس تھی اس
 نے دیکھا کہ ایک کبوتر کبوترانِ حرم محترم سے ٹھپا ہے وہ چوٹی اس کے پاؤں کو پیٹ گئی اس نے ایک
 پرواز کی اور بیت اللہ شریف میں جا پہنچا چوٹی نے جو آنکھ کھولی دیکھا تو خانہ کعبہ کے سامنے ہے۔ تو
 صاحبِ اسی طرح ہم اگرچہ ضعیف ہیں لیکن اہل اللہ کا دامن اگر پکڑ لیں گے تو انشاء اللہ محروم نہ رہیں گے
 اسی واسطے تو فرمایا ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ہ بس اب میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں، اب دعا کرنا
 چاہیے کہ حق نعل لے توفیق عطا فرمادیں + اَمِیْن یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ ۵ شَمَّت بِالْخَیْرِ

مَعْرُوضہ قارئین سے التجا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمادیں کہ ناشرکی کو شش دینیہ
 اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور قبولانِ حق کے ساتھ مشور و سرما دیں اور تمام زندگی
 بغایت پوری فرمادیں۔ آمین بحرمۂ حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ۶

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً

(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)

دعوات عبدیت جلد دوم

پانچواں وعظ ملقب بہ

تہذیب الاصلاح

ارشادات

حکیم الامتہ مجدد الملتہ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان مخفہ لہ

مکتبہ تھانوی، دفتر الايقام

متصل مسافر خانہ، بندر روڈ کراچی ۱
ایم اے جناح روڈ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دعواتِ عبدیت جلد دوم کا

پانچواں وعظ ملقب بہ

تہلیلُ الاصلاح

مَرِیْتُ	مَتَّعَ	عَمَّ	رَبِّیْ	مَا ذَرُ	مَنْصَبِیْ	رَزَقْتُمُونِیْ	مَرَشَاتِ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنہ ہوا	خود کب ہو کر	یہ مضمون تھا	کس نے لکھا	سایین کی تعداد	منقرقات
جلال آباد	اشعبان ۱۳۲۱ھ	۱۔ گھنٹہ	کھڑے ہو کر	اصلاح اعمال	ابو محمد عبد الصاحب	۲۰۰	قدیم مضمون کے لوگ لکھے تھے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور
افسنا و من سیئات اعمالنا من یدہ اللہ فلا مضل لنا و من یضللہ فلا ہادی لہ و نشہدان
لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشہدان سیدنا و مولانا محمد عبدہ و رسولہ
صلی اللہ علیہ و علیٰ آلہ و اصحابہ وسلم

فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ دَعْوَا قَوْلِ الْاَسَدِ یُصْلِحْ لَکُمْ
اَعْمَالَکُمْ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوبَکُمْ وَ مَنْ یُطِيعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا

یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے مختصر لفظوں میں ایک کارآمد مضمون پر متنبہ فرمایا
ہے حاصل اس کا یہ ہے کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ جو آدمی جو کام کرتا ہے اس سے دو چیزیں ہیں
ایک شے مقصود ہوتی ہے یا نودفع مضرت یا جلب منفعت مثلاً کھانا کھاتا ہے لذت و تغذی
کے لئے یہ ایک منفعت ہے دوا پیتا ہے دفع مرض کے واسطے یہ مضرت کا دفع ہوا اور

مثلاً لو کری کرتا ہے روپیہ کی تحصیل کے لئے تجارت کرتا ہے منفعت و فائدہ کی واسطے رشوت دیتا ہے تاکہ کسی قسم کی سزا نہ ہو جاوے یا کسی بلا میں مبتلا ہے اُس سے رہا ہو جاوے مکان بناتا ہے سردی و گرمی سے بچنے کے واسطے خلاصہ یہ ہے کہ یہ امر بالکل ظاہر اور بدیہی ہے کہ جو کچھ انسان کرتا ہے جلبِ منفعت کے لئے کرتا ہے یا دفعِ مضرت کے واسطے اس میں کسی فعل کو کلام نہیں اور نہ اس پر براہین و دلائل قائم کرنے کی ضرورت ہے البتہ منفعت و مضرت کی تعین میں اہل الرائے اور اہل ملت میں اختلاف ہے باقی نفسِ مسئلہ میں اتفاق ہے چنانچہ اول واضح ہو چکا ہے تعین میں البتہ بہت بڑا اختلاف ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ منفعت کی تحصیل تو ہر ایک کا مقصود ہے لیکن منفعت کی تعین میں ہر ایک نے ایک رائے قائم کر رکھی ہے ایک شخص ساعی ہے کہ مجھ کو مثلاً تحصیلداری یا نھانداری یا ڈپٹی یا ڈپٹی کلکٹری وغیرہ مثلاً علی حسب اختلاف المقاصد مل جائے کہ اس میں میری عزت و آبرو ہے دوسرا ساعی ہے کہ مجھ کو نہ ملے کہ غریبوں پر ظلم ہوگا۔ چنانچہ بعضوں پر زور دیا جاتا ہے کہ حکومت قبول کر دو اور وہ نہیں کرتے ایک وہ لوگ ہیں جنہوں نے سلطنت کے لئے ہزاروں جانیں ضائع کر دیں ایک وہ تھے کہ بھاگتے تھے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ کوئی اس کو منفعت سمجھا اس کی تحصیل کے لئے سعی کی اور دوسرے نے اس کو مضرت خیال کیا اس لئے اُس کے دفع میں کوشش کی اور جس قدر اختلافات عالم میں ہیں سب کی وجہ یہی ہے کہ ایک شخص ایک امر کو منفعت و مستحسن سمجھتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے اُس کی تحصیل کے درپے ہوتا ہے دوسرا اُسی کو مضرت سمجھتا ہے اس لئے اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ اختلافِ مذاہب کی یہی وجہ ہے لیکن اس وقت اس میں بحث نہیں ہے اس لئے کہ اس وقت بفضلہ تعالیٰ ساراجمع ایک مذہب کا ہے۔

اس وقت قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس کا فیصلہ ہونا ضرور ہے کہ آیا کون منفعت وافع میں قابلِ تحصیل کے ہے کون مضرت قابلِ دفع کے ہے تو بعدِ تامل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ منفعت وہ لائقِ تحصیل کے ہے جس میں دو صفتیں ہوں ایک تو یہ کہ وہ منفعت زیادہ باقی رہنے والی ہو دوسری یہ کہ خالص ہو مشوب بضر نہ ہو دیکھ لیجئے اگر کوئی منفعت چار

سال رہنے والی ہو اور دوسری آٹھ سال تو ہر عاقل دوسری ہی کو پسند کر لیا اور اسی کو اختیار کرے گا مثلاً دو مکان ہوں ایک بڑا عالی شان اور خوبصورت ہو اور دوسرا چھوٹا اور بد صورت ہو اور وہ مکان کسی شخص کے سامنے پیش کئے گئے لیکن یہ کہا گیا کہ بڑا مکان چار پانچ روز کے بعد خالی کر لیا جاوے گا اور چھوٹا کبھی خالی نہ کر لیا جاوے گا تو ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس چھوٹے ہی مکان کو پسند کرے گا اور اگر یہ کہہ دیا جاوے کہ نسلاً بعد نسل تم کو دیدیا جاوے گا تو ضرور ہی پسند کرے گا۔ معلوم ہوا کہ منفعت باقی رہنے والی ہوگی اسی قدر زیادہ اعتبار کے قابل ہوگی۔ اسی طرح اگر وہ مکان عالی شان یا وجود اپنی خوبصورتی کے کسی ضرر پر مشتمل ہو مثلاً ہمسایہ اچھا نہ ہو یا اور کوئی مضرت کا احتمال ہو اور اس چھوٹے مکان میں یہ اندیشہ نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ چھوٹا ہی مکان پسند ہوگا۔ پس یہ قاعدہ ثابت ہوا کہ منفعت وہ قابل تحصیل کے ہے جو مضرت سے خالص ہو اسی طرح مضرت بھی وہ زیادہ قابل اہتمام کے ہوتی ہے جو زیادہ باقی رہنے والی ہو اور نیکو من کل الوجود مضرت ہی ہو کوئی شائبہ اس میں منفعت کا نہ ہو دیکھو اگر اتنا سفر میں آدمی کسی مکان میں ایک دو شب کے لئے قیام کرتا ہے اور وہاں کوئی ناگوار امر پیش آتا ہے اس کے دفع میں زیادہ اہتمام اور فکر نہیں کرنا بخلاف اس کے کہ وطن اصلی میں کوئی امر پیش آوے تو اس کی دور کرنے کی زیادہ فکر ہوتی ہے اس لئے کہ وہاں ہمیشہ رہنا ہے اور مثلاً اگر کہا جاوے کہ اگر تم چار دن کے لئے دھوپ میں سفر کرو تو تم کو عمر بھر راحت ملے گی یا اگر چار ماہ راحت سے رہو گے تو عمر بھر جیل خانے میں رہو گے تو ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس چار روز کے سفر کی مشقت کو گوارا کر لے گا اور دوسری صورت کو پسند نہ کرے گا۔ معلوم ہوا کہ مضرت باقیہ و خالصہ زیادہ فکر کے قابل ہے۔ اور مضرت فانیہ زیادہ قابل التفات نہیں ہے پس منفعت و مضرت دونوں کی دقتیں ہوں منفعت باقیہ خالصہ منفعت فانیہ غیر خالصہ مضرت باقیہ خالصہ مضرت فانیہ غیر خالصہ اسکے بعد معلوم کرنا چاہیے کہ دنیا کی منفعت و مضرت تو ہر شخص کے پیش نظر ہے مگر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک منفعت و مضرت کی بھی خبر دی ہے جو مرنیکے بعد واقع ہونی والی ہے۔ اب محل کے اعتبار سے منفعت و مضرت کی دو دقتیں اور نکلیں منفعت دنیویہ منفعت اخرویہ مضرت دنیویہ مضرت اخرویہ اب ہر کوئی دیکھنا چاہیے کہ یہ چار قسمیں آخر کی یعنی منفعت دنیویہ و آخریہ مضرت دنیویہ و آخریہ یہ پہلے اقسام کی کس قسم میں داخل ہیں۔

یعنی غور کرنا چاہیئے کہ منفعت دنیویہ یا منفعت باقیہ خالصہ ہے یا قانیہ غیر خالصہ اسی طرح مضرت دنیویہ کو بھی دیکھنا چاہیئے اور منفعت اخرویہ و مضرت اخرویہ کو بھی دیکھنا چاہیئے یعنی یہ کہ کونسی منفعت اور مضرت کس قسم میں داخل ہے سو دیکھ لیجئے کہ دنیا کی منفعت تو قانیہ ہے اور آخرت کی باقیہ ہے اور آخرت کی مضرت باقی رہنے والی ہے۔ اور دنیا کی مضرت فنا ہونے والی ہے۔

اسی طرح دوسرے اعتبار سے دیکھئے کہ دنیا کی منفعت کس کی اعلیٰ درجہ کی ہو مگر حنا لہ نہیں مثلاً کھانا ہی لے لیجئے اول تو حاصل کس کلفت سے ہوتا ہے کہ اول زمین کو درست کیا جاتا ہے اس کے لئے بیل و آلات زراعت مہیا کرنے ہوتے ہیں اس کے بعد بولتے ہیں پانی دیتے ہیں، حفاظت کرتے ہیں۔ کاٹتے ہیں۔ کاشتہ ہیں۔ اور اڑاتے ہیں۔ پیستے ہیں پکاتے ہیں۔ اس قدر کلفتوں کے بعد جب اس سے عین انتفاع کا وقت ہوتا ہے کہ اس وقت بظاہر تمام کلفتیں ختم ہو جاتی ہیں اور التذاذ ہی کا وقت ہوتا ہے لیکن اس وقت بھی اکثر اوقات کوئی نہ کوئی کلفت پیش آ جاتی ہے کہ وہ کلفت التذاذ میں سد راہ ہو جاتی ہے مثلاً روٹی کا ٹکڑا گلے میں اٹک گیا، کھانا کھانے بیٹھے کسی عریز کے مرے کی خبر آ گئی یا اور فکر میں ڈالنے والی کوئی بات سُن لی کہ سب کھانا پکا یا بے لطف ہو گیا یا یہ وہ کھانا ہضم نہیں ہوا قبض ہو گیا یا درست آنے لگے، سلاطین اور امراء کے عیش سے زیادہ کسی کا عیش نہیں ہے لیکن ان کو سب سے زیادہ پریشانیاں ہیں اولاً دیکھ لیجئے کہ بڑی بڑی تمناؤں کے بعد پیدا ہوتی ہے انواع النواع کی تکالیف اٹھا کر ان کو پرور کرتے ہیں پھر اکثر اولاد خلاف مزاج ہوتی ہے والدین کو سینکڑوں طرح کی ان سے تکالیف پہنچتیں ہیں غرض دنیا کی جن منفعت کو دیکھو گے خالص نظر نہ آوے گی اور اپنے مقصد کے موافق نہ ہوگی۔ حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں اَمَ لِلْانْسَانِ مَا تَكْنُ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُولٰٓئِیَ کیا یہ انسان کے لئے جو جو تمنا کرے وہ حاصل ہو جاتے ہیں (یعنی نہیں) پس آخرت اور دنیا سب اللہ کے اختیار میں ہے۔

لیکن اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے لِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُولٰٓئِیَ سے تو یہ معلوم ہوا کہ جیسے

دنیا ہمارے اختیار میں نہیں ہے اسی طرح آخرت بھی نہیں ہے پھر فرق کیا ہوا بلکہ نہ وہ قابلِ تحصیل ہوئی نہ یہ ہوئی تو جو اس تقریر سے تمہارا مقصود ہے کہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی رغبت دلانا وہ حاصل نہ ہوا جواب یہ ہے کہ دوسرے مقام پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مِنْ مُؤَمَّمًا ذَا خُورٍ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا یعنی جو شخص صرف دنیا طلب کرے تو دنیا میں جو ہم چاہیں گے جس کو چاہیں گے وہ دیں گے پھر اُس کے لئے ہم جہنم تجویز کریں گے اس میں داخل ہوگا اس حالت میں کہ مرموم و مردود ہوگا اور جو شخص آخرت چاہے گا اور اس کے لئے پوری سعی کرے اور وہ مومن بھی ہو پس ان لوگوں کی سعی کی قدر کی جاوے گی دیکھئے دنیا کی نسبت تو یہ فرمایا کہ ہم جس کو چاہیں گے اور جتنی چاہیں گے دیں گے اور آخرت کی نسبت وعدہ فرمایا کہ جو اس کے لئے سعی کرے گا اس کی سعی کی قدر کی جاوے گی یعنی اس کا بدلہ ملے گا دونوں جگہ قضیہ شرطیہ ہے مگر دوسری جگہ کامیابی کا وعدہ ہے اور پہلی صورت میں نہیں ہے پس حاصل یہ ہوا کہ اختیار میں تو خدا ہی کے ہے دنیا بھی آخرت بھی مگر آخرت کی سعی پر بدلہ دینے کا وعدہ ہے اس لئے وہ قابلِ تحصیل ہوئی بخلاف دنیا کے بہر حال آیت اُمُّ لِلنَّاسِ مَا تَمَسَّتْ اِلَیْہِ سے جو شبہ ہوا تھا وہ مرتفع ہو گیا۔ اب ہم لوگوں نے برعکس معاملہ اختیار کیا ہے کہ جس کا (یعنی دنیا) وعدہ نہیں ہے اور اس کو اپنی مشیت پر رکھا ہے اس کے طلب میں تو منہمک ہیں اور نیز اس کے اسباب تحصیل (نوکری تجارت زراعت وغیرہ) کی نسبت تو ایسا معاملہ کرتے ہیں کہ گویا ان کے نزدیک مسبب ان پر ضرور مرتب ہوگا اور جس کا وعدہ ہے (یعنی آخرت) اس کے اسباب (صلوٰۃ صوم حج زکوٰۃ وغیرہ) کی طرف مطلق التفات نہیں، بین تفاوت راہ از کجاست تا یکجا خلاصہ یہ کہ دنیا کی ہر منفعت کے اندر کدورت ہے بخلاف آخرت کی منفعت کے کہ جس کو حق تعالیٰ اپنی رضامندی کے ساتھ جنت نصیب فرمائے وہاں اس کو کوئی آزار نہیں فرماتے وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُیْنَ اَلَا نَفْسُ

یعنی تمہارے لئے جنت میں وہ شے ملے گی جس کو تمہارا جی چاہے گا۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں لَا يَمَسُّنَّ فِيهَا نَجَسٌ وَلَا يَمَسُّنَّ فِيهَا الْغُوبُ یعنی ہم کو جنت میں نہ تعب لگے اور نہ اس میں نکال ہوگا۔

اگر کوئی کہے کہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک کے پاس دنیا کا سامان جیسے مال اولاد مکان گھوڑے جوڑے وغیرہ بہت ہوتا ہے تو دوسرا دیکھ کر اس کو حسد کرتا ہے اور حسد کی آگ سے جلتا ہے تو یہ مسلم ہے کہ جنت میں سب نعمتیں ہوں گی لیکن اختلاف درجات کی وجہ سے شاید آپس میں حسد ہو تو یہ بھی ایک قسم کی تکلیف اور کدورت ہے جواب یہ ہے کہ وہاں پہ حسد نہ ہوگا ہر شخص اپنے حال اور نعمتوں میں بھی خوش ہوگا اور کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو دوسروں کو اپنے سے افضل سمجھے گا یا نہیں اگر فضل جانے گا تو حسد ہوگا اور اگر نہ جانے گا تو جہل لازم آئے گا۔ جواب یہ ہے کہ ہم اس شق کو اختیار کرتے ہیں کہ وہ افضل کو اپنے سے افضل جانے گا۔ لیکن وہ اُن کے درجات کی تمنا نہ کرے گا اس لئے کہ اپنی استعداد اس کو معلوم ہوگی اور اپنے اعمال اس کو اپنے پیش نظر ہوں گے اور تفاوت درجات وہاں تفاوت اعمال سے ہوں گے اس لئے اس کو معلوم ہوگا کہ اس سے زیادہ درجہ مجھ کو نہیں مل سکتا اس لئے وہ اسی میں خوش ہوگا نہ کسی پر اس کو حسد ہوگا اور نہ زیادہ کا تمنی ہوگا۔

دوسرا جواب اس سے باریک ہے وہ یہ کہ وہاں سب عہد کا مل ہوں گے تمام مقامات باطنی حاصل ہوں گے اور مقامات میں سے رضا بھی ہے اس لئے مقام رضا بھی اس کو حاصل ہوگا اور وہ اُس میں اس قدر خوش ہوگا کہ درجات فاضلہ کی اُس کے قلب میں تمنا نہ ہوگی جیسا کہ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض طبایع میں قناعت کا مضمون ایسا راسخ ہے کہ اُن کے قلب میں ترقی دینا نہ ہونا کیا معنی بلکہ اُس سے نفرت ہے۔ ایک پولیس کے اہل کار دیکھے گئے کہ ان کے افسر کو شش کرتے ہیں کہ اُن کی ترقی کریں مگر وہ منظور نہیں کرتے اور ان کے ہم چشم اُن پر ہنستے ہیں، بات یہ ہے کہ طبایع کا مذاق مختلف ہے جبکہ دنیا میں اس کا نمونہ موجود ہے آخرت میں تو کیا بعید ہے۔ ہاں ایک شبہ رہا وہ یہ کہ حدیثوں

میں آتا ہے کہ جتنی آپس میں ملیں گے اور ایک جتنی دوسرے کو دیکھ کر تمنا کرے گا کہ جیسا اب اس کا ہے ایسا ہی میرا بھی ہو۔

چنانچہ فوراً اسی طرح اس کا لباس ہو جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ تمنا کرے گا جو اب یہ ہے کہ یہ تمنا صرف لباس کے بارے میں آئی ہے درجہ کے بارے میں نہیں ہے اور لباس کے اندر مساوات ہونے سے درجہ کی مساوات یا فضیلت لازم نہیں کما ہوا ظاہر جداً پس جس میں فرق رہنا ضروری ہے یعنی درجہ اس کی تمنا نہ ہوگی اور جس کی تمنا ہوگی یعنی لباس اسی میں فرق ہونا ضروری نہیں۔ پس حد کی کوئی گنجائش نہ ہوئی حاصل یہ کہ جنت کی نعمتیں سب خالص ہوں گی کدورت کا ان میں نام و نشان نہ ہوگا بخلاف نعماءِ دنیا کے کہ ان سب میں کچھ نہ کچھ کدورت ضرور ہی ہوتی ہے اب مضرتِ دنیوی کو دیکھئے کہ مضرتِ دنیویہ خواہ کیسی ہی اشد ہو لیکن فنا ہونے والی ہے اگر کسی کو کوئی بیماری ہے اول تو دنیا ہی میں صحت ہو جاتی ہے ورنہ مر کر تو متام مصائب کا خاتمہ ہو ہی جاتا ہے اسی طرح اگر کوئی افلاس میں یا کسی اور طرح کے رنج و غم فکر میں مبتلا ہوتا ہے سب ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ مضرتِ دنیا کو بقاء نہیں ہے اسی طرح دوسرے اعتبار سے دیکھئے کہ مضرتِ دنیا خالص مضرت نہیں بلکہ تال سے دیکھا جاوے تو اس میں سینکڑوں منفعتیں دنیا اور دین کی ہوتی ہیں دنیا کی منفعت تو یہ کہ مثلاً ایک شخص کسی بیماری میں مبتلا رہتا ہے تو اگر یہ تندرست رہتا تو خدا جانے کیا کیا فساد کرتا اور اُس کے سبب سے یہ آبرو ہوتا جیل خاں جاتا اور ظاہر ہے کہ عاقل کے لئے آبرو جان سے زیادہ عزیز ہے اور دین کی منفعت تو بہت ہی ظاہر ہے کہ بیماری و ثوب کو محو کرتی ہے اور بہت سے منہیات سے روکتی ہے خلاصہ یہ کہ دنیا کی مضرت فنا ہونے والی بھی ہے اور من کل الوجوه مضرت نہیں ہے بخلاف مضرتِ اخرویہ کے کہ وہ مضرت ہی مضرت ہے تمام مضرتیں وہاں علی الکمال موجود ہیں پس ثابت ہوا کہ منفعتِ دنیویہ قانی بھی ہے قلیل بھی ہے اور ثوب بہ کلفت ہے اور اخروی منفعت باقی بھی ہے کثیر بھی ہے اور

خالص بھی ہے اسی طرح مضرت دنیا فانی ہے اور غیر خالص اور اخروی مضرت باقی بھی ہے اور خالص ہے۔

اب روزِ روشن کی طرح فیصلہ ہو گیا اور آپ خود موازنہ کر سکتے ہیں کہ حاصل کرنے کے قابل کون سی منفعت ہوتی، سو ظاہر ہے کہ مسلمان رجو کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا جانتا ہے، اس سوال کا یہی جواب دے گا کہ منفعت اخرویہ تحصیل کے قابل ہے اسی طرح دنیا اور آخرت کی مضرتوں میں موازنہ کر لیجئے کہ کون مضرت زیادہ بچنے کے قابل ہے ظاہر ہے کہ دنیا کی مضرت آخرت کی مضرت کے مقابلہ میں اصلاً قابل التفات نہیں زیادہ اہتمام کے قابل آخرت کی مضرت ہے۔ اس کے بعد سمجھئے کہ آخرت کی منفعت کس طرح حاصل ہوتی ہے اور آخرت کے ضرر سے کس طریق سے بچ سکتے ہیں۔

تو سمجھ لیجئے کہ آخرت کی منفعت جنت ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریق اعمالِ صالحہ ہیں اور آخرت کی مضرت دوزخ ہے اور اس سے بچنے کا طریق بد اعمالیوں سے بچنا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اعمالِ صالحہ کو اختیار کیا جاوے اور ذنوب سے بچا جاوے اور جو ہو چکے ہیں ان سے توبہ کی جاوے خلاصہ یہ کہ مقصود دو شے ہیں اصلاح اعمالِ محمود و توبہ اور محو ذنوب کے معنی یہ ہیں کہ گزشتہ سے توبہ کی جائے اور آئندہ بچنے کا عزم کیا جائے لیکن اعمال کی تحصیل اور گناہوں سے بچنا اول تو اکثر لوگوں پر ہمیشہ ہی سے گراں اور ثقیل ہے۔

پھر خصوصاً اس زمانہ میں تو اعمالِ صالحہ لوگوں پر بہت ہی بھاری ہیں چنانچہ بڑی ضروری اعمالِ صلوٰۃ صوم حج زکوٰۃ ہیں لیکن دیکھا جاتا ہے کہ ان سب کے اندر بے حدستی کی جاتی ہے بلکہ مصیبت سمجھتے ہیں یہاں تک کہ اخبار میں شائع ہوا تھا کہ نماز نے ترقی کو روک دیا ہے کیونکہ یہ سن کر کہ مسلمان ہو کر پانچ وقت کی نماز پڑھنی پڑے گی اسلام سے یعنی آدمی رُک جاتے ہیں اس لئے اس کو اسلام سے خارج کر دیا جاوے نعوذ باللہ ان احمقوں سے کوئی پوچھے کہ جس اسلام میں نماز نہیں ہو کیا اسلام ہوا۔ اس بے ہودہ رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عقل پرستوں پر نماز بہت ہی بھاری ہے۔

ہمارے مدرسہ دیوبند میں ایک طالب علم نووارد آئے تھے منطقیوں کی صحبت میں بہت رہے تھے دین کی مطلق پروا نہ تھی نماز کی پابندی نہ تھی اور یہاں دیوبند میں نماز کا بڑا اہتمام ہے پانچ وقت سب طلبہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں تو جب نماز کا وقت آتا ان کو بھی زبردستی لے جاتے ایک روز کہنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو معراج میں تشریف لے گئے تھے وہاں پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں پھر کم ہوتے ہوتے پانچ رہی تھیں معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند میں پوری پچاس کی پچاس ہی باقی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ نماز ان کو سخت مصیبت معلوم ہوتی تھی حق تعالیٰ بھی فرماتے ہیں اِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْاَشَاحِدِیْنَ۔ یعنی بے شک نماز بہت بھاری ہے مگر ان لوگوں پر جو خشوع کرنے والے ہیں اسی واسطے میں تو نمازی کو ولی سمجھتا ہوں، حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ نماز پابندی کے ساتھ ادا ہوتی ہے۔

علیٰ ہذا روزہ کو بہت ثقیل سمجھتے ہیں، کانپور میں ایک شخص تھے انھوں نے کبھی روزہ ہی نہیں رکھا میں نے ان سے کہا تو کہنے لگے کہ میں کسی طرح متحمل ہی نہیں میں نے کہا کہ امتحان کے لئے ایک تو رکھو چنانچہ رکھا اور پورا ہو گیا تب معلوم ہوا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا کہ میں متحمل ہی نہیں۔

بعض لوگ حج کا نام سن کر وہاں کی بہت مذمت کرتے ہیں کہ وہاں بد و ماڈالتے ہیں لوٹ لیتے ہیں اور بعض تو گئے بھی نہیں مگر اوروں سے سن سن کر وہ بھی مذمت کیا کرتے ہیں یہ سب کم ہمتی کی باتیں ہیں میں ان کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا ہندوستان میں ایسے واقعات نہیں ہوتے بلکہ اگر وہاں کے مجمع پر نظر کی جائے تو حق تو یہ ہے کہ جس قدر واقعات ہونا چاہیے ان سے بہت کم ہوتے ہیں ہندوستان میں اس کا عشر عشر بھی اگر مجمع ہو جائے تو بہتر سے واقعات ہو جاتے ہیں بلکہ بغیر مجمع کے بھی راستوں میں واقعات ہو جاتے ہیں ہم یہ نہیں کہتے جیسا بعض کہتے ہیں کہ بدوں کو لوٹ مار حلال ہے اس لئے کہ وہ دانی حلیمہ سعدیہ کی اولاد ہیں یہ تو بالکل لغو ہے وہ اگر ایسا کرتے ہیں تو زیادہ گنہگار ہوتے ہیں لیکن ضرور کہیں گے اور تم اس کو یاد رکھو کہ حج کا سفر سفرِ عشق ہے راہِ عشق میں تو سب کچھ پیش آتا ہے بلکہ

پیش نہ آنا عجیب ہے دنیا کے محبوب سے ملنے کے لئے کیسی کیسی مصیبتیں پیش آتی ہیں
گیرب گوارا کرتے ہیں ۵

نسا زد عشق را گنج سلامت ۛ خوشا رسوائی کو ی ملامت
عشق کے لئے سلامتی گوشہ مناسب نہیں بلکہ بدنامی کے کوچہ کی رسوائی بہترین

چیز ہے ۵

عشق مولیٰ کے کم از لیلے بود ۛ گوی گشتن بہر او اولے بود
(اللہ تعالیٰ کا عشق لیلے کے عشق سے کم ہو تا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کیلئے تو گلی گلی چھڑنا ہی بہتر ہے)
ایک بزرگ ایسے باہمت تھے کہ انھوں نے ۳۳ حج کئے تھے۔ ایک شخص مولوی منظور احمد
صاحب بنگالی تھے مدینہ طیبہ میں رہتے تھے مگر ہر سال حج کیا کرتے تھے اور حج کیسے مدینہ طیبہ
لوٹ جاتے تھے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو دیکھ کر ایک باریہ شعر پڑھا ۵

زہے سعادت آن بندہ کہ کرد نزول
گہے بہ بیت خدا و گہے بہ بیت رسول

(وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ کس قدر خوش نصیب ہے جو کبھی خدا کے گھر میں جا پہنچتا ہے اور کبھی
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں)

اور بعض ایسے بھی ہیں کہ قریب بیت اللہ شریف کے رہتے ہیں اور ان کو اب تک بھی حاضری
نصیب نہیں ہوئی ایک صاحب فرماتے تھے کہ ایک بدوی بیس بچپس برس سے مکہ معظمہ آتا
تھا اس نے ایک دن پوچھا کہ یہ لوگ اطراف و جوانب سے اس کثرت سے یہاں کیوں
آتے ہیں اللہ اکبر اس کو اتنی بھی خبر نہیں تھی کہ یہاں کیوں آتے ہیں۔

علیٰ ہذا زکوٰۃ میں گرائی ہوتی ہے چالیس ہزار میں سے جب ایک ہزار روپیہ نکلتا ہے
تو گراں گذرتا ہے حالانکہ چالیسواں حصہ بہت ہی کم ہے اہم سابقہ پر چوتھا حصہ مال کا
فرض تھا یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ چالیسواں حصہ ہی فرض کیا گیا یہ بھی لوگوں پر بھاری ہے۔
آج کل کے نو تعلیم یافتہ اس فکر میں ہیں کہ احکام شرعیہ ہماری عقل کے موافق ہوتے ہیں
واللہ خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ عقل کے فتوے پر حکم شرعی نہیں ہے عقل تو یوں چاہتی

ہے کہ اگر کسی کے پاس چالیس ہزار روپیہ ہو تو ۳۹ ہزار بلکہ زیادہ زکوٰۃ میں دیا جائے اور ایک ہزار خود رکھا جائے اس لئے کہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ غریب و مستحقین زکوٰۃ کی تعداد زیادہ ہے اور اغنیاء کی کم ہے اور ادھر یہ ثابت ہے کہ بنی آدم اعضائے یک گیر اند و نیز مساواة بین الاقوام آجکل کے اصول عقلیہ سے ہے تو ایک شخص کو کوئی حق اس بات کا نہیں ہے کہ اس کے پاس ۴۰ ہزار روپیہ ہوں اور دوسرا نان شبینہ کو محتاج ہو پس یہ رحمت نہیں تو کیا ہے ایک ہزار زکوٰۃ کے واجب ہوئے اور ۳۹ ہزار کھنے کی اسکو اجازت ہوئی اگر کوئی کہے کہ جب یہ عقل کا مقتضا تھا تو شریعت نے اس کا کیوں اعتبار نہیں کیا احکام شرعیہ عقل کے خلاف ہیں جواب یہ ہے کہ اگر عقل کے فتوے کے موافق زکوٰۃ میں حکم ہوتا تو اس میں تمدن محفوظ نہ رہتا اس لئے کہ سب یکساں حالت میں ہوتے اگر کسی کو کوئی کام پیش آتا اور مزدور کی ضرورت ہوتی تو کہاں سے آتا، خدمت گار کہاں سے ملتا۔ حمام، دھوبی، نائی، بھنگی کے کام کون کرتا غرضیکہ یہ سب کام اٹکے رہتے اور زندگی گزارنا مشکل ہوتا۔ اس سے آپ کو شریعت کی خوبی معلوم ہوئی ہوگی کہ اس کے احکام کتنے مصلح اور حکم پر مبنی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ شریعت جو ہمہ دہی کرتی ہے وہ آپ کی عقل نہیں کر سکتی حاصل یہ کہ جس قدر احکام شرعیہ ہیں سب کے اندر لوگوں کو گرانی ہوتی ہے اور جو احکام کرتے ہیں ان میں گرانی ہو تو زیادہ تعجب نہیں ہے جن امور سے منع کیا گیا ہے ان میں بھی گرانی ہوتی ہے حالانکہ ترک فعل سے اسهل ہے فعل میں تو ایک کام کا کرنا ہوتا ہے اور ترک میں کیا مشقت ہے بلکہ سہولت ہونا چاہیئے دیکھئے ایک ادنیٰ سی شے غیبت ہے کہ بجز مضرت کے اس میں اور کچھ نہیں اور گناہوں میں تو کچھ حظ یا نفع دنیوی بھی مرتکب کے زعم میں ہوتا ہے اور اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے لیکن ہم لوگوں سے یہ نہیں چھوٹی غرض کہ احکام شرعیہ خواہ متعلق فعل کے ہوں یا ترک کے سب میں لوگوں کو گرانی ہوتی ہے اور جب ایک ایک فعل اور ایک ایک ترک بھی گراں ہے تو جب کہ پچاس عمل کرنے کے ہوں اور پچاس نہ کرنے کے جیسے احکام کی اب موجودہ حالت

ہے تو مشقیتیں ہوتیں سنکر بھی جی گھبرا جاوے گا کہ میاں یہ تو بڑی مصیبت پڑی کہ یہ کام کروو نہ کروو سخت الجھن اور دشواری ہے کوئی میاں فلسفی بتلائے تو سہی کہ یہ نعمت کس طرح حل ہو اور یہ دشواری کس طرح سہل ہو اگر تمام فلاسفہ قدیم و جدید جمع ہو کر سوچیں تو ہرگز کوئی طریقہ ایسا نہیں نکال سکتے جس سے پیچیدگی اور یہ گلچھڑے کھلے اور اگر کوئی سوچ بچار کر کوئی طریقہ نکالے بھی تو وہ سہل نہ ہوگا۔

حق تعالیٰ شانہ نے اپنے بندوں کی اس مشقت اور اس الجھن کو دفع کرنے کے لئے ایک طریقہ نہایت مختصر لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے۔ اس آیت کریمہ میں جو میں نے تلاوت کی ہے اسی طریقہ کا بیان ہے یہ حاصل ہے اس تقریر کا اجمالاً اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول ثابت ہو چکا ہے کہ دو شے مقصود ہیں اعمال صالحہ کا حاصل کرنا اور محمود نوب اور ان میں بھی گرائی اس کی سہولت کے لئے دو طریق ارشاد فرمائے ہیں کہ ان کو اختیار کر لو تو وہ دو چیزیں جو بڑی مشقت کی تھیں وہ آسان ہو جاویں گی۔ ان میں سے ایک اتقوا اللہ ہے اور دوسرے قولو قولاً صدقاً ہے یعنی اللہ سے ڈرو اور بات ٹھیک کہو اس پر دو شے مرتب فرمائی ہیں یصلح لکم اعمالکم ویغفر لکم ذنوبکم یعنی اگر تم ان دو باتوں کو اختیار کر لو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمادیں گے اور تمہارے گناہ بخشتیں گے اور ان ہی میں تم کو گرائی تھی جس کا اوپر بیان ہوا۔ حاصل یہ کہ تقویٰ جس کا ترجمہ خدا کا خوف ہے فعل قلب کا ہے اور کہنا فعل زبان کا ہے خلاصہ طریق کا یہ ہوا کہ دل اور زبان کو تم درست کر لو باقی سب کام ہم کر دیں گے قلب ایک شے ہے اس کے متعلق صرف ایک شے بتلائی ہے کچھ جھگڑے کی بات نہیں ہے ایک نہایت مختصر کام فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا کر لو جیسے کسی شخص سے کہا جاوے کہ یہ بچاں گاڑیاں ہیں انکو ایک دم سے چلاؤ اور وہ سخت پریشان ہو کہ میں کس طرح چلاؤں یہ تو سخت مشکل ہے پھر اس کو طریق ایک بتلایا جاوے کہ اسی میں انجن لگا دو سب

گاڑیاں خود بخود چل پڑیں گے واللہ ایسی بے نظیر تعلیم ہے کہ کوئی حکیم کوئی فلسفی کوئی عاقل مثل نہیں لاسکتا اور کیوں نہ ہو وہ ایک مطب ہے ایسی ذات پاک کا جو انسان کے رگ پٹھوں کے ریشہ ریشہ سے واقف ہے اس لئے اس کی حالت کو دیکھ کر علاج بخوبی کیا ہے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ ان دونوں چیزوں کو اصلاح اعمال اور محو ذنوب میں دخل ہے یا نہیں تو بعد تامل یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے افعال کی ترتیب یوں ہے کہ اول قلب سے ارادہ پیدا ہوتا ہے اس کے بعد صدور ہوتا ہے گویا انجن قلب ہے تو اگر قلب درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو جائے گا بلکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو یہ دنیا کا سارا جہاز اور تمام بکھیرے سب کے سب قلب ہی کے خیال پر چل رہے ہیں یہ پہاڑ کی برابر عمارتیں یہ ہرے بھرے باغ یہ طرح طرح کے سامان سب کا انجن خیال ہی ہے اسی واسطے تو حدیث میں آیا ہے کہ ان فی الجسد مضغۃ اذا صلح صلح الجسد کلہ و اذا فسد فسد الجسد کلہ یعنی آدمی کے جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو تمام جسم بگڑ جاتا ہے اور یہ مسئلہ طبی قاعدہ سے بھی درست ہے اس لئے کہ امراض قلب تمام امراض میں بہت سخت ہیں اگر قلب صحیح اور قوی ہے تو اور امراض کو طبیعت خود دفع کر دیتی ہے اور اگر قلب میں ضعف اور مرض ہے تو اور جسد کتنا ہی قوی ہو سب بیکار رہے جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قلب کی درستی سے تمام اعمال کی درستی ہوتی ہے تو قلب کی درستی کس سے ہو؟ تو ہم دیکھتے ہیں کہ قلب کے بھی بہت سے افعال ہیں تو اگر حق تعالیٰ تمام افعال کا حکم فرمادیتے یا اجمالاً یہ فرمادیتے کہ اپنے قلب کو درست کر و تو اس صورت میں بھی نفس کو ایک مشقت ہوتی کہ قلب کو کس طرح درست کریں کیا رحمت ہے کہ قلب کے تمام افعال میں سے صرف ایک مختصر سی بات فرمائی کہ صرف ہمارا خوف اختیار کر لو باقی سب ہم درست کر دیں گے اور وجہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حاکم کا اگر ڈر دل میں بیٹھ

جاتا ہے تو اس کی مخالفت پر حرات نہیں ہوتی اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کا خوف کسی کے دل پر بیٹھ جائے تو اس سے گناہ نہ ہوں گے اور اعمال کی اصلاح ہو جائے گی اور گذشتہ سے توبہ اور آئندہ کے لئے عزم ترک بھی کرے گا یہ محذورِ نوب ہو اپنی معلوم ہو گیا کہ تقویٰ کو اصلاحِ اعمال و محذورِ نوب میں پورا دخل ہے اور تقویٰ اصلاحِ اعمال کے لئے بمنزلہ علت تامہ کے ہے۔

اب اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ ہر شے کے لئے کچھ موانع ہوتے ہیں اور کچھ ذرائع اس کی تحصیل کے ہوتے ہیں اسی طرح خوف کے لئے موانع بھی ہیں اور ذرائع کی تحصیل کے بھی موانع کو بیان کیا جاتا ہے اور طریقہ تحصیل آخر میں بیان کیا جاوے گا تو سمجھنا چاہیے کہ خوف سے روکنے والی صرف دو چیز ہیں اول تو عدم ایمان دوسرے تسویلِ شیطانی عدم ایمان تو ظاہر ہے کہ بفضلِ تعالیٰ یہاں نہیں ہے اس لئے اُس کے متعلق تو کچھ کلام کرنا ضروری نہیں البتہ تسویلِ شیطانی میں ابتلائے عام ہو رہا ہے اس کو بیان کیا جاتا ہے کہ شیطان نے سب کو یہ پٹی پڑھا رکھی ہے کہ میاں جو کچھ کرنا ہے کہ لو اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے آخر میں تو یہ کہیں گے سب بخشدیں گے۔

چنانچہ ارشاد بھی ہے قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ تو سن لیجئے کہ حق تعالیٰ بیشک غفور الرحیم ہے لیکن غفور الرحیم کے وہ معنی نہیں ہیں جو یہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ غفور الرحیم کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ نافرمانیاں کر چکے ہیں اور نادام ہیں لیکن اُن کو یہ تردد ہوتا ہے کہ آئندہ کے لئے تو خیر یہ تدبیر ہے کہ گناہ نہ کریں لیکن گذشتہ کثرت کی اصلاح کیسے ہو تو ان کے لئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ گذشتہ گناہوں کو بخشنے والا ہے چنانچہ شانِ نزول میں اسی خیال کے جواب میں نازل ہونا اس آیت کا مصداق مذکور ہے پس یہ آیت گناہانِ ماضی کے لئے ہے نہ یہ کہ آئندہ کے لئے بھی گناہ کی اجازت دے رہے ہیں۔ اب لوگ مستقبل کے لئے بھی اسی آیت کو اپنا متمسک بناتے ہیں یہ سراسر غلطی ہے یاد رکھو کہ توبہ کی مثال مرتبہ کی تھی

اور گناہ کی مثال آگ کی سی ہے مرہم تو اس لئے ہے کہ اتفاق سے اگر جل جاوے تو مرہم لگا دیا جاوے اس لئے نہیں ہے کہ اس اعتماد پر کہ ہمارے پاس مرہم ہے آگ میں گھسا کر یہی جس شخص کے پاس نمک سلیمانی ہو اس کو یہ کب روا ہے کہ جان جان کر بہت سا کھایا کرے نمک سلیمانی تو اس واسطے ہے کہ اگر اتفاق سے بہت کھایا جائے تو نمک سلیمانی کھالیا جاوے اس سے ہضم ہو جاوے گا اور ایسا کہے گا تو ایک روز جان سے ہاتھ دھوئے گا۔ اسی طرح جو شخص تو بہ کے اعتماد پر گناہ کرتا رہے گا ایک دن عجب نہیں وہ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے غرضیکہ تو بہ کے بھروسہ گناہ کرتا بہت حماقت ہے۔

اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ طریقہ اصلاح اعمال و محو ذنوب کا فقط اتنا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کر لو تو اسی سے تمام اعمال درست ہو جاویں گے اور زبان کی درستی بھی اگرچہ اس میں داخل ہے مگر پھر زبان کی درستی کو استقلالاً طریقہ کا جزو کیوں بنایا گیا اس میں کیا راز ہے پس بجائے اتقوا اللہ و قولوا قولا سدیداً کے یوں فرماتے یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ یسدد لکم لسانکم ویصلح لکم اعمالکم الخ یوں نہیں فرمایا بلکہ و قولوا قولا سدیداً کا اتقوا اللہ پر عطف کیا اور اس کو مستقل طریقہ قرار دیا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ اعمال بہت سے ہیں ایک وہ جو ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ سے ہوتے ہیں ایک وہ جو زبان سے ہوتے ہیں اور ان دونوں قسموں میں کئی قسم کا تفاوت ہے۔

ایک یہ کہ سوائے لسان کے اور سب جوارح عمل کھنہ سے تھک جاتے ہیں پاؤں تھک جاتا ہے کثرت سے چلنے سے، ہاتھ تھک جاتا ہے اُن اعمال سے جو ہاتھ سے کئے جاتے ہیں آنکھ تھک جاتی ہے زیادہ دیکھنے سے۔

مگر یہ لسان بولنے سے نہیں تھکتی اگر لاکھ برس تک بک بک کر تو ہرگز نہ تھکے گی۔ یہ بات دوسری ہے کہ بکثرت بولنے سے دل کے اندر بے رونقی سی پیدا ہو کر بولنے سے نفرت ہو جاوے لیکن زبان کو فی نفسہ کوئی تکان نہ ہو گا اس معلوم

ہو کہ لسانی اعمال سب جوارح کے اعمال کعدد میں زیادہ ہوں گے پس گناہ بھی اس سے زیادہ ہوں گے ایک تو یہ تفاوت ہوا دوسرے یہ کہ زبان مثل بزمِ رخ کے ہے درمیانِ قلب و جوارح کے قلب سے بھی اس کو مشابہت ہے اور جوارح سے بھی اور یہ مشابہت حلقی بھی ہے اور باطنی بھی حلقی یہ کہ قلب بالکل مخفی و مستور ہے اور جوارح بالکل ظاہر اور زبان مستور من و جہر و مکشوف من و جہر ہے چنانچہ شارع نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے کہ صایم اگر منہ میں کوئی چیز لے کر بیٹھ جائے روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں کے مکشوف ہونے کا اعتبار کیا گیا جو ف میں وہ چیز نہیں گئی اور اگر تھوک نکلے تو بھی روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں مستور ہونے کا اعتبار کیا گیا جو ف سے جو ف میں ایک چیز چلی گئی اور غسل میں کلی کرنا فرض ہوا یہ مکشوف ہونے کا اعتبار فرمایا اور باطنی مشابہت یہ ہے کہ جیسے قلب کی اصلاح سے تمام بدن کی اصلاح ہوتی ہے اسی طرح زبان کی اصلاح سے تمام اعمال جوارح کی اصلاح ہو جاتی ہے جو شخص ساکت ہو کر بیٹھ جاوے اس کے ہاتھ سے نہ ظلم ہو گا نہ زیادتی ہوگی نہ کسی سے لڑائی ہوگی نہ تکرار ہو گا اس لئے زبان چلانے ہی سے لذت ہاتھ پاؤں تک پہنچتی ہے ان سب سے حدیث کی بھی تنویر ہو گئی اذا صبح ابن ادم فان الاعضاء کلھا تکفر للسان فتقول ایتق الله فینا نانا نحن بک فان استقممت استقمنا وان اعوججت اعوججنا یعنی جس وقت ابن آدم صبح کرتا ہے تو اس کے تمام اعضاء زبان کو قسم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (اے زبان) ہمارے بارے میں اللہ سے ڈر کیونکہ ہم تیرے ساتھ ہیں پس اگر تو راست ہوگی تو ہم سب راست رہیں گے اور اگر تو کج ہوگی ہم سب کج ہو جائیں گے۔ تیسرا تفاوت دیگر جوارح اور لسان میں یہ ہے کہ زبان قلب کی معتبر ہے زبان سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس کی پوری حالت قلب کی معلوم ہو جاتی ہے اور اگر ساکت رہے تو کچھ حال معلوم نہ ہو گا کہ یہ شخص کیسا زبان ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص متواضع ہے یا متکبر ہے قانع ہے یا حریص عاقل ہے یا احمق دشمن ہو یا دوست خیر خواہ ہے یا بدخواہ بخلا ہاتھ پاؤں کے سب شیعہ ہو سکتا ہے ایک ہی طرح کا فعل ہاتھ پاؤں سے دوست دشمن سے صادر ہو سکتا ہے

مثلاً قتل واقع ہوا تو اس سے فیصلہ نہیں کر سکتے یہ کہ قاتل دشمن ہی تھا۔ ممکن ہے کہ دوست ہو اور وہ کسی اور کو قتل کرنا چاہتا ہو اور ہاتھ چوک گیا ہو چنانچہ ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ ایک بھائی نے بندوق چلائی دوسرا بھائی کی آنکھ میں ایک چہرہ جا لگا اسی طرح سے مار پیٹ کبھی عداوت ہوتی ہے کبھی تادیب کے لئے ہوتی ہے غرض ایک شق متعین کرنے کیلئے خارجی قرائن کی ضرورت ہوتی ہے بخلاف لسان کے کہ یہ پوری نامبِ قلب کی ہے۔

چوتھا تفاوت یہ ہے کہ تعلقات دو قسم کے ہیں ایک اپنے نفس کے تھادوسرے غیروں کے ساتھ جو تعلق اخوت محبت عداوت کا ہو گا وہ بدولت زبان کے ہو گا اور یہ ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں ہم کو دوسروں کی امداد کی ضرورت ہے بغیر دوسروں کی امداد کے ہم رکعت تک نہیں پڑھ سکتے اس لئے کہ نماز کا طریقہ ہم کو کسی نے بتلایا ہو گا اس لئے ہم نماز پڑھتے ہیں قرآن شریف کسی نے پڑھایا اس لئے ہم پڑھتے ہیں روزہ کی فرضیت اور اس کی تاکید اور اس کی ماہیت کسی نے بتائی اس لئے روزہ رکھتے ہیں علیٰ ہذا تمام اعمال صالحہ اور ان بتلانے سکھانے والوں نے بلا تعلق تو بتلایا نہیں اور وہ تعلق پیدا ہوا ہے لسان سے اور نیز تعلیم بھی ہم کو بذریعہ لسان کے کی گئی ہے تو اس اعتبار سے لسان کو تمام اعمال صالحہ میں داخل ہو گا گویا یہ تمام اعمال صالحہ بدولت اس لسان ہی کے ہم سے صادر ہوتے ہیں جبکہ دیگر جوارح اور لسان میں اس قدر تفاوت ہوئے اور لسان کو اعمال صالحہ کے وجود میں ایک دخل عظیم ہوا اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اس کو مستقل جز و طریقہ اصلاح کا بنا دیا اگرچہ تقویٰ سے جو درست ہوگی درستی لسان بھی اس کا فرد عظیم ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے ذمہ دو کام ہوئے ایک خدا کا خوف دوسرے زبان کی اصلاح ان دونوں کے جمع ہونے سے آئندہ کے لئے اعمال کی اصلاح ہوگی اور گزشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

اور یصلح کی نسبت جو اپنی طرف فرمائی حالانکہ بظاہر اصلاح اعمال کامِ عبد کا ہے تو وجہ اس کی یہ اشارہ ہے کہ ہم کو اپنے اوپر نظر نہ ہونا چاہیے اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ کام ہم نے کیا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ نازمت کہ وجو کچھ کرتے ہیں ہم کرتے ہیں اور خیر اگر کچھ ہمارا اختیار میں بھی ہے تو یہ ہے کہ مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن پوری درستی جو مفہوم ہے یصلح

کا یعنی یہ کہ جیسے چاہیے اس طرح کی نماز پڑھنا اور قلب کا اس میں حاضر ہو جانا یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور اس نسبت میں ایک اور نکتہ ہے وہ یہ کہ گویا فرماتے ہیں کہ یہ اعمال تو تم نے کر لئے لیکن ہم اس کی اصلاح کر کے فرشتوں کی معرفت پیش کر دیں گے جیسے کچھ سے کہا کرتے ہیں کہ یہ شے اٹھالاؤ اور وہ اٹھا نہیں سکتا تو خود اٹھاتے ہیں اور اس کا ہاتھ بھی لگوا لیتے ہیں اور اٹھانے کی نسبت ان کی طرف کرتے ہیں اور اس پر انعام دیتے ہیں ایسی ہی ہمارا نماز روزہ ہے کہ خود توفیق دیتے ہیں خود رکھواتے ہیں اور خود ہی انعام عطا فرماتے ہیں۔ اللہ اکبر کس قدر رحمت ہے اور دوسری شے جو اتقوا اللہ الخ پر مرتب فرمائی وہ یہ غفرکم ذنوبکم ہے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجائے غفرکم ذنوبکم کے یحجبکم ذنوبکم فرماتے یعنی تم کو گناہوں سے بچالیں گے یہ نہیں فرمایا اس لئے کہ گناہوں سے بچانا تو بصلح لکھ میں آچکا ہے ذنوب ماضیہ باقی تھی انہی نسبت فرمایا کہ ان کی بھی فکر نہ کرو ان کو بھی اللہ تعالیٰ بخوف فرمادیں گے۔

اب میں آپ کو خوف (کہ جس سے تمام اعمال درست ہو جاتے ہیں) اس کے حاصل ہونے کا طریقہ بتلاتا ہوں اور وہ طریقہ گویا ایک گرہ ہے اور میرے تمام دعوظ کا گویا خلاصہ ہے اور وہ اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ وہ بھی حق تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے وہ یہ ہے ولتنتظر نفس ما قدمت لقد یعنی فکر آخرت کیا کرو اور فکر آخرت کا طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر لو مثلاً سوتے وقت روزمرہ بلا ناغہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ معاد کیا ہے اور مر کر ہم کو کیا پیش آنے والا ہے مرنے سے لیکر جنت میں داخل ہونے تک جو واقعات ہونے والے ہیں سب کو سوچا کرو کہ ایک دن وہ آئے گا کہ میرا اس دار فانی سے کوچ ہو گا سب سامان مال اسباب باغ و کوکبا کبر اولاد بیٹا، بیٹی، مال، باپ، بھائی، خولش، اقارب، دوست، دشمن سب یہیں رہ جاویں گے تنہا سب کو چھوڑ کر قبر کے گڑھے میں جالیٹوں گا اور وہاں دو فرشتے آویں گے اگر میرے دن بھلے میں تو ابھی صورت میں ورنہ خدا نخواستہ ڈراونی صورت میں نہایت ہولناک آواز سے اگر سوال کریں گے پس اے نفس اس وقت کوئی تیرا مددگار نہ ہو گا تیرے اعمال ہی ہاں کام آویں گے اگر سوالات کے جواب درست ہو گئے سبحان اللہ جنت کی طرف کی کھڑکی کھل جاویں گی اور اگر خدا نخواستہ امتحان میں ناکام رہا تو قبر حفرة من حصن النار ہوگی اس کے بعد تو قبر سے اٹھایا جائیگا اور نامہ اعمال اٹھائے جاویں گے

حساب کتاب کیلئے پیش کیا جاویگا، بل صراط پر چلنا ہوگا اے نفس تو کس دھوکہ میں ہے اور ان سب واقعات پر تیرا ایمان ہے اور یقیناً جانتا ہے کہ یہ ہو کر رہیں گے پھر کیوں غفلت ہے اور کس وجہ سے گناہوں کے اندر دلیری ہے کیا دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے اے نفس تو ہی اپنا غمخوار بن اگر تو اپنی غمخواری نہ کرے گا تو تجھ سے زیادہ کون تیرا خیر خواہ ہوگا اسی طرح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ ان واقعات کو تفصیل سے سوچا کرے میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ انشاء اللہ جی ہی روز کے بعد دیکھو گے کہ خوف پیدا ہو گیا اور خوف پیدا ہونیکے بعد آپ کو ماضی سے توبہ کی فکر ہوگی اور آئندہ کے لئے اطاعت کی توفیق ہوگی اس وقت آپ کو مشاہدہ ہوگا اتقوا اللہ پر کیسے اصلاح اعمال و نمود و نوب مرتب ہو گئے آگے فرماتے ہیں ومن یطیع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزاً عظیماً یعنی جو شخص اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے وہ بیشک بڑی کامیابی کو پہنچا بطبع میں اشارہ ہے کہ جو شخص خوشی سے کہنا مانے اس لئے کہ یہ طلوع سے مشتق ہے اور خوشی سے کہنا مانا بدو ن محبت اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہوتا۔

اور اللہ رب کے حاصل ہونے کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یاد کرنا ہے اس کیلئے بھی ایک وقت مقرر کر کے سوچا کرو کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی کس قدر نعمتیں ہیں چند روز کے بعد آپ کے مشاہدہ ہوگا کہ ہم سرتاسر عنایات اور نعمتوں میں غرق ہیں اس سے آپ کے قلب میں حق تعالیٰ کی محبت اور اپنی ناکارگی اور تقصیر جاگزیں ہوگی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ بطبع کا تعلق آپ سے بھی ہے آپ کے ساتھ محبت کا طریقہ بھی یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بہار لئے مشقتیں اٹھائی اور اپنی امت پر شفقت فرمائی اس کو سوچا کرو جب محبت پیدا ہوگی۔ اطاعت خوشی ہوگی اور ہر محبت ہوگی اور پہلے جو طریقہ بیان کیا اس سے خوف ہوگا یہ دونوں شے آپ کے دین دنیا دونوں درست کر دیں گے اور بڑی کامیابی سے یہی مراد ہے اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا چاہئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اصلاح اعمال کی توفیق عطا فرماویں و صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔ والسلام

ناظرین! آپ استدعا ہے کہ جماع و غلطی اور عبد المنان کیلئے بھی دعائے حسن خاتمہ فرماویں تاریخ تحریر ۱۵ شوال ۱۳۸۸ فقط مقتدے بالخیر

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُغَوِّعُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً
(رواه البخاری)

دعوات عبیدت جلد دوم

کا
وعظ ششم ملقب بہ

احکام العشر الاخیرہ

اسشارات

حکیم الامتہ مجدد الملتہ حضرت مولانا محمد اشرف علی صابو تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:- محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ راجپوتانہ کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دعوات عبدیت جلد دوم کا

وعظ مشتم ملقب بہ

احکام العشر الاخرہ

این	مٹے	گھر	کیف	ماذا	من ضبط	المستقون	استات
سہاں ہوا	سب ہوا	سزا ہوا	سچ ہوا	سچ ہوا	سچ ہوا	سچ ہوا	متفرقات
جامع مسجد	۲۱ رمضان ۱۳۳۵ھ	نماز جمعہ سے نماز عصر تک	بیٹھ کر	احکام عشرہ اخیرہ رمضان	مولوی سید احمد صاحب	تقریباً ۱۰۰	دسیات کے لوگ بکثرت تھے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله فضله ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونوكل عليه ونعوذ بالله من شره وانفسنا من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا و مولانا محمد عبده ورسوله صلى الله عليه وعلى آله واصحابه و بارئ وسل - اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم في شهر رمضان
الذي اُنزل فيه القرآن هدى للناس وبينات من الهدى والفرقان -

یہ ایک آیہ کا ٹکڑا ہے اس آیت میں خدا نے تعالیٰ نے رمضان کی ایک فضیلت کا بیان فرمایا ہے گزشتہ جمعہ میں رمضان کے ضروری آداب و حقوق کا بیان ہو چکا ہے آج رمضان کے ایک خاص جزو یعنی عشرہ اخیرہ کے متعلق بیان کرنا مقصود ہے اس آیت سے بظاہر عشرہ اخیرہ کے مضمون کو کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا لیکن غور کیا جائے تو

عشرہ اخیرہ سے اس آیت کا تعلق معلوم ہو جاوے گا خدا تعالیٰ نے اس آیت میں رمضان کی جو فضیلت بیان کی ہے اسی فضیلت میں غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ وہ فضیلت عشرہ اخیرہ کے لئے بدرجہ اولیٰ و اتم ثابت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ماہ رمضان ایسا مہینہ ہے جس میں ہم نے قرآن نازل کیا ایسا اور ایسا ہے سو اس آیت سے اس قدر معلوم ہوا کہ قرآن کا نزول ماہ رمضان میں ہوا لیکن ظاہر ہے کہ رمضان تین دن کے زمانہ کا نام ہے اور اس آیت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس طویل زمانہ کے کس جزو میں نزول ہوا ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے ساتھ دوسری آیت کو بھی ملا لیں تو دونوں کے مجموعہ سے تعین وقت بھی ہم کو معلوم ہو جاوے گی۔ سو دوسری آیت فرماتے ہیں اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ پس ان دونوں آیتوں کے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآن مجید کا نزول ماہ رمضان کی شب قدر میں ہوا۔ رہا یہ شبہ کہ ممکن ہے کہ شب قدر رمضان میں نہ ہو تو اس صورت میں دوسری آیت کا ضم مفید نہ ہوگا سو اس کا جواب یہ کہ اول تو شب قدر کا رمضان میں ہونا حدیث میں موجود ہے اس سے قطع نظر اگر ہم ذرا فہم سے کام لیں ان دونوں آیتوں سے ہی معلوم ہو جاوے گا کہ شب قدر رمضان ہی میں ہے اس لئے کلام مجید کا نزول دو طرح ہوا ہے ایک نزول تدریجی جو کہ ۲۳ برس میں حسب ضرورت نازل ہوتا رہا اور جس کا ثبوت علاوہ کتب سیر کے خود کلام مجید سے ہوتا ہے لَوْ لَا اُنْزِلَ عَلَیْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِیْلًا کہ یہ آیت مشرکین نصاریٰ کے اس اعتراض پر نازل ہوئی تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں تو ان کو کوئی کتاب دفعۃً پوری کی پوری آسمان سے کیوں نہیں دی گئی جس طرح موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دی گئی تھی۔ خدا تعالیٰ کفار کے اعتراض کا جواب ارشاد فرماتے ہیں کہ كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ جس کا خلاصہ یہ کہ ہم نے کلام مجید کو بتدریج ٹکڑے ٹکڑے کیے اس لئے نازل کیا ہے کہ اس تدریج کے ذریعہ سے آپ کو دل کی تشبہت اور اس کو محفوظ کر لینا اور سمجھ لینا آسان ہو جائے۔ واقعی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس قدر تشبہت فواد اور ضبط و فہم بتدریج نازل کرنے میں ہو سکتا ہے نزول واقعی میں نہیں ہو سکتا

دفعہ نازل کرنے میں احکام جزئیات کا سمجھنا امت کے لئے اس لئے دشوار ہوگا کہ جب دفعہ نازل کیا جائیگا تو یقیناً اس کے احکام امور کلیہ ہوں گے اور ان پر جزئیات کو منطبق کرنا پڑے گا سو جب تک کہ نبی زندہ ہیں اس وقت تک سوال کرنے سے بآسانی تعلیم ہو جاوے گی لیکن نبی کی وفات کے بعد چونکہ ان کا منطبق کرنا محض امت کے اجتہاد پر مرہ جاوے گا اس لئے بہت سی غلطیوں کا ہونا ممکن ہے جیسا کہ نصاریٰ اور یہود سے ہوئیں اس تفاوت کی امثال ہے کہ ایک مریض کسی طبیب کے پاس آوے اور اپنی حالت بیان کر کے حکیم سے کہے کہ میں آپ کے پاس تو رہ نہیں سکتا نہ میں وقتاً فوقتاً آکر آپ کو اپنی حالت کی اطلاع کر سکتا ہوں آپ میری حالت کے مناسب کئی نسخہ مجھے لکھ دیجئے جوں جوں میری حالت متغیر ہوتی جاوے اور مرض میں کمی یا بیشی ہوئیں اس کے مناسب نسخوں کو بدل کر استعمال کرتا جاؤں پس اس صورت میں اگرچہ طبیب کتنا ہی ماہر ہو اور کتنے ہی غور و خوض سے نسخوں کی تجویز کرے لیکن اس مریض کی حالت اس مریض کے برابر بہتر نہیں ہو سکتی جو کہ روزانہ طبیب کے پاس آتا ہے اپنی حالت بیان کرتا ہے پچھلا نسخہ دکھلاتا ہے اور روزانہ اس میں تغیر و تبدل کمی و بیشی کر لیا جاتا ہے اس لئے اگرچہ پہلی صورت میں تمام تغیرات کے لئے طبیب نے نسخے لکھ دیئے لیکن تغیرات تعین اور ان کا فہم یہ محض مریض کی رائے پر رہا جو کہ رائے العلیل ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے ممکن ہے کہ زیادتی صفر کی ہو اور وہ سودا کا بیجان سمجھ جائے اور حسی سنبھالے کی ہو اور وہ مرض کی کمی سمجھ جاوے اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ جس قدر عام اور تمام قارہ جزئی جزئی حالت کے دیکھنے اور حسب ضرورت تغیر و تبدل کرنے میں ہے امور کلیہ سمجھانے میں استفادہ نہیں اس میں بہت سی غلطیاں ممکن ہیں بس خدا کا ہم پر بڑا فضل ہے کہ اس نے کلام مجید کو جزو راجزہ نازل فرمایا کہ علماء امت نے اس کو اچھی طرح سمجھا اس کے اسباب نزول پر پوری نظر کی اور اس کو اپنے ذہن میں لے لیا یہاں بظاہر دوشیہ ہوتے ہیں اول یہ کہ جب تدبیر نزول میں اس قدر فائدہ اور فہمی نزول میں اس نقصان کا احتمال ہے تو خدا نے قرآن سے پہلی کتب کو دفعہ کیوں نازل فرمایا جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ مصلحت اور فرق غلط ہے یا اہم سابقہ کے لئے مصلحت کی رعایت نہیں کی گئی اس کا جواب تو یہ ہے کہ شرائع سابقہ چونکہ چند

روزہ تھیں اور اس زمانہ کے اکثر ایام میں ان کے نبی یا ان کے خاص اصحاب ان میں موجود رہتے تھے جس سے تمام جزئیات حل ہو جاتی تھیں اس لئے کتب سابقہ کا دفعہ نازل ہونا ان لوگوں کے لئے مضر نہیں ہوا دوسرا شبہ یہ ہے کہ باوجود قرآن کے تدریجاً نازل ہونے کے فہم قرآن میں غلطیاں اب بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اختلاف مجتہدین سے صاف معلوم ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس اختلاف اور خطا میں اور اہم سابقہ کے اختلاف اور غلطیوں میں بڑا فرق ہے ان سے زیادہ اور مضر غلطیاں ہوئی تھیں اور اس امت سے ایسی غلطیاں نہیں ہوئیں وجہ یہ کہ اسباب نزول نصوص کی تفسیر ہے جس کو تعین مراد میں خاص دخل ہے اور ظاہر ہے کہ تعین مراد کے بعد کی غلطی خفیف ہوگی اور عدم تعین مراد کی صورت میں عظیم ہوگی۔ اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ بلا تعین مراد ان لوگوں پر احکام کیسے متوجہ ہوئے بات یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے بیان سے تعین ہو جاتی تھی سوا دل تو انھوں نے اس کی حفاظت نہیں کی دوسرے یہ کہ بیان بھی مواقع سوال ہی میں ہوتا ہے اور سوال کا ہر جگہ اذن تھا مگر قلت توجہ سے ان لوگوں کو اس کی نوبت بھی کم آئی اور اس امت میں جو تعین مراد کے بعد اختلاف پیش آیا اس میں حکمت تھی توسیع مسالک کی پس وہ رحمت ہوا پس دونوں میں فرق ظاہر ہو گیا یہ ایک جملہ معترضہ تھا مقصود یہ ہے کہ کلام اللہ کا نزول دو طرح کا ہے ایک نزول تو یہ ہے جس کو تدریجی کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس آیت شہر رمضان الذی میں یہ نزول مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ صرف رمضان یا لیلة القدر میں نہیں ہوا بلکہ ۲۳ برس میں ہوا اور دوسرا وہ نزول ہے جو کہ دفعہ ہوا ہے اور اس آیت میں بھی مراد ہے اور یہ نزول اس عالم دنیا میں نہیں ہوا جس میں کہ نزول تدریجی ہوا ہے بلکہ یہ نزول عالم غیب میں ہوا ہے یعنی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اور یہ دونوں عالم کے جز ہیں اور اس کے ذی لہذا ہونے کو بعید نہ سمجھا جاوے اس میں اس قدر وسعت ہے کہ یہ عالم دنیا اس سے وہ نسبت رکھتا ہے جو سوئی پر لگا ہوا ایک قطرہ سمندر سے نسبت رکھتا ہے یعنی یہ عالم دنیا اس کے سامنے مثل ایک قطرہ کے ہے اور وہ اس کے اعتبار سے مثل سمندر کے ہے۔ اہل کشف نے لکھا ہے کہ دونوں عالموں میں وہی نسبت ہے جو کہ حجم مادہ

اور عالم دنیا میں ہے بچہ اول رحم مادر میں رہتا ہے اور اس کیلئے وہ ایک عالم ہوتا ہے اور اس سے اس قدر مانوس ہوتا ہے اگر شاید ہاں سے اس کے لئے لیکر عالم دنیا میں لایا جائے تو وہ کبھی گوارا نہ کرے اور محل جانے لیکن اگر اس کو کسی طرح وہاں سے نکال لیا جاوے جیسا کہ اسی طرح لایا جاتا ہے اور عالم دنیا میں وہ یہاں کی رونق چہل پہل یہاں کی آبادی اور معورہ دنیا کو دیکھے تو عالم رحم اس کو بالکل ہیچ اور عدم معلوم ہونے لگے اسی طرح اہل دنیا جو کہ اس عالم میں محبوس اور اسیر ہیں جنہوں نے آنکھ کھولنے کے وقت سے آنکھ بند کرنے تک اس کے سوا اور کسی عالم کو دیکھا ہی نہیں جب ان سے اس عالم کو چھوڑ دینے اور دوسرے عالم میں چلنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ سخت پریشان ہوتے ہیں ان کا دل مضطرب ہوتا ہے اور وہ کسی طرح اس عالم کی جدائی کو گوارا نہیں کرتے ہاں وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے عیناً یا ذوقاً علم مکاشفہ دیا ہے اور وہ اس عالم کو مشاہدہ کر چکے ہیں اور ان کو اس کی جدائی کا نہ قلق ہوتا ہے نہ وہ اس سے گھبراتے ہیں بلکہ وہ اس عالم سے انتقال کے متمنی اور آرزو مند رہتے ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پہلے لوگوں کے مقابلہ میں یہ لوگ زیادہ مقبول اور صاحب کمال ہیں اس واسطے کہ ان کی فضیلت یا تو اشتیاق کی وجہ سے ہو سکتی ہے یا کشف کی وجہ سے سو اشتیاق کی وجہ سے تو اس لئے یہ صاحب فضیلت نہیں کہ صاحب عالم غیب اور اس کسب و لذائذ کو دیکھ چکے ہیں پھر اس کی طرف رغبت کرنا اور اس کا مشتاق ہونا کیا کمال کی بات ہے خوشنما باغیچہ کو جو شخص بھی دیکھے گا اس کی سیر کا متمنی ہو گا اور کشف کی وجہ اس لئے صاحب فضیلت نہیں کہ کشف دلیل بزرگی اور مقبولیت کی نہیں اس کی بنا محض مجاہدہ اور کثرت ریاضت پر ہے اکثر ہندو کو بھی ہونے لگتا ہے اور مرنے کے بعد تو سب ہی کو ہو گا۔ البتہ اہل کشف کو اس اعتبار سے ضرور فضیلت ہے کہ دنیا میں رہ کر جو ذوق ان کو حاصل ہے دوسروں کو نہیں۔ اور کشف کی حقیقت معلوم ہو جائے سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بعض نادان قف لوگ جو کشف کے درپے ہوتے ہیں اور اس کو بڑی چیز سمجھتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے بلکہ اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہو گا کہ کشف نہ ہونے کی صورت میں اگر عمل ہو تو وہ زیادہ کمال کی بات ہے چنانچہ خداوند جل و علا جائے مدح فرماتے ہیں الذین یؤمنون بالغیب اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سے

فرمایا ائی الخلق اعجبوا ایماناً یعنی تمام خلق میں سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے صحابہ نے عرض کیا الملائکۃ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی فرشتوں کا ایمان سب سے زیادہ عجیب ہے آپ نے فرمایا کہ ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ ہوتی جبکہ ہر وقت کلام و احکام سے مشرف ہوتے ہیں صحابہ نے کہا کہ پھر انبیاء علیہم السلام کا آپ نے فرمایا بھلا وہ کیوں ایمان لاتے ہر وقت تو ان پر وحی نازل ہوتی ہے، صحابہ نے کہا کہ پھر ہمارا آپ نے فرمایا کہ تم کیوں ایمان نہ لاتے ہر وقت مجھے دیکھتے ہو مجھ سے سنتے ہو آخر صحابہ نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر کون لوگ آپ نے فرمایا وہ لوگ جو میرے بعد آویں گے جنہوں نے نہ مجھ کو دیکھا ہو گا نہ نزول قرآن کی کیفیت دیکھی ہو گی محض چند لکھے ہوئے کا غزدیکھ کر ایمان لاویں گے ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے مقصود اس سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ مکاشفہ کی نسبت عدم مکاشفہ کی حالت زیادہ افضل اور اسلم ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مطلقاً غیر مکاشفین مکاشفین سے افضل ہیں اگر اہل کشف میں اور فضائل بھی ہوں جیسے انبیاء علیہم السلام تو وہ افضل ہوں اور اعجب ہونا دوسری بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو عالم غیب منکشف نہیں ہوا وہ لوگ اس دنیا کو چھوڑتے وقت گھبراتے ہیں اور مضطرب ہوتے ہیں جالینوس کے متعلق مشہور ہے کہ جب مرنے لگا تو یہ تمنا کرتا تھا کہ میری قبر میں ایک سو رنخ ہے کہ دنیا کی ہوا آتی رہے لیکن غیر مکاشفین اگر اہل ایمان کا ہوں تو گوان کو طبعاً اس عالم کو چھوڑنا گراں گزے اور وہ موت سے گھبراویں جیسا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کنا یکرا الموت مگر مرنے کے بعد جب اس عالم کی سیر کریں گے اور اس کو دیکھیں گے اور اس کی عظمت آنکھوں کے سامنے ہوگی تو ان کی وہی حالت جو کہ رحم مادر سے اور عالم دنیا دیکھ کر بچے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ اس کو بھول جاتا ہے۔

اور عالم دنیا کے سامنے اپنے اس پہلے عالم کو ہیج بلکہ لاشے محض سمجھنے لگتا ہے حکیم سنائی اسی کی نسبت فرماتے ہیں۔

آسمانہا ست درو لائت جان کارمائے آسمان جهان
در رہ روح پست وبالہا هست کوہ ہائے بلند و صحرا ہا ست

روح کے ملک میں بہت سے آسمان ہیں جو اس دنیا کے آسمانوں کو چلانے والے ہیں
روح راستے میں بھی گڑھے اور ٹیلے ہیں اور بہت سے اونچے پہاڑ اور جنگلات ہیں)

غرض وہ عالم جب ذی اجزاء ہے اور یہ دفعی نزول اسی عالم کے ایک جز سے دوسرے
جز میں ہوا ہے اور اسی کی نسبت کلام مجید میں ایک جگہ شہر رمضان الذی انزل
فیہ القرآن فرمایا اور دوسری جگہ انا انزلنا فی لیلة القدر فرمایا اور مراد دونوں
مقام میں نزول دفعی ہے جیسا اوپر معلوم ہوا تو ثابت ہوا کہ لیلة القدر رمضان میں ہے
کیونکہ اگر لیلة القدر غیر رمضان میں ہو تو کلام مجید کی آیتوں میں تعارض لازم آدیکھا
کہ ایک آیت سے دفعی نزول رمضان میں اور ایک جگہ غیر رمضان میں ثابت ہو گا جو کہ
محال ہے اور حدیثوں سے بھی شب قدر کا عشرہ اخیرہ میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔ پس
جب شب قدر میں نزول ہوا تو عشرہ اخیرہ میں نزول ثابت ہو گیا اور یہی مناسب ہے
اس آیت کو عشرہ اخیرہ کے ساتھ اور رمضان کی فضیلت کے ساتھ عشرہ اخیرہ کی فضیلت
بھی اس آیت سے ثابت ہو گئی اور فضیلت بھی بہت بڑی کہ اس میں قرآن کا
نزول ہوا ہے کیونکہ قرآن ایک عظیم الشان چیز ہے اس لئے جس زمانہ میں نازل
ہو گا وہ زمانہ بھی ضرور مبارک اور مشرف ہو گا اور اس فضیلت کی قدر کوئی
عشاق کے دل سے پوچھے کہ جس زمانہ میں ان کو محبوب کے خط کی زیارت ہوتی
ہے وہ زمانہ ان کے نزدیک کس قدر معزز و مشرف ہوتا ہے قرآن شریف
بھی کلام خداوندی ہے اور خدا تعالیٰ محبوب حقیقی ہیں پس وہ زمانہ کہ جس میں
محبوب حقیقی کا کلام نازل ہو کیوں مبارک اور مشرف نہ ہو گا منظوف کے شرف
سے ظرف کو بھی ضرور شرف ہوا کرتا ہے چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں۔

گفت معشوقے بعاشق کا ی فتا تو بعزبت دیدہ بس شہر ہا
پس کد امی شہرازا نہا خوشتر است گفت آن شہرے کہ درے دلبر است
(ایک معشوق نے اپنے عاشق سے کہا کہ تو نے اپنے سفر میں بہت سے شہر دیکھے ہیں تو ان میں سے کون سا
شہر بہتر ہے۔ عاشق نے جواب دیا کہ وہی شہر ہے بہتر جس میں معشوق موجود ہے)

دیکھو اگر کسی عاشق کو کنوے کے اندر وصال حبیب ہو تو وہ اس کنوے کو گنوان سمجھے گا اس کے دل میں اس کنوے کی عظمت ایک پھولوں سے بھرے چمن سے بھی زیادہ ہوگی اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس زمانہ کو بھی شرف ہے اکثر وہ کسی مظروف ہی کی شرف کی وجہ سے ہے یہی وجہ ہے کہ جمعہ کا دن اور ایام سے افضل ہے کیونکہ اس دن میں ایک ایسا مظروف موجود ہے جو کہ دوسرے ایام میں نہیں اکثر لوگ جمعہ کی فضیلت پر اعتراض کیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ کیا وجہ جمعرات کو وہ فضیلت کیوں حاصل نہیں جو جمعہ کو حاصل ہے وہی ۱۲ گھنٹہ اس میں ہیں وہی ۱۲ گھنٹہ اس میں ہیں وہی ایک دن جمعرات میں ہے وہی ایک دن جمعہ میں ہے حالانکہ یہ اعتراض بالکل ہی لغو ہے کیونکہ اشتراک فی الساعات اور تشابہ فی الظاہر ہے اور یہ لازم نہیں آتا کہ جو ایک کی حالت ہو وہی دوسرے کی بھی ہو کیا اگر کسی شخص کی بہن اور بیوی بالکل ہٹم شکل ہوں اور سامان زینت میں بھی دونوں برابر ہوں تو کیا ان میں حلال و حرام کے فرق ہونے کو خلاف عقل کہا جاوے گا اور کیا یہ شخص دونوں سے برابر برتاؤ کرے گا اور کیا اس شخص کے دل میں دونوں کی محبت ایک قسم کی ہوگی اور جو علاقہ کشش بیوی کے ساتھ ہے وہ بہن کے یا ماں کے ساتھ بھی ہو جاوے گا۔ یہ ضرور ہے کہ محبت ماں اور بہن سے بھی ہوگی لیکن کیا دونوں محبتوں میں فرق عظیم نہ ہوگا ضرور ہوگا بہن اور ماں بھی محبوب ہیں اور بیوی بھی محبوب ہے لیکن دونوں کی محبت بالکل الگ الگ ہے کبھی کسی شخص کو نہیں دیکھا گیا کہ وہ بیوی کی طرح ماں کو بھی پیار کرے یا اس کو بغل میں لینے کی خواہش کرتا ہو بلکہ طبعاً اس قسم کے خیالات سے اس قدر نفرت ہوتی ہے کہ اگر خواب میں بھی اپنی ماں کے ساتھ صحبت کرتے دیکھ لیتا ہے تو بیدار ہو کر بے حد پریشان ہوتا ہے اور اپنے کو لعنت ملامت کرتا ہے حالانکہ تعبیر اس خواب کی بُری نہیں۔ تعبیر یہ ہے کہ ایسا شخص متواضع اور منکسر المزاج ہوگا کیونکہ خواب میں معافی اپنے مناسب صورت پر افتخار کرتے اور اس میں متمثل ہوتے ہیں اس قسم کے خواب میں ماں سے مراد زمین ہوتی ہے باعتبار اپنی صفت خاکساری اور صحبت سے مراد تلبس۔ پس یہ اشارہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو صفت خاکساری سے تلبس اور تعلق ہوگا۔

ایک بزرگ سے کسی نے یہی خواب بیان کیا انھوں نے یہی تعبیر دی اگر کسی جاہل سے ایسا خواب بیان کیا جائے معلوم نہیں کیا تعبیر دے۔ اسی وجہ سے حدیث میں وارد ہوتا ہے لا یحدث الالبیاء وحبیباً یعنی جاہل آدمی سے اپنا خواب نہ بیان کرو بلکہ کسی عقلمند یا دوست سے بیان کرو کیونکہ عقلمند آدمی تم کو واقعی تعبیر سمجھ کر بتلا دے گا اور تمہارا دوست اگر نہ بھی جانتا ہو گا تو خاموش ہو رہے گا اگر بڑے بتلا دے گا بخلاف جنہی بیوقوف یا دشمن کے کہ وہ خدا جانے کیا بتلا دیں گانا فضل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار یہ مقولہ نقل فرمایا۔ تاکہ بامادر خود جفت نشود ہزار خود را نکشد عارف نشود کسی نے کہا کہ حضرت جز اول تو میں نے بھی دیکھا ہے دوسرا جز البتہ نہیں دیکھا فرمایا پس اتنی ہی تو کسر ہے مراد جز ثانی سے نفس کا مغلوب ہو جانا ہے پس باوجود اس کے کہ اس قسم کے خواب کی تعبیر ایسی حسین ہے لیکن اگر کوئی ایسا خواب دیکھتا ہے تو بہت پریشان اور تنگ دل ہوتا ہے اور بیداری میں تو کیا پوچھتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ماں کے ساتھ جو محبت ہے وہ دوسری نوع کی ہے اور بیوی کیساتھ جو محبت ہے وہ دوسری قسم کی ہے دونوں محبتیں یکساں نہیں اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ احادیثِ محبت میں جو بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سب سے زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے دوسری سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا تیسری سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا واقع میں ان میں تعارض اور اختلاف کچھ نہیں ہے سب حدیثیں مختلف درجاتِ محبت کے اعتبار سے صحیح ہیں کیونکہ جس حدیث سے حضرت عائشہ کا زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات میں وہ سب سے زیادہ محبوب ہیں اور جس حدیث سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا زیادہ محبوب ہونا پایا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحبزادیوں میں اور جس حدیث سے ابو بکر رضی اللہ عنہ کا محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اصحاب و احباب میں سب سے زیادہ محبوب تھے۔

الغرض اشتراك فی الساعات تسادی كل الوجوه کو موجب نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ ایک میں دوسرے پر فضیلت بالذات ہو یا خصوص جبکہ ازویادیرکت کی کوئی دوسری وجہ بھی

موجود ہو جو حاصل ہے فضیلتِ لغیرہ کا جیسا ہم نے بیان کیا کہ ظرف کا شرف منظور کے شرف سے ہوتا ہے اور اس کی تفصیل یوں سمجھنا چاہیے۔

کہ وہ منظور جس کی وجہ سے ظرف کو شرف ہوا ہے یا تو خداوند جل و علا کا کوئی فعل ہوگا یا بندے کا کوئی فعل ہوگا۔ پس اگر خدا تعالیٰ کا فعل ہے تو چونکہ افعال خداوندی میں بعض نافع ہیں اور بعض انفع اس لئے اس تفاوت کی وجہ سے ان ازمہ میں بھی تفاوت ہوگا جن میں یہ افعال پائے جاویں مثلاً تورات کا نازل کرنا بھی فعل خداوندی ہے اور وہ بھی نافع ہے اور قرآن کا نازل کرنا بھی فعل خداوندی ہے مگر یہ بوجہ انفعیت قرآن کے انفع ہے پس زمانہ نزول توراۃ اور زمانہ نزول قرآن میں اسی درجہ کا تفاوت ہوگا جو کہ تنزیل قرآن اور تنزیل توراۃ میں ہے اور اگر وہ فعل بندہ کا ہے تو اس میں بھی یہی حالت ہے کیونکہ فعل عبدی عبادت ہے یا معصیت ہے اور ہر ایک میں نافع ہیں و انفع و ضار و اضر موجود ہیں پس جس طرح کا فعل جس زمانہ میں ہوگا اسی طرح کی صفت زمانہ کے لئے ثابت ہوگی اگر کسی نافع عبادت کا صدور ہو تو زمانہ میں اسی قسم کی برکت آئے گی اور کسی انفع عبادت کا صدور ہو تو زمانہ میں اس قسم کی برکت حاصل ہوگی علیٰ ہذا کسی خفیف گناہ کا صدور ہو تو زمانہ صدور اس کے لئے بُرا زمانہ ہے اور اگر کسی بڑی معصیت کا صدور ہو تو زمانہ صدور اس کے لئے بہت بُرا زمانہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آثار کا تفاوت اول اعمال کے لئے ثابت ہوتا ہے اس کے بعد اور اس کے واسطے سے زمانہ کے لئے۔ پس چونکہ رمضان میں قرآن کا نزول ہوا اور وہ مشرف و معظّم ہے اس کے شرف کی وجہ سے زمانہ نزول یعنی رمضان بھی ضرور مشرف ہوگا۔ صاحبو کیا مجازی محبوب کی گفتگو اور خط ملنے کا وقت تو پیارہ اور عزیز ہو اور محبوب حقیقی کے کلام نازل ہونے کا وقت مشرف و ممتاز نہ ہو قطع نظر اس کے کہ خدا کا کلام ہے اور اس کو انتساب ایک ذاتِ عظیمہ کے ساتھ ہے۔

یہ بھی دیکھو کہ اس آفتاب کے نور نے تمہارے قلوب کو کیا روشنی بخشی ہے اور تم کو کس ضغط کی حالت سے نکالا ہے تمہارے اعتبار سے کیا نافع ہوا ہے ورنہ اگر اس کلامِ الہی کو صرف حق تعالیٰ ہی سے تعلق رہتا تم سے تعلق نہ ہوتا تو تم اس سے کیسے مستفید ہوتے۔ غور کرو اگر آفتاب دنیا چند روز تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے اور تم اُس زمانہ میں بیابا بھی ہو

ہو یا مثلاً ایک ماہ تک لگاتار ہارش رہے اور گھڑی بھر کو بھی بادل نہ پئے تو تمہاری کیا حالت ہوگی۔ آخر یہ اس قدر پریشانی کیوں ہے محض اس وجہ سے کہ خدا نے تم کو ایک نور دیا تھا جو ہر لئے چندے تم سے لے لیا گیا ہے اور پھر خدا کا فضل دیکھو کہ نور بھی کس چیز سے دیا جو کہ تم سے لاکھوں کوں دور مگر اس کی شعاعیں ہیں کہ تم کو منور کر رہی ہیں اور تم طرح طرح کے فائدے اس سے حاصل کر رہے ہو اور اگر شعاعیں نہ ہوتیں تو گو نور آفتاب کے ساتھ پھر بھی تعلق ہوتا مگر چونکہ تم تک نہ پہنچتا اس لئے تم اس کے فیض سے محروم رہتے۔ اسی طرح کلام اللہ صفت قدیم ہے کہ وہ مثل آفتاب کے ہے اور اس کے لئے کچھ شعاعیں ہیں جو تم پر فائض ہو رہی ہیں جن کو کلام لفظی کہا جاتا ہے۔ صابو اگر آفتاب ہوتا اور یہ شعاعیں نہ ہوتیں تو ہم اس کے فیض سے کس طرح فیضیاب ہوتے۔ علیٰ ہذا کلام نفی کے لئے کلام لفظی کی شعاعیں نہ ہوتیں تو ہم اس صفت کی فیضان سے کس طرح فیض حاصل کرتے اور چونکہ کلام اللہ کو خدا تعالیٰ کے ساتھ یہ خاص تعلق ہے یہ ہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کلام مجید کی تلاوت سے بہت خوش ہوتے ہیں خواہ سمجھ کر پڑھا جائے یا بے سمجھے پڑھا جائے بخلاف دوسرے اعمال بسانہ مثل دعاؤں ذکر کے کہ اگر ان کو بے سمجھے کر تو اس درجہ معتد بہ محبوب نہیں مگر قرآن ہر طرح مقبول ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ کی حکایت ہے کہ انھوں نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ آپ کے قرب کا سب سے بڑا ذریعہ کیا ہے ارشاد ہوا قرأت القرآن یعنی قرآن پڑھنا امام صاحب نے عرض کیا بفہم اور بلا فہم یعنی سمجھ کر یا بلا سمجھے ارشاد ہوا بفہم اور بلا فہم یعنی کسی طرح ہو اور کچھ مدار اس کا خواب ہی پر نہیں بلکہ حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں ظاہر ہے کہ حروف صرف الفاظ ہیں ان کی تلاوت بلا فہم پر بھی تلاوت صادق آتا ہے معلوم ہوا کہ بلا فہم بھی قبول تام ہے گو بفہم پر اتم ہوتا ہے۔ اس تقریر سے آجکل کے روشن خیالوں کی غلطی بھی ظاہر ہو گئی ہوگی اکثر حضرات یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جب کلام اللہ کو سمجھا نہیں جاتا تو اس کے پڑھنے سے کیا فائدہ سوان کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کلام مجید کا بے سمجھے پڑھنا بھی پورا فائدہ رکھتا ہے۔

کیونکہ تلاوت قرآن میں صرف ایک یہ بھی فائدہ نہیں کہ ہم اس کے معنی کو سمجھیں بلکہ ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے پڑھنے سے ہم سے خدا تعالیٰ راضی ہوں جیسا بیان ہوا۔

اور یہ بات عقل اور عادت کے موافق بھی ہے دیکھو قاعدہ ہے کہ اگر مصنف کسی کو اپنی کوئی کتاب پڑھتے دیکھے تو اگرچہ اس کو یہ معلوم ہو جاوے کہ یہ شخص بے سمجھے پڑھ رہا ہے لیکن محض اس وجہ سے کہ اس نے ہمارے کلام پر توجہ کی اور اس کی قدر کی مصنف پڑھنے والے سے ضرور محبت ہو جاوے گی اور دل میں اس کے قدر ہوگی۔ حضرت مرشدنا حاجی انداد اللہ صاحب فرماتے تھے کہ میں ایک بار دہلی بازار میں جاتا تھا ایک دکان پر ایک مجمع دیکھا کہ اس کے درمیان میں ایک شخص رسالہ دردنامہ غمناک نہایت شوق سے پڑھ رہا تھا کوئی عاشق مزاج معلوم ہوتا تھا حضرت صاحب بھی اس مجمع میں کھڑے سن رہے تھے اور طبعاً خوش ہو رہے تھے کہ میرا کلام پڑھ رہا ہے اس شخص کو گو کہ خیر نہ تھی مگر مصنف پاس تھے اور خوش تھے۔ اسی طرح ایک بار پانی پت تشریف لے جاتے تھے راہ میں ایک شخص کو دیکھا کہ وہ یہ رسالہ پڑھتا جاتا ہے اور یہ رسالہ دردنامہ غمناک اگرچہ شاعری کے اعتبار سے اعلیٰ پایہ کا رسالہ نہیں ہے لیکن چونکہ درد دل سے نکلا ہے اس لئے نہایت اثر رکھتا ہے واقعی از دل خیزد و بردل ریزد غالب کے زمانہ کا واقعہ مشہور ہے کہ آشفۃ کے اس شعر پر ۵

حال آشفۃ چہ دانی بے خبر ۴ در خیال زلف عنبر بوئے تو
(بے خبر شخص آشفۃ کے حال کو کیا جان سکتا ہے وہ تو عنبر جیسی خوشبو والی زلف کے خیال میں مست ہے)
آشفۃ کے استاد نے جب یہ اصلاح دی ۵

حال آشفۃ پریشان تر شدہ ۴ در خیال زلف عنبر بوئے تو
(تیری عنبر جیسی خوشبو والی زلف کے خیال میں پریشان شخص کی حالت ادبہت زیادہ پریشان ہو گئی ہے)
اور غالب کو دونوں شعر پہنچے تو سن کر کہنے لگا کہ استاد صاحب قال ہے اور شاگرد صاحب حال ہے واقعی جب دل سے کوئی کلام نکلتا ہے اور دل میں درد ہوتا ہے تو پچیس پچاس کلام بھی وہ مزہ دے جاتا ہے کہ ہزار حبتِ بندشیں وہ مزہ نہیں دیتی۔ مولانا روم اپنے

اس شعر میں اسی درود دل در استغراق کو ظاہر فرما کر قافیہ وغیرہ پر اعتراض کرنے والوں سے عذر فرما رہے ہیں۔

۵ قافیہ اندیشم و دلدار من : گویدم مندریش جز دیدار من

دیں شعر کیلئے قافیہ سوچنے لگتا ہوں تو میرا معشوق مجھ سے کہتا ہے تو مولے میرے دیدار کے کسی اور چیز کی طرف خیال مت کر جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مجھ سے کسی مقام پر شاعرانہ فروگزاشت ہو گئی تو وہ قابل گرفت نہیں ہے کیونکہ شاعرانہ نکات پر نظر رکھنا توجہ الی الشعر پر موقوف ہے اور یہاں دیدار سے اتنی فرصت کہاں کہ اس فضول دہندوں میں وقت ضائع کریں۔

صاحبو! اس تقریر میں غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملکہ شاعری نہ دینے کی ایک یہ بھی وجہ تھی بھلا غیرت خداوندی کیونکر جائز رکھتے کہ ان کا محبوب و محب اس کی طرف سے التفات ہٹا کر دوسری چیز پر ملتفت ہوا اور یہی بھید ہے کہ اکثر محققین صوفیہ نے مریدوں پر متعارف توجہ دینے کے طریق کو بالکل ترک فرما دیا ہے یہی ہے کہ اس طریق توجہ میں مریدین کے اندر کسی کیفیت کے بقا کے لئے اس قدر استغراق کہ ناشروط تصرف ہے کہ بجز اس مقید القاء کے کسی طرف التفات نہ ہوا اور تمام تر خیالات سے بالکل خالی ہو جاوے حتیٰ کہ واقعی اس وقت حق تعالیٰ کی طرف بھی توجہ کم ہو جاتی ہے سو اس قدر توجہ مستغرق خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے ان کو غیرت آتی ہے اور ان پر سخت گراں گذرتا ہے کہ یہ شخص خدا سے بالکل غائب ہو جاوے اور فرمایا کہ ایک ضرر شیخ کو توجہ متعارف میں یہ ہوتا ہے کہ اپنے تصرفات دیکھ کر چند روز میں عجب پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ اس متعارف طریق توجہ سے شہرت ہو جاتی ہے اور جس شہرت کے اسباب مقدور ترک ہوں وہ اکثر مضر ہوتی ہے تیسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ شیخ اگر ضعیف القوی ہو تو بیمار پڑ جاتا ہے یہ تین ضرر شیخ کو ہوتے ہیں اور مرید کو یہ ضرر ہوتا ہے کہ وہ شیخ پر انکال کر لیتا ہے اور خود کچھ نہیں کرتا اس لئے اس کی نسبت محض انوکاسی ہوتی ہے انکسابی نہیں ہوتی اور نسبت انوکاسی کو قیام نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ توجہ تو خود حدیث سے ثابت ہے چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ غطفی فبلغ منی الجہد سو اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ اس غلط کو توجہ کہنا محض بے دلیل ہے اس کا حاصل صرف

الصاق بالصدر مع شدۃ ہے نہ کہ توجہ متعارف اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو ممکن ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو بوجہ قوت ملکی توجہ میں اس قدر استغراق کی ضرورت نہ ہوئی ہو جو توجہ الی الحق کو مانع ہو۔ وذاک لایضر۔ اگر کہا جائے کہ ممکن ہے کہ منفعل کی تفاوت استعداد سے کسی وقت کمال استغراق کی ضرورت نہ ہو۔ تو جواب یہ ہے کہ فاعل کو تو ہر صورت میں کمال استغراق کی ضرورت ہوگی البتہ تفاوت استعداد سے منفعل میں فرق ہوگا کہ تمام الاستعداد بہولت اور جلد متاثر ہوگا اور ناقص الاستعداد بدیر متاثر ہوگا۔

ہاں دو صورتیں فیض رسانی کی اور ہیں ایک تو ان کے اختیار سے بھی خارج ہے وہ یہ کہ ان کی ذات بابرکت کے فیوض برکات سے کہ ان کو اس طرف التفات بھی نہیں عام مستفیض ہوتا ہے جس طرح بارش کہ اس کے برسنے سے ہر قابل حصہ زمین میں قوت نمود پیدا ہو جاتی ہے خواہ بارش چاہے یا نہ چاہے یا آفتاب کہ اُس کے طلوع کے وقت جو چیز اس کے مقابل ہوگی ضرور نمود ہوگی دوسری اختیاری ہے جیسے مریدین کے لئے دعا کرنا ان کی حال کی نگرانی کرنا شفقت سے نصیحت کرنا اس کو بھی توجہ بالمعنی اللغوی کہا جاتا ہے مگر اصطلاحی توجہ بمعنی تصرف نہیں سوا اس کا کچھ مضائقہ نہیں بلکہ منون ہے کیونکہ طریق توجہ کے ترک کا سبب محض یہ تھا کہ اس میں ذات باری سے غیبت ہے اور چونکہ اس دوسرے طریق میں ترک التفات الی اللہ نہیں بلکہ زیادت التفات الی اللہ ہے اس لئے یہ مذموم نہیں بلکہ مطلوب ہے اور گو اس وقت توجہ الی الخلق بھی ہوتی ہے مگر وہ توجہ صارف عن التوجہ الی الخلق نہیں ہے بلکہ دعا کی توحقیقت ہی توجہ الی الخالق ہے گو لنفع الخلق ہی اور یہ نفع بھی خاص مرضی حق ہے اور نگرانی و نصیحت و تعلیم وغیرہ میں بھی اعتدال توجہ الی الخلق غیر عن الحق ہے۔

اور وہ بھی باذن الخالق ہے تو ہے انہماک فی الخلق و غیب عن الحق نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ توجہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ کہ جس میں خدا تعالیٰ سے غیبت ہے دوسرے وہ کہ اس میں احداث التفات الی الخلق ہو پہلی قسم اکملہ کے یہاں متروک ہے دوسری قسم مطلوب و محمود ہے البتہ پہلی قسم کی توجہ سے اگر اپنے تصرف اور بزرگی کا اظہار مقصود نہ ہو بلکہ محض اتنا وہ خلق مقصود ہو تو وہ جائز ضرور ہے گو اکملہ نے اس کو ایک بار یک وجہ سے چھوڑ دیا اور

اگر اس سے اپنے تصرف کا اظہار یا زیادت جاہ مقصود ہو تو مذموم ہے پس اس کا وہی مرتبہ ہے جو غلام پہلوان اور رنجیت سنگھ کی کشتی کا جس درجہ میں یہ کشتی محمود مذموم ہے بالکل اسی درجہ میں یہ توجہ بھی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ توجہ مروج فی نفسہ کوئی مطلوب و محبوب چیز نہیں ہے لیکن اگر اس کی غایت محمود ہو تو اس میں بالعرض مطلوبیۃ کی شان پیدا ہو جاتی ہے جس طرح ویرزش کہ اگر اس سے غرض محض اظہار قوت و صولت ہے تو لغو ہے اور اگر اعانتہ مخلوق اس کی غرض ہے تو محمود ہے پس یہ توجہ ایک مرتبہ میں طاعت ہے لیکن اس سے زیادہ درجہ میں وہ توجہ ہے جو کہ انبیاء اپنے اصحاب و امت پر فرماتے تھے یہی انبیاء کا طریق توجہ ہے جس کو کاملین نے اختیار کیا ہے کہ اس میں وہ خطرہ نہیں ہے جو کہ مروج طریق میں ہے اور وہ توجہ ہے خلق کی طرف جو کہ سالک کے لئے نہایت مضر ہے حتیٰ کہ ابتداء میں مطلق افادہ کے ارادہ سے بھی توجہ کرنا مضر ہوا ہے۔

ایک بزرگ کی حکایت مشہور ہے کہ اپنے ایک مرید کو مدت تک ذکر شغل بتلاتے رہے اور اس میں تغیر و تبدل بھی کرتے رہے لیکن مرید کو کچھ نفع نہ ہوا آخر مدت کے بعد اس سے یہ پوچھا کہ تم یہ ذکر و شغل کس نیت سے کرتے ہو اس نے کہا کہ حضرت یہ ہی نیت ہے کہ اگر کسی قابل ہو جاؤں گا تو دوسروں کو نفع پہنچاؤں گا۔ شیخ نے کہا توجہ کرو یہ شرک ہے کہ ابھی سے بڑے بننے کا خیال ہے اور خلق مقصود بال نظر ہے۔ جب اس نے اس خیال سے توجہ کی فوراً فائدہ محسوس ہوا۔ گویا افادہ کی غرض سے بھی جو کہ بظاہر محمود ہے خلق کی طرف توجہ کرنا ابتداء سلوک میں مضر ہوتا ہے۔ اور اس حکایت سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شیخ کامل کبھی مایوس نہیں ہوتا نہ مرید کو مایوس کرتا ہے جیسا یہ شیخ مدت تک تغیر و تبدل کرتے رہے اور نفع نہ ہونے سے جواب نہیں دیا بلکہ اس کاوش میں رہے حتیٰ کہ مرض اور اس کا علاج نکال ہی لیا وہ طبیب حاذق کی طرح کسی نہ کسی نئی ادھیڑ بن میں برابر لگا ہی رہتا ہے یہ خلاف ظاہر اور ناقص پیروں کے وہ ایسے موقع پر گھبرا جاتے ہیں اور دوسرے کو بھی مایوس کر دیتے ہیں اسی پر حافظ مشیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

بندہ پیر خراباتم کہ لطفش دگم است ۛ زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ بہت گاہ نیست
(میں میکدہ کے مالک کا غلام ہوں کہ اس کی ہمیشہ مہربانی رہتی ہے جبکہ ناقص شیخ
اور پابند شریعت زاہد خشک کی مہربانی کبھی کبھی رہتی ہے)

مصرع ثانی میں شیخ سے مراد شیخ ناقص ہے بلکہ اگر کشف سے بھی کسی کی شقاوت
ظاہر ہو جاوے تب بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ دعا تبدیل بالسعادہ کی کرتے ہیں البتہ اگر
کسی نبی کو وحی سے کسی کا ختم علی الکفر معلوم ہو جاوے تو اس وقت مایوس ہونا وہ خدا
ہی کے حکم سے ہے نیز اسی حکایت سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ ہر شخص منصب ہدایت
کی لیاقت نہیں رکھتا بہت سے نام کے ایسے ہادی ہیں کہ جن کی غرض ہدایت سے
محض طلب جاہ ہے اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے لا یقصر الامیر او مامور او مختال
یعنی وعظ کہنے کی ہمت وہی کرے گا کہ یا تو خود امیر المؤمنین ہے یا امیر المؤمنین کی طرف سے
مامور ہے یا متکبر اور نفس پرور ہے اس لئے کہ جب کہ ہدایت عامہ کا کام امیر المؤمنین کی ذمہ
داری میں ہے تو اس کو وہ خود کرے گا یا خود نہ کرے گا تو کسی کو اس خدمت پر مامور کرے گا
پس جو شخص نہ یہ ہے نہ وہ ہے اور پھر بھی ایسا کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ آپ بھی خواہ مخواہ اپنے
کو پانچویں سواروں میں گنتے ہیں لیکن اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب بغیر امیر یا مامور
ہووے وعظ کہنا مختال ہونے کی علامت ہے تو اجمال کے تمام وعظ میں سے تو ایک شخص
بھی امیر یا مامور نہیں تو کیا یہ سب کے سب حدیث کی تیسری شق میں داخل ہیں جواب یہ ہے
کہ فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ جس جگہ حاکم نہ ہو وہاں اگر متقی پر سیزگار اہل اللہ کے مسلمان کسی ایک
شخص کو کوئی منصب دیدیں تو وہ سب ملکر امیر کے قائم مقام سمجھے جاویں گے اور انکا
اعطاء امیر ہی کا اعطاء ہوگا۔ کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو اعطاء مناصب کا اختیار
جو امام کو ہے وہ درحقیقت اہل اسلام ہی کو ہے۔ اور امام بحیثیت ان کا نائب ہونے کے
ان کا کام کرتا ہے کیونکہ امام کا امام ہونا تو خود اہل اسلام کے اتفاق پر ہے پس اگر وہ
موجود نہ ہو تو خود ان کا فعل ضرور جائز ہوگا جیسے جمعہ کی نماز کے لئے انتخاب امام کا
کہ اگر امیر موجود نہ ہو اور مسلمان مل کر کسی کو منتخب کر لیں تو وہ امام صحیح ہو جاتا ہے یا ناظر

وقف کو امام کی عدم موجودگی میں اہل اسلام کے انتخاب سے کسی خاص شخص کو عہد نظارت وقف دیا جاسکتا ہے پس جب دیندار فہیم مسلمانوں نے مل کر ایک شخص کو وعظ و نصیحت کے لئے انتخاب کر لیا ہو خواہ قولاً یا حالاً تو ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز ہے باقی ہڈن اہل دین اور اہل عقل کے انتخاب کے جو لوگ اس کام کو کر رہے ہیں اور اہل نہیں ہیں وہ وعظ کے رنگ میں گمراہی پھیلارہے ہیں ضروری مسائل تک سے ان کو واقفیت نہیں ہوتی اور وعظ کہنے کی جرأت کر بیٹھتے ہیں۔

سہارن پور میں ایک جاہل دیہاتی نے آکر وعظ کہا انداز یہ کہ آپ نے قبل از نماز پوچھا کہ یہاں اُواج تو نہیں ہوتی معلوم ہوا کہ نہیں پس نماز کے بعد پکار مارا کہ ساہبو (صاحبو) اُواج (واعظ) ہوگی سنتیں پڑھ کر وعظ کہنے بیٹھے اعوذ بسم اللہ غلط سلط پڑھ کر یسین کی شروع کی آیتیں الٹی سیدھی پڑھ کر ترجمہ کیا خوبصورت ہوا۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اگر تجھ کو پیدا نہ کرتا نہ دین پیدا کرتا نہ آسمان نہ عرش و کرسی وغیرہ وغیرہ پھر فرماتے ہیں۔ بھائیو تمھکے ماندہ ہیں اس واسطے آدمی اُواج اب ہوئی آدمی پھر ہوگی۔ کوئی نابینا ذی علم اس مجلس میں موجود تھے انھوں نے واعظ صاحب کو اپنے پاس بلا کر بٹھلایا اور پوچھا آپ کی تسنیل (تھیل) کہاں تک ہے فرماتے ہیں ہماری تسنیل ہے ہاپٹر (ہماری تھیل ہے ہاپٹر) بس ایسے واعظ رہ گئے ہیں لیکن اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ گولغو ہیں اور اپنی اور دوسروں کی توضیح اوقات کرتے ہیں مگر پھر بھی ان پیچاروں سے اس قدر نقصان نہیں اور اتنی گمراہی نہیں پھیلتی جتنے وہ لوگ پھیلاتے ہیں کہ آب و تاب کی تقریریں مشق کئے ہوئے ہیں بڑے بڑے الفاظ یاد ہیں صوفیہ کی اصطلاحات از برہیں حافظ کا دیوان پیش نظر ہے نہ بان ہے کہ آب رواں کی طرح بہتی چلی جاتی ہے لیکن واقفیت اور حقیقت دیکھو تو محض سیج ہی لوگ ہیں کہ ان سے امت کے اکثر افراد تباہ ہوئے اور ہو رہے ہیں کسی نے خوب کہا ہے ۵

حرف درویشان بدزد مرد وزن : تا بہ پیش جا ہلاخواند فسون
(دویشوں کی باتیں چوروں اور کیمہ ڈلیوں کے سامنے ایسی ہیں جیسے جاہلوں کے سامنے عملیات کا پڑھنا)

اور یہی لوگ ہیں جن کو حدیث میں اور مختال کے لفظ سے فرمایا گیا ہے غرض اس حدیث سے یہ بات صاف معلوم ہوگئی کہ وعظ طاعت ہے لیکن اگر اس میں نیت خراب ہو تو وہی گناہ ہو جاتا ہے۔ صوفیہ نے اسی راہ کو سمجھ کر ابتداء سلوک میں وعظ گوئی سے بالکل منع فرمایا کہ قبل اصلاح نفس اس میں اغراض فاسدہ غالب ہوتے ہیں پس معلوم ہو کہ ہر شخص اہلیت ارشاد کی نہیں رکھتا سو شیخ ہونا ہر شخص کا کام نہیں ہے دیکھو محقق شیخ کی وہ شان ہوا کرتی ہے جو اوپر کی حکایت میں مذکور ہوئی کہ کس دقیق مرض کو مرید کے سمجھ لیا جس کی نیت ذکر و شغل سے بڑا بنتا اور خلق کو مطمح نظر بنانا تھا پس اسی طرح تو اگر چہ طاعت ہو لیکن وہ کاملین کے لئے طاعت نہیں کیونکہ اس میں مخلوق کی طرف کامل توجہ لازمی اور ان کے حق میں غیر اللہ کی طرف التفات کرنا سخت گناہ ہے۔

بہرچہ از دوست دمانی چہ کفر آنخرف چہ ایماں ۛ بہرچہ از بار دور افتی چہ زشت آن نقش چہ زیبا
(جب کچھ کو دوست دور رہتا ہو تو پھر کفر و ایماں برابر ہے جب یاد سے دور پڑا پھر چاہے اچھا نقش ہو یا بُرا)
خلاصہ یہ ہے کہ نفس توجہ اگرچہ زیبا ہو لیکن جب کہ اس نے خدا سے ہٹا دیا تو یقیناً زشت ہے اسی طرح تصور شیخ کا شغل بھی محققین نے اکثروں کو بتلانا بالکل ترک کر دیا ہے سبب یہی ہے کہ تصور شیخ میں مرید کی پوری توجہ شیخ کی طرف ہوتی ہے۔ ذات باری کی طرف بالکل التفات نہیں ہوتا اور یہ غیبت کاملین کے ہاں جرم ہے خوب کہا ہے۔

یک چشم زدن غافل از ان شاہ نہ باشی ۛ شائد کہ نگاہ کند آگاہ نباشی

(اس یاد شاہ سے ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی غافل نہ رہنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ وہ متوجہ ہو اور تجھ پر غری ہو)
ممکن ہے کہ جس وقت یہ شخص پیر کے تصور میں مصروف ہے وہی وقت ادھر کی طرف کی توجہ کے نافع ہونے کا ہو اسی کے جرم ہونے کو کہا گیا ہے۔

ہر آن کو غافل از حق یک زماں است ۛ در آن دم کا فراست امانہاں است
(جو شخص تھوڑی دیر کے لئے ہی حق تعالیٰ سے غافل ہے اتنی دیر کے لئے کافر ہے اگرچہ ظاہر نہیں ہے)
کفر سے مراد فقہی کفر نہیں اصطلاحی کفر ہے اس لئے کاملین کی طبیعت اوچھٹی ہے اور ان کو سخت وحشت ہوتی ہے۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے اوچھڑی کہ اس کو حلال

تو ضرور کہیں گے اگر غلط سے صاف ہو لیکن ایک لطیف المزاج آدمی سے پوچھو کہ اس کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے اور صاحبو اصل تو یہ ہے کہ جب ایک دل میں دو خیال نہیں آ سکتے ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں پھر کیونکر کہا جائے کہ جو توجہ کہ اس میں خدا کا خیال ضعیف اور مخلوق کا خیال غالب ہو پھر اس کو قصداً پیدا کیا جائے وہ مطلوب ہوگی۔ حضرت ابراہیم ادہمؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب بیٹے سے جو شیخ محمود کے نام سے مشہور ہیں ملے اور مسرت کا جو شش غالب ہوا تو ندا آئی کہ

حُب حق ہو دل میں یا حُبِ پسر ۛ جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر
آخر وہ حجاب بھی مرتفع ہو گیا اور ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بیٹے سے بالکل ہی محبت نہ کرے جس قدر اس کا حق شرعی ہے وہ جب حق پر غالب نہ ہو عینِ سنت ہے۔ پس شیخ سے بھی ایسی محبت نہ ہونی چاہیے جو کہ خدا کو بالکل بھلا دے۔ جیسا آجکل جاہل فرقوں میں متعارف ہے اسی طرح بیوی بچوں سے ایسی محبت نہ ہو کہ خدا کی طرف توجہ نہ رہے لا تلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ الطاف خداوندی کے قربان ہو جائے یہ حکم نہیں فرمایا کہ اولاد سے بالکل محبت نہ کر و کیونکہ جانتے ہیں کہ محبت اولادِ طبعی ہے امثال ہو نہ سکے گا۔ اس لئے یوں فرماتے ہیں کہ اس قدر ان کے درپے نہ ہو کہ خدا کو بھول ہی جاؤ ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ توجہ تو اس قدر مذموم ٹھہری اور جو غرض توجہ کی ہے وہ ضروری پس اگر توجہ ترک کر دیں تو امر ضروری کا ترک لازم آتا ہے اور توجہ اختیاری تو امر مذموم کا اختیار لازم آتا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ توجہ سے جو غرض ہے اس کا حصول توجہ ہی میں منحصر نہیں کیونکہ اگر اس کا حصول اسی میں منحصر ہوتا تو انبیاء علیہم السلام اسی طریق کو اختیار کرتے جب انھوں نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اسی طریق میں اس کا انحصار نہیں ہے۔ بلکہ دوسرا طریق بھی موجود ہے یعنی تعلیم و ارشاد شفقت و دعا اور یہ طریق ایسا ہے جس میں نہ کوئی خطرہ ہے نہ کوئی اندیشہ۔ بات کہیں کی کہیں جا پڑی جو رسالہ درونا مہ غمناک کی نوعیت شعر یہ کے سلسلہ میں پڑھی گئی

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر مصنف کے سامنے اس کے کلام کو بے سمجھے بھی کوئی شخص محبت اور ذوق شوق سے پڑھے تو اس کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے اس شخص کو رسالہ درونا مرغینا ک پڑھتے سنا تو آپ بہت خوش ہوئے اسی طرح کلام خداوندی کو جب ہم پڑھیں گے اور خدا تعالیٰ سنیں گے کیونکہ خدا سے تو کوئی چیز غائب ہی نہیں۔ مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا مَنَّا كُونٍ فِي مَشَانٍ وَمَا تَلَوْنَاهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا اِذَا تَفِيضُونَ فِيهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ اِلَّا كَرَدِّهِ سَاعَةً أَوْ يَوْمًا أَوْ زَيْنٍ كِي اَوْجَلْ نہیں ہو سکتی تو خدا تعالیٰ ضرور خوش ہوں گے اور متوجہ ہوں گے حدیث میں ہے کہ خدا تعالیٰ کسی طاعت پر اتنا متوجہ نہیں ہوتے جتنا قراۃ قرآن پر متوجہ ہوتے ہیں۔ شاید کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ اس وقت سب لوگ سمجھ ہی کر پڑھتے تھے اس لئے اس وقت کی حالت پر یہ ارشاد ہوا ہے اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اگر بے سمجھے پڑھتے تب بھی توجہ ہوگی سو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن صرف عرب ہی کے لئے نازل نہیں کیا گیا اور ساری دنیا کی زبان عربی ہے نہیں اور حدیث بشارۃ میں عرب کی تخصیص نہیں فرمائی گئی اس کے علاوہ حدیث میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ سات آٹھ آدمی تلاوت قرآن کر رہے تھے ان میں کچھ عربی تھے اور کچھ عجمی تھے جن سے اچھی طرح پڑھتے بھی نہ بنتا تھا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور سن کر ارشاد فرمایا کہ اقراء وفکل حسن اور اس کی دلیل کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے تھے کہ ان سے پڑھتے نہ بنتا تھا لفظ حدیث ہیں کیونکہ سب اچھی طرح پڑھتے ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ارشاد کی ضرورت نہ تھی فکل حسن معلوم ہوا کہ کچھ لوگ پوری طور پر قادر نہ تھے بس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو حسن فرمایا تو معلوم ہوا کہ حسن ہونے کے لئے بالکل عرب کے موافق ہو جانا ضرور نہیں بلکہ کچھ کوتاہی بھی رہے جب بھی فضیلت حاصل ہے اور لفظی اور معنی کوتاہی میں کوئی معتد بہ تفاوت نہیں یہ تو حدیث تھی اور لیجئے کشف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کی حکایت پہلے مذکور ہوئی کہ انہوں نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا

اور عرض کیا کہ سب سے زیادہ کون سی طاعت سے آپ خوش ہوتے ہیں وہاں سے ارشاد ہوا کہ قرآن پڑھنے سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ سمجھ کر پڑھنے سے یا بلا سمجھ بھی ارشاد ہوا بفہم اور بغیر فہم پس معلوم ہوا کہ قرآن شریف خواہ کسی طرح پڑھا جاوے وہ ضرور مفید ہے خواہ سمجھ کر ہو یا بلا سمجھ ہو اور اس کے پڑھنے سے خدا ہم سے ضرور خوش ہوں گے یعنی ہم کو ثواب انعام و اکرام ہوگا کیونکہ خدا کی خوشی کے یہ معنی نہیں جو ہماری تمہاری خوشی کے معنی ہیں کہ ایک بات جی کے موافق ہوئی طبیعت باغ باغ ہو گئی جس کی حقیقت انفعال ہے خداوند جل و علا طبیعت اور انفعال سے بالکل پاک ہے اس پر صفات کا اطلاق غایت کے اعتبار صبح سے ہوتا ہے مبادی کے اعتبار سے نہیں ہوتا بہر حال قرآن کی تلاوت میں آپ نے سنا کہ کیا اجر عظیم ہے افسوس ہے کہ اس اجر عظیم کو چھوڑ کر ہواؤ ہو س کے بندوں نے کلام اللہ کو جو کہ رضا خداوندی کا ذریعہ تھا دنیا طلبی کا ذریعہ بنا لیا ہے کہ روپیہ لے کر اور مقرر کر کے قرآن سنانے ہیں یہ صریح دین فروشی ہے لیکن تعلیم قرآن کو اس پر قیاس نہ کیا جاوے کیونکہ تعلیم قرآن پر تنخواہ لینا جائز ہے اور اس جواز کے حنفیہ کے یہاں دو طریق ہیں ایک تو یہ کہ امام شافعیؒ نے جائز کہا ہے اور حنفیہ نے بوجہ ضرورت کے اس پر فتوے دیا ہے۔ لیکن یہ طریق بالکل کمزور ہے ہم کو کیا ضرورت ہے کہ ابو حنیفہؒ کی تشلید کا التزام کر کے بلا وجہ امام شافعیؒ کے مذہب پر عمل کریں دوسرا طریق یہ ہے کہ یوں کہا جاوے کہ خود حنفیہ کا فتاویٰ ہے کہ مجوس کا نفقہ من لہ الجہین پر ہوتا ہے۔ پس جب یہ شخص خدمت دین میں مجوس ہے اس کا نفقہ اہل اسلام پر واجب ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی قسم کی خدمت دینیہ میں مشغول ہو سب کا یہی حکم ہے بعض مسلمانوں کا دے دینا بطور فرض کفایہ کے سب کو سبکدوش کر دے گا رہا یہ شبہ کہ اگر یہ بحیثیت نفقہ کے دیا جاتا ہے تو تنخواہیں کیوں مقرر کی جاتی ہیں کیونکہ نفقہ بقدر کفایت ہوتا ہے۔ اس کا جواب

یہ ہے کہ فی نفسہ تو یہ ہی حکم ہے مگر اس میں ہمیشہ جھگڑے پیدا ہوا کرتے۔ عامل کہتا کہ اب کے مہینہ میں میرے پچاس روپے خرچ ہوئے دوسرے کہتے کہ بیس ہی ہوئے جب روزانہ جھگڑہ رہا کرتے تو سلسلہ تعلیم چند روز میں درہم برہم ہو جاتا اس عارض کے لئے انتظامات یسین صبح کی بھی اجازت ہوگی جیسا کہ آپ کے ظاہر رہنے کے لئے اصل میں کثیر ہونا شرط ہے لیکن نظم عوام کے لئے اس کی وہ درودہ کے ساتھ تقلید کر دی گئی یہ تقریر بالکل اصول حنفیہ کے موافق ہے البتہ یہ تقریر معلم کے لئے نہ چل سکے گی بلکہ وہاں ہی چلے گی جو اپنے کو خادم دین سمجھ کر کام کر رہے ہیں اس کا معیار یہ ہے کہ اگر موجودہ تنخواہ میں کام چل رہا ہو اور دفعۃً ترقی کی خبر آدے اور بجز ترقی کے اور کوئی مصلحت تعلق سابق کے قطع کرنے کی نہ ہو پس اگر وہ شخص تعلق ترک کر کے چلا جاوے تب تو سمجھنا چاہیے کہ طلب دنیا اس شخص کا اصلی مقصود ہے اور اگر ترک تعلق نہ کرے تو سمجھنا چاہیے کہ مقصود اصلی خلق اللہ کو دینی نفع پہنچانا ہے معاوضہ اصل مذکور پر لیتا ہے ایک کے لئے جزاء جس نہ ہوگا اور ایک کے لئے جزاء جس سمجھا جاوگا غرض اجرت تعلیم اس عدم جواز میں داخل نہیں۔ البتہ تراویح پر ملنے کا جو مروج قاعدہ اکثر مقام پر ہے وہ اس میں ضرور داخل ہوگا۔ حافظ رحمۃ اللہ نے خوب فرمایا ہے۔ دام تزدیر مکن چوں دگراں قرآن را۔ اور اسی طرح مردوں پر قرآن پڑھ کر دام لینے کا حال ہے کہ قرآن فروشی ہے اور ان کا قیاس تعلیم پر اس لئے نہیں ہو سکتا کہ تعلیم شعائر میں سے ہے اس خدمت کے لئے مجبوس ہونا موجب جزاء ہے اور تراویح کا ختم اور ایصال ثواب یہ شعائر ہے نہیں اگرچہ طاعت ہے البتہ خود تراویح یا بیچگانہ نماز کی جماعت یہ شعائر سے ہے اگر اس لئے اگر مفت کا امام نہ ملے تو اجرت ٹھہرانا درست ہے اور اس تمام تقریر سے قرآن شریف کا مثر و معظم ہونا ثابت ہو گیا پس جب ایسی معظم چیز رمضان میں نازل ہوگی تو رمضان شریف کیوں معظم و مشرف نہ ہوگا قرآن کی تعریف میں ایک بزرگ فرماتے ہیں

چلیست قرآن لے کلام حق شناس رہ نماے رب ناس آمد بہ ناس
حرف حرفش راست در بر معنے معنے در معنے در معنے
(اے حق بات کے سمجھنے والے تو سمجھتا بھی ہے کہ قرآن کیا چیز ہے انسانوں کے پاس انسانوں کے رب کی شان دکھانے والا ہے)

اس کا ہر ہر حرف بالکل ٹھیک ہے اور اپنے اندر معنے رکھتا ہے بلکہ معنی میں بھی معنی رکھتا ہے اور رونا اس واسطے کہا کہ خدائے تعالیٰ کو دنیا میں بلا واسطہ تو دیکھ نہیں سکتے پس کلام اللہ کو پڑھنا گویا دیدارِ خداوندی سے محفوظ ہونا ہے اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی اس سے اس کی پوری حقیقت ظاہر ہوگی ایک مرتبہ ایران کے بادشاہ کے خیال میں اتفاقاً ایک مصرع آگیا ”در ابلق کسے کم دید“ موجود مصرع پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن دوسرا مصرع تیار نہ کر سکے شعراء کو جمع کیا اور مصرع لگانے کی فرمائش کی کسی نے مصرع نہ لگ سکا کیونکہ ایک مہل مضمون ہے آخر سب کو زنداں کی دھکی دی ان لوگوں نے پریشان ہو کر ہندوستان میں عالمگیر کے پاس خط لکھا کہ تمہارے یہاں بڑے بڑے شاعر ہیں کسی سے مصرع کہلا کر ہماری جان بچاؤ۔ شعراء کو وہ مصرع دیا گیا لیکن مضمون ایسا بے تکا تھا کہ کسی کی کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا شدہ شدہ زیب النساء مخلص یہ مخفی کو بھی اس کی خبر پہنچی اس نے بھی غور کیا لیکن مصرع نہ لگ سکا۔ اتفاقاً ایک روز مندر پر بیٹھی ہوئی آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی تھی آئینہ سامنے تھا کہ سرمہ کی تیزی سے آنکھ سے ایک آنسو گرا اس کی ہیئت کو دیکھ کر فوراً دوسرا مصرع اس کے ذہن میں آگیا۔ مگر اشک بتاں سرمہ الود۔ (مگر معشوق نے جب سرمہ ڈال رکھا ہو تو سرمہ ملا ہوا آنسو) چنانچہ عالمگیر کو خبر ہوئی اور شعر پورا کر کے ایران بھیجا گیا۔ جب بادشاہ نے مصرع سنا اس کے اور تمام شعراء کے دل میں اس شاعر کی بڑی قدر ہوئی اور شاہ ایران نے عالمگیر کو لکھا کہ اس شاعر کو ہمارے پاس بھیج دو۔ عالمگیر کو جب اس پیغام کی خبر پہنچی تو بہت رنج ہوا کہ اگر شاعر کو ظاہر کرتا ہوں تب بھی مشکل ہے اور انکار کرتا ہوں تو بھی

مشکل ہے آخر اس نے زیب النسا سے کہا کہ تمہاری شاعری کا یہ نتیجہ ہوا۔
 زیب النسا نے کہا کہ تم اس کے جواب میں میری طرف سے یہ لکھ دو کہ
 در سخن مخفی منم چوں بوی گل در برگ گل ۛ ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بنید مرا
 (میں بات ہی میں چھپا ہوا ہوں جیسے پھول کی خوشبو پھول میں چھپی ہوئی ہوتی ہے
 جو شخص مجھ کو دیکھنا چاہتا ہے وہ مجھے میرے کلام ہی میں دیکھ لے)

چنانچہ یہ لکھ کر بھیج دیا گیا معلوم ہوا کہ مستورات سے ہے۔ پس اسی طرح ہمارا مطلوب
 حقیقی جس کے دیدار کے ہم متمنی ہیں بوجہ اس کے کہ ہم دیدار کی تاب نہیں لاسکتے
 اور ہم اس کو دیکھ نہیں سکتے گویا یہ فرما رہے ہیں کہ

در سخن مخفی منم چوں بوی گل در برگ گل ۛ ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بنید مرا
 اور وہ سخن ہی کلام اللہ ہے جس کی شان یہ ہے معنی در معنی در معنی۔ جس قدر
 زیادہ پڑھتے جاؤ اسی قدر زیادہ علوم منکشف ہوتے جاویں گے۔ چنانچہ حدیث
 میں ہے لا تتقنی عجائبہ اور پھر لطف یہ کہ جاہلوں کو بھی لطف آتا ہے اور عالم کو بھی
 مزہ آتا ہے صاحب ظاہر بھی جان کھوتا ہے اور صاحب باطن بھی قربان ہوتا ہے
 عالم حشر دل و جان تازہ میدان دارد ۛ برنگ اصحاب صورت را ہوار باب معنی را
 اس کے حسن کے عالم کی بہار دل کو اور روح کو تازہ و خوش رکھتی ہے اس کی رنگت
 سے صورت کو پسند کرنے والے خوش ہوتے ہیں اور اس کی خوشبو سے معنی کو پسند
 کرنے والے خوش ہوتے ہیں۔

اور اسی حدیث میں ہے لا یخلق من كثرة الرد واقع میں مشاہدہ ہوتا ہے
 کہ کتنا ہی سنو جی نہیں بھرتا نیا مزہ آتا ہے۔ اگر کہا جاوے کہ یہ سارا لطف
 خوش آوازی کی وجہ سے ہوتا ہوگا تو ہم کہیں گے کہ آخر وہ لطف اور وہ بلودگی
 جو قرآن پڑھنے سے ہوتی ہے شعر پڑھنے سے کیوں نہیں ہوتی اس میں وہ مزہ
 کیوں نہیں حاصل ہوتا اور اگر کسی کو اس میں زیادہ مزہ آتا ہو تو وہ ابھی قابل
 خطاب ہی نہیں ہوا اس کو چاہیے کہ صحت ادراک و سلامت حال پیدا کرنے

کی کوشش کرے پھر موازنہ کرے۔

صاحبو! قرآن تو قرآن ہے کبھی اگر مکررہ میں جا کر وہاں کی تکبیر سنا نہ میں سنو جو ایک جزو ہے قرآن کا تو معلوم ہو کہ کیا چیز ہے سچ مچ اس وقت وہ تکبیر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ذبح کے وقت کی تکبیر کہ دل میں چھری نکلتی چلی جاتی ہے لیکن اگر کسی کو مزہ نہ آوے وہ تلاوت ترک نہ کرے جیسا بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو اس وقت قرآن پڑھیں گے کہ جب ہم کو مزہ آنے لگے مگر یہ خیال بالکل ہی لغو ہے اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کسی شخص سے کہا جاوے کہ تم مقویات کھانی کر جلدی سے بالغ ہو جاؤ تاکہ تم کو سن بلوغ کے لطف حاصل ہو جائیں اور وہ جواب میں یوں کہے کہ پہلے صاحب سن بلوغ کی لذت صحیح کو میں دیکھ لوں کسی ہوتی ہے تب اس کی تدبیر کروں گا فرمائیے اس احمق کو کس طرح وہ لذت دکھلا دی جائے اور سوا اس کے اور کیا جواب اس کو دیا جاوے گا کہ تم جب بالغ ہو جاؤ گے خود تم کو معلوم ہوں گے اس کے سوا کوئی تدبیر اس کے حصول کی نہیں اسی طرح ان نابالغ پیروں کو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اس لذت کے حاصل کرنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ ہمت کر کے پڑھنے لگو چند روز میں جب تمہارا قلب عالم طفلی سے نکل کر سن بلوغ میں پہنچے گا خود بخود اس کو یہ لذت حاصل ہوگی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ فاضل بلوغ اس وقت حاصل ہوگا کہ تلاوت و دیگر اعمال میں ہوا نفسی کا دخل نہ ہو بلکہ مطلقاً اس ہوا نفسانی کا اتباع چھوڑ دو اور اطاعت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سرگرم ہو جاؤ کہ طریقت کا بلوغ یہ ہی ہے۔

خلق اطفالہ جزو مست خدا ۛ نیست بالغ جزو رسیدہ ازہو

(سوائے اس شخص کے جو قوم کی محبت میں مست ہے ساری مخلوق نابالغ ہے سوائے

اس شخص کے خواہشات نفس کو چھوڑ دیا ہے کوئی بھی بالغ کہلانے کا مستحق نہیں۔)

اور بعینہ یہ ہی غلطی اکثر اہل سلوک کو ہوتی ہے کہ وہ ابتداء میں یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو ذکر میں لذت آنے لگے اور جب لذت حاصل نہیں ہوتی تو پریشان ہوتے ہیں

اور بعض اوقات ذکر کو چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ یہ سخت غلطی ہے کیونکہ ذکر میں لذت آنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ ذکر کی زیادتی کرے۔ جس قدر ذکر زیادہ ہوگا قلب زیادہ مقتاد ہوگا دوسرے خیالات کمزور پڑیں گے۔ ذکر میں خود بخود لذت حاصل ہوگی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ فن شاعری میں جو ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک شعر سن لیا اور طبیعت تلملا گئی ایک عمدہ بات کان میں پڑی کہ چہرہ کھل گیا۔ آخر یہ بات کب پیدا ہوتی ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مدت کے بعد اور کثرت مشق عمارت سے ہوتی ہے۔ اور ابتداء میں ہرگز یہ حالت نہیں ہوتی بلکہ اول اول تو محض مشقت ہی ہوتی ہے۔ دیکھئے بچہ کو مکتب میں بٹھلاتے ہیں سبق فارسی پڑھاتے ہیں مارتے ہیں پکڑ بلاتے ہیں اسی طرح جب سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے اس کو زبان دانی و سخن فہمی کا ایسا سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کلام لطیف سن کر کیسا کچھ محفوظ ہوتا ہے۔ پس کیا کسی شخص نے محض اس وجہ سے کہ ہم کو غالب اور مومن کا سا وجد کیوں نہیں پیدا ہوتا شاعری کی مشق چھوڑ دی ہے یا کسی شاگرد نے اپنے استاد سے یہ فرمائش کی ہے کہ میں اس وقت شاعری شروع کروں گا کہ جب آپ کی طرح مجھے شعر میں لطف آنے لگے گا۔ صاحبو کیا قرآن شریف کی تلاوت اتنی بھی ضروری اور مرغوب نہیں جتنی فارسی اور شاعری کی تحصیل۔ صاحبو جس طرح اس مثال میں ظاہری کیفیات میں ایک وقت وہ تھا کہ نہ تھیں اور اب ایک وقت وہ ہے کہ اعلیٰ درجہ اکمال میں اسی طرح باطنی کیفیات بھی گو اس وقت حاصل نہیں لیکن اگر کام کئے جاؤ گے تو ایک وہ وقت بھی ضرور آوے گا کہ سب حاصل ہو جاویں گی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ کذلک کنتھ

من قبل فمن الله عليكم ۵

اندریں رہ میرا شش و می خراش ۶ تادمے آخر دمے فارغ مباحش
تادم آخر دمے آخر بود ۷ کہ عنایت باتو صاحب سر بود
اس راستہ میں آخر دم تک خراش و تراش و محنت و مشقت سے فارغ مت رہنا کہ

تیرا آخری سانس آخر وقت تک شاید اللہ کی مہربانی سے کارآمد ہو جائے

اس قسم کے مواقع پر حضرت حاجی ادا اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ یہ پڑھا کرتے تھے یہ
یا ہم اور یا نیسا ہم جستجوی میکنم : حاصل آید یا نیسا یا آرزو کے میکنم
میں اس کو پاسکوں یا نہ پاسکوں اس کی جستجو کرتا رہوں گا حاصل ہو یا نہ ہو اس کی
تمنا کرتا رہوں گا

جو کچھ بھی ہو تم کام کئے جاؤ تمہارا کام محض طلب ہے کیونکہ تمہارے اختیار میں
وہی ہے شمر کا ملنا نہ ملنا ان کا کام ہے تم اس کے درپے نہ ہو
فراق و وصل چاہا شد رضائی و مستطلب : کہ حیف با شد از وغیرہ تمنائی
(جدائی اور ملاقات کی پرواہ نہ کر معشوق کی خوشنودی ڈھونڈ، کہ اس سے اس کے سوا
دوسری چیز طلب کرنا قابلِ افسوس ہے)

ایک دوسرے بزرگ اس سے بڑھ کر فرماتے ہیں :

ارید وصالہ دیرید، ہجرے : فاترک ما ارید لسا یرید

(میں چاہتا ہوں اس کا وصال اور وہ چاہتا ہے مجھ سے جدائی پس

میں اس کے ارادہ پر اپنے ارادہ کو قربان کرتا ہوں اور چھوڑتا ہوں)

اور صاحبو اگر یہ نہ کہا جاوے تو کیا خدا سے بدلہ لینا ہے اگر وہ ہمارا کام
نہیں کرتے تو ہم اس کا کام کیوں کریں۔ غور کرو اگر ایک مرد بازار سی عورت
سے تعلق ہو جاتا ہے تو قلب پر کیا کیا صدمے گزرتے ہیں کس کس انداز سے وہ
امتحان اور آزمائش کرتی ہے کتنا موقع بہ موقع ستاتی ہے لیکن آتشِ محبت مشتعل
ہی ہوتی چل جاتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ اس کے امتحانات یا غمزوں سے گھبرا کر اس کو
چھوڑ دیں تو کیا ذاتِ باری جل مجدہ کی محبت اور عظمت مسلمانوں کے دل میں اتنی
بھی نہ ہو جتنی ایک بازار سی عورت کی حیف ہے ہم پر اور ہمارے اس اسلام پر۔
عشق مولیٰ کے کم از یسے بود : گوئی گشتن بہر او اولی بود
دیکھا مولا کا عشق یسے سے بھی کم درجہ میں ہو سکتا ہے گلی کوچوں میں اس کے لئے

گشت کرنا تو اور بھی زیادہ بہتر بات ہے۔

ایک عارف کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کو ایک روز یہ آواز آئی کہ کتنی ہی عبادت کرو کچھ قبول نہیں اس آواز کو ان کے ایک مرید نے بھی سنا دوسرا دن ہوا تو وہ بزرگ پھر عبادت کے لئے اٹھے پھر وہی آواز آئی جب کئی مرتبہ ایسا ہوا تو مرید نے کہا کہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں اُدھر کوئی پوچھتا بھی نہیں اور آپ ہیں کہ خواہ مخواہ گرے جاتے ہیں جب قبول ہی نہیں ہے تو محنت سے کیا فائدہ ان بزرگ نے جواب میں فرمایا ہے تو انی ازان دل بہ پر داختن ۛ کہ دانی کہ بے او تو ان ساختن

کہ بھائی چھوڑ تو دوں لیکن یہ تو بتلا دو کہ چھوڑ کر کس دہ پر جا پڑوں اس جواب پر رحمت باری کو جوش ہوا اور آواز آئی کہ ے

قبول ست گر چہ ہنر نیست ۛ کہ جز ماہ پناہ دگر نیست
کہ اگر چہ تمہاری عبادت تو کسی ڈھنگ کی نہیں لیکن خیر جب ہمارے سوا تمہارا کوئی نہیں ہے تو تم کو بھی ہم ہی لے لیں گے۔ صاحبو طالبین کی یہ حالت ہونی چاہیے کہ ے
طلب کار باید صبور و محمول ۛ کہ نشنیدہ ام کیا گر ملول
(کسی چیز کے طلب کرنے والے کو صبر اور برداشت چاہیے میں نے کسی کیمیا گر کو مایوس و رنجیدہ ہوتے نہیں دیکھا)

افسوس ہے کہ طلب خدا طلب کیمیا کی بھی برابر نہ ہو کہ اس میں تو انسان سالہا سال گنوا دے، مال و متاع غارت کر دے چین و آرام کو خیر باد کہہ دے اور طلب خدا میں کچھ بھی نہ ہو سکے طالب کی تو یہ حالت ہوتی ہے ے

بر انداز برائے دلے بارہا ۛ خورند از برائے گلے خارہا
(اپنے دل کو بار بار اس کے راستہ پر چلا پھول حاصل کرنے کے لئے تو بہت سے کانٹوں کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے)

اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ے

خوشا وقت شوریدگان غمش ۛ اگر ریش بیند گر مرہمش

گدایانی از بادشاہی تفور : بامیدش اندر گدائی بصور
 دامد شراب الم در کشند : اگر تلخ بسند دوم در کشند
 اس کے غم میں مبتلا رہنے والوں کے لئے بہت ہی خوش نصیبی ہے چاہے کوئی زخم
 لگے یا زخم کا مرہم ملے اس کے فقیر بادشاہی سے نفرت کرتے ہیں اس کی مہربانی کی امید میں گدائی
 پر صبر کرتے ہیں۔ اللہ کے خدایا عشق کے غم کی شراب برابر پیتے رہتے ہیں اگر کسی قسم کی تلخی دیکھتے
 بھی ہیں تو خاموش رہتے ہیں۔

اور جو شخص صرف مرہم کا طالب ہو وہ طالب نہیں ہے وہ بچا ہے تو بجائے حصول کی
 امید پر ہی نظر لگائے بیٹھے ہیں جیسا کہ اوپر کے شعر میں ہے امیدش اندر گدائی بصور ایک طالب کا قول ہے
 اگرچہ دور افتادہ بایں امید خود سندی : کہ شاید دست من مار دیگر جانان من گیرد
 (اگر میں دور بڑا ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا معشوق پھر دوسری بار میرا ہاتھ پکڑ لے)
 طالب وہی ہے کہ اگر ہزار مرتبہ اس کو کہا جائے تو وہ زخمی ہے تو مایوس نہ ہو اور وہ
 ہزار مرتبہ کہا جاوے کہ تو جنتی ہے تو کابل اور سست نہ بنے اس کے طلب کی یہ حالت ہے۔

اے برادر بے نہایت درگہی است : ہر کہ بردے میری بر دی مایست
 (مے بھائی اس کے دربار کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے کس جگہ پہنچ کر کوئی یہ کہہ دے کہ میں
 منزل پہ پہنچ چکا ہوں اگر تو کسی منزل پہ پہنچ جاتا ہے تو اب بھی اس کے اوپر اور منزل)
 ایک شخص کی نسبت لکھا ہے کہ اس کو روزانہ یہ آواز آتی کہ تو کافر ہو کر مرے گا جب ایک
 مدت تک یہ آواز آتی تو شیخ سے ذکر کیا انھوں نے فرمایا کہ میاں یہ دشنام محبت ہے مایوس
 نہ ہو جانا محبوبوں کی عادت ہے کہ محب کو چھیڑا کرتے ہیں خوب کہا ہے :
 بدم گفتی و خور سندی عفاک اللہ کو گفتی : جواب تلخ می زید لب لعل شکر خارا
 (تو نے مجھے برا کہا اور میں خوش ہوں اللہ تجھ کو معاف کرے تو نے ٹھیک کہا ہے بیٹھے

بیٹھے سرخ ہونٹوں سے کرا جواب بھی اچھا ہی معلوم ہوتا ہے)

اور یہ ایک قسم کا امتحان ہے لیکن یہ ساری باتیں اس وقت برداشت ہوتی ہیں
 کہ دل میں خدا کی محبت پوری پوری ہو پس اس کی کوشش کرو۔ اور اس طریق کے دو

امر میں ذکر کی کثرت اور اہل اللہ کی صحبت ان کے پاس آنا جانا اس سے تدریجاً ماسوی اللہ رب تمہارے دل سے نکلنے شروع ہو جاویں گے اور یہ حالت ہوگی ۵
 عشق آن شعلہ است کہ چوں بر فردخت
 ہر چہ جز معشوق باقی جسمہ سوخت
 تیغ لا در قتل غیر حق براند
 در نگر آخر کہ بعد لایچہ ماند
 ماند الا للہ باقی جسمہ رفت
 مرحبا لے عشق شریک سوز رفت
 عشق آگ کا ایسا شعلہ ہے کہ جب وہ بھڑک اٹھتا ہے تو معشوق کے سوائے
 جو کچھ ہوتا ہے سب کو جلا دیتا ہے لفظ کا کی تلوار سے اللہ کے سوا ہر معبود کو دور کر دے
 پھر دیکھ اب کیا باقی رہ گیا صرف الا اللہ رہ گیا باقی سب کچھ چلا گیا مبارک ہوئے
 عشق کہ تو دوسروں کی شرکت کو جلانے والا اور دور کرنے والا ہے۔

اس تقریر سے ترتیب سلوک کی یہ نکلی کہ اول کسی صاحب محبت کو ڈھونڈھ کر اس کے پاس جا پڑو اور اس کی حسب ہدایت کام میں لگ جاؤ قرأت کے طالب نہ ہو خود بخود ہوں تو خدا کا فضل سمجھو طاعت میں لذت نہ ہو تو اس کو چھوڑو مت کثرت سے ذکر کرو اس میں قرآن بھی داخل ہے اگر پڑھتے ہوئے طبیعت اکتانے لگے تو اس کی کثرت کرو اگر الفاظ بھی صحیح نہ ہوں تو اپنے امکان بھر کوشش تصحیح کی کرو اگر پوری کامیابی نہ ہو تو دیگر مت ہو اسی طرح قبول ہے الفاظ پر تو انھیں سے گرفت ہوگی جو الفاظ درست کر سکتے ہیں اور پھر نہیں کرتے ورنہ زیادہ تر دیکھ بھال اور چھان بین دلوں کی ہوگی اگر موٹی زبان کا آدمی غلط پڑھتا ہے لیکن دل سے پڑھتا ہے تو خدا کے نزدیک یہ غلط اس صحیح سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کی غرض ریایا اظہار کمال ہو اس موقع پر مجھے ایک شخص کی حکایت یاد آئی ایک شخص مجھ سے تعلق رکھتا تھا مجھ سے کہنے لگا کہ میں کسی فقیر سے طالب ہو جاؤں میں اس پر تاراض ہوا اور سمجھا دیا چند روئے کے بعد پھر آیا تو میں اس سے مزاحاً کہنے لگا کیوں کسی فقیر کے طالب بھی ہوئے تو وہ نہایت خلوص اور سادگی سے جواب دیتا ہے کہ بس اب تو تیرا ہی پلہ پکڑ لیا اس کا یہ تیرا کہنا ہزاروں حضورا اور جناب سے زیادہ لذت بخش تھا، کیونکہ دل سے تھا۔

اس موقع پر بطور جملہ معترضہ کے ایک اور بات بھی کہہ دینی ضروری ہے کہ جس طرح نرمی علاج ہے گرمی بھی اس سے بڑھ کر علاج ہے اور یہی وجہ ہے بھنے بزرگ درشت مزاج مشہور ہو جاتے ہیں تو خوب سمجھ لو وہ درشت مزاج نہیں۔ بات یہ ہے کہ بعض اوقات اگر ایک بات کو نرمی سے سمجھایا جا دے تو دل پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا اور نہ وہ اتنی مدت تک یاد رہتی ہے جتنا کہ بدرشتی سمجھانے سے کالنفش علی الجحیر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس شخص پر ڈانٹ کا یہ اثر پڑا کہ اس کا یہ تذبذب بالکل دل سے نکل گیا اور آنکھیں کھل گئیں۔ غرض غلط بولنا جو پیارا معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ پرفتلت نہیں ہوتی۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں راعی کا قصہ مشہور ہے کہ زمین پر بیٹھا ہوا محبت کے جوش میں خدا تعالیٰ کو خطاب کر کے یہ کلمات کہہ رہا تھا ۵
تو کجائی تا شوم من چا کرست چارقت دوزم کم مشانہ سرت
تو کہاں ہے کہ میں تیری خدمت کروں تیرے پھٹے ہوئے کپڑے سی دوں اور
تیرے سر کے بالوں کو کنگھی کر دوں۔

وامثال ذالک۔ اتفاقاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرف سے گزرے۔ یہ کلمات سن کر فرمایا کہ میاں کس کو کہہ رہے ہو اس نے کہا کہ خدا سے حضرت موسیٰ نے ڈانٹا اور ڈانٹ کر چلے گئے۔ راعی نے جو یہ سنا تو مارے خوف کے تھرا گیا اور سخت پریشان ہوا۔ اسی وقت حضرت موسیٰ پر وحی آئی کہ اے موسیٰ تم نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کر دیا۔ اسی حکایت کو مولانا روم فرماتے ہیں ۵

زین نمط بیہودہ میگفت آن شبان	گفت موسیٰ با کیش لے فلان
گفت با آن کس کہ مارا آفرید	ایں زمین و چرخ آواز آمد پدید
گفت موسیٰ ہائے خیرہ سر شدے	خود مسلمان ناشدہ کافر شدے
گفت لے موسیٰ دہانم دوختی	دز پشیمانی تو جانم سوختی
وحی آمد سوائے موسیٰ از خدا	بندہ مارا چسرا کر دی جدا

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی
 اس طریقہ پر وہ چرواہا فضول باتیں کر رہا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا
 اے شخص تو یہ باتیں کس سے کہہ رہا ہے چرواہے نے کہا کہ میں اس ذات پاک سے بات
 کر رہا ہوں جس نے ہم کو پیدا کیا ہے اور یہ زمین و آسمان اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں
 حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہائے افسوس تو تو برباد ہو گیا تو عموماً مسلمان نہیں رہا
 بلکہ کافر ہو گیا۔ چرواہے نے کہا کہ اے موسیٰؑ تو نے تو میرا منہ سی دیا اور شرمندگی سے
 تو نے میری جان کو جلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل
 ہوئی کہ تو نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کیوں کر دیا۔ تو مجھ سے ملاقات کرنے آتا ہے
 یا میرے بندے کو مجھ سے جدا کرنے کے لئے آتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے جو یہ سنا تو گھبرا گئے اور جلدی سے آکر چرواہے سے معافی چاہی
 چرواہے کی عجب حالت تھی۔ موسیٰؑ نے جو معافی چاہی تو اس نے یہ جواب دیا کہ
 اے موسیٰؑ ایسا تازیانہ لگا ہے کہ میں بڑی دور پہنچ گیا۔ صغ
 آفریں بردست و برباز و سی تو
 تیرے ہاتھوں اور بازوؤں کو شاباش ہے۔

اس جملہ کی حکایت سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اگر زبان پر بوجہ کم سمجھی اور کم عقلی کے
 گستاخانہ الفاظ بھی ہوں لیکن دل محبت سے معمور ہوں تو الفاظ پر نظر نہیں ہوتی لیکن
 یہ ضرور ہے کہ ان فروگزاشتوں کی معافی انہیں لوگوں کے لئے ہے کہ جن کو تصحیح پر قدرت نہیں ہے
 ورنہ اگر قدرت کے باوجود ایسا کرے تو ضرور گناہ گار ہو گا۔

افسوس ہے کہ اس وقت ایسے امر کی طرف سے ایسی بے توجہی ہے کہ لوگ اس کو
 بالکل ضروری نہیں سمجھتے اکثر لوگ پوری درسیات ختم کر جاتے ہیں لیکن ان کو قرآن
 پڑھنے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ سمجھتے ہیں کہ صرف کی کتابوں میں صفات حروف و مخارج پڑھ
 لیتے ہیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے قرآن کا پڑھنا اس
 وقت تک نہیں آتا جب تک کہ خاص کسی سے اس کو نہ سیکھا جاوے۔ ترقی درسیات سے

کچھ نہیں ہوتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم نے مشق نہیں کی تو ہم کو غلط پڑھنا جائز ہونا چاہیے اور ہم کو معذور سمجھنا چاہیے۔ لیکن یہ غلطی ایسا ہے کہ میں نے ایک سپارہ پڑھنے والے طالب علم سے کہا کہ حاجی جی کو بلالہ وہ حافظ جی کو بلالیا میں نے کہا یہ حماقت ہے کہاں حافظ جی کہاں حاجی جی ان کے تو حروف بھی الگ الگ ہیں تو کہتا ہے کہ میں نے مخارج کی مشق نہیں کی تو کیا یہ غلط قبول ہو سکتا ہے تو جیسا یہ شخص اس غلطی سے بچ سکتا تھا اسی طرح جب مشق ممکن ہے تو ایسے اغلاط سے اُن کو بچنا ممکن ہے صاف جو یہ سب بہانے ہیں بات اصل وہی ہے کہ خدا کی محبت اور اس کا خوف دل سے جاتا رہا۔ اگر آج یہ اشتہار دیدیا جائے کہ جو شخص مخارج حروف صحیح کر کے سُنائے اس کو فی حرف پانچ روپے ملیں گے تو آج ہی شہر کے شہر قرات شروع کر دیں اور کچھ نہ کچھ تصحیح کر کے انعام لینے کھڑے ہو جائیں لیکن افسوس ہے کہ خدا کی رضا کے لئے امتنگ نہیں پیدا ہوتی یہ تو تفریط تھی متعلین کی اب افراط سنئے بعض معلین و مصلحین کا کہ جن سے بالکل نہ ہو سکے وہ ان کو بھی مجبور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بدو ان اس کے قرآن پڑھنا ہی بے فائدہ ہے۔ جیسا مشہور ہے کہ ایک پیر جی صاحب نے ایک دیہاتی سے پوچھا کہ روزہ کی نیت بھی یاد ہے۔ اس کو چونکہ کوئی خاص عبارت یاد نہیں تھی اس لئے اس نے کچھ نہیں بتلائی۔ پیر جی صاحب نے فرمایا کہ بے نیت روزہ نہیں ہوتا دیکھ روزہ کی نیت یوں کیا کر۔ بصوم غد نویت اس بیچارہ نے کا ہے کو کبھی الفاظ اس قسم کے سُنے تھے فوراً تو یاد نہ کر سکا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن روزہ نہ رکھا ان ہی بزرگ نے پوچھا تو یہ کہا کہ بلانیت روزہ نہیں اور نیت یاد نہیں ہوتی۔ غرض جو لوگ صحیح پڑھ سکتے ہیں وہ تو صحیح پڑھیں اور جو لوگ اُس پر فتادہ نہیں ان کو جس طرح وہ پڑھ سکیں جائز ہیں۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ خدا ہماری آواز چونکہ اچھی نہیں اس لئے ہم نہیں پڑھتے۔ سو ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ تحسین صوت اس کو نہیں کہتے کہ خوب راگنی سے گا کر پڑھا جاوے تحسین صوت کے معنی جیسا بزرگوں سے منقول ہے یہ ہیں کہ سننے والے کو اس کی آواز سن کر یہ معلوم ہو کہ اس کے دل پر کسی باغظتہ کا رعب چھایا ہوا ہے۔ بات بہت دور جا پڑی اصل مقصود یہ تھا کہ

جب قرآن ایسا مشرف و معظم ہے تو جس ماہ میں اس کا یہ نزول واقعی ہوا ہے وہ بھی معظم ہوگا بالخصوص وہ عشرہ خاص ماہ رمضان کا کہ جس میں شب قدر ہے کیونکہ رمضان کو جب قرآن کی وجہ سے شرف حاصل ہوا تو رمضان کا وہ حصہ خاص جس میں نزول ہوا ہے دوسرے حصوں کی نسبت ضرور اشرف ہوگا اس لئے کہ دوسرے حصوں میں شرف اس حصہ کی بدولت آیا ہے پس جب نزول شب قدر میں ہوا ہے اور شب قدر جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے عشرہ اخیرہ میں ہوتی ہے تو عشرہ اخیرہ حصہ رمضان سے ضرور افضل ہوگا۔ ایک فضیلت تو عشرہ اخیرہ کی اس نزول قرآن سے ہوئی دوسری فضیلت اس کی اس سے ہے کہ اس میں شب قدر ہے جس کی فضیلت کے لئے خدا تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَمَا أَذْرَاكَ مَالِيلَةَ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ۔ کیونکہ حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر عشرہ اخیرہ کی طاق راتوں میں ہے یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ اور بعض حدیثوں میں مطلق عشرہ اخیرہ بھی آیا ہے دونوں کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ایک حدیث دوسری کی تفسیر ہے اور یا اکثر تو طاق راتوں میں ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی جفت راتوں میں بھی ہو جاتی ہے۔ نیز بعض لوگوں کو جفت راتوں میں بھی ہونا مکشوف بھی ہوا ہے تو قوی اور تندہ رست لوگوں کو تو یہ مناسب ہے کہ وہ اس عشرہ کی ہر رات میں اور شبوں سے زیادہ عبادت کریں اور ضعفاء کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ کم از کم طاق راتوں میں ضرور جاگ لیں طاق راتوں میں سے اس وقت ایک رات تو گزر گئی اب صرف چار باقی رہ گئیں ہیں اس میں کوشش کر کے کچھ تو ضرور جاگ لیا جائے صاحبو یہ ایسی برکت اور خیر کی چیز ہے کہ اس سے محروم ہو جانا گویا تمام چیز سے محروم ہو جانا چنانچہ حدیث میں ہے مَنْ حَرَّمَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فَقَدْ حَرَّمَ الْجَزْءَ كُلَّهُ لَيْكِنْ اس میں بعض لوگ یہ سمجھ ہوئے ہیں کہ اگر جاگا جاوے تو تمام شب جاگا جاوے اور اگر تمام شب نہ جاگا جاوے تو کچھ فائدہ نہ ہوگا یہ خیال بالکل لغو ہے۔ اگر اکثر حصہ شب میں بھی جاگ لے تب بھی لیلۃ القدر کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر ساری رات بھی جاگ لیا جاوے تو کیا مشکل ہے۔ صاحبو رمضان سال بھر کے بعد آتے ہیں آپ کو

معلوم ہوگا کہ پچھلے سال رمضان میں بہت سے لوگ ایسے تھے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں رہے، ہم کو کیا خبر ہے کہ آئندہ رمضان تک کس کس کی باری ہے اس لئے اگر ایسی بڑی نعمت حاصل کرنے کے لئے کوئی ایک دو رات جاگ ہی لیا تو کیا وقت کی بات ہے لیکن خیر اگر تمام رات کی ہمت نہ ہو تو اکثر حصہ کو تو چھوڑنا ہی نہ چاہیے اور بہتر یہ ہے کہ اکثر حصہ اخیر شب کا تجویز کیا جاوے کیونکہ اول تو اس وقت معدہ کھانے سے پر نہیں ہوتا دعائیں جی لگتا ہے۔ دوسرے حدیث میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ اخیر شب میں روزانہ اپنے بندوں کے حال پر رحمت خاص متوجہ فرماتے ہیں اس کے علاوہ اخیر شب میں ویسے بھی سکون ہوتا ہے اور اس میں ہر شب شریک ہے کسی نے خوب کہا ہے من لم یعرف قدر اللیلة لم یعرف القدر اور اس قول کی وجہ یہ ہے کہ لیلة القدر انھیں راتوں میں سے کسی رات میں ہوگی تو جو شخص راتوں کی قدر کرے گا وہ لیلة القدر بھی پاوے گا جو بیداری کر کے خواب غفلت میں گراوے گا وہ حسب عادت لیلة القدر سے بھی محروم رہے گا اس لئے بعض بزرگوں نے کہا ہے۔ من احب الستة کلھا ادرک لیلة القدر کیونکہ جب سال بھر تک برابر شب بیداری کرے گا تو لیلة القدر میں عبادت ضرور ہو جاوے گی کہ انھیں راتوں میں ایک رات وہ بھی ہے۔

بوستان میں حکایت ہے کہ کسی شاہزادہ کا ایک لعل شب کے وقت کسی جگہ گر گیا تھا اس نے حکم دیا کہ اس مقام کی تمام کنکریاں اٹھا کر جمع کریں اس کا سبب پوچھا تو کہا کہ اگر کنکریاں چھانٹ کر جمع کی جائیں تو ممکن تھا کہ لعل ان میں نہ آتا اور جب ساری کنکریاں اٹھائی گئی ہیں تو لعل ضرور آگیا ہے کسی نے اُس جملہ کا ترجمہ خوب کیا ہے لے خواجہ چمری از شب قدر نشانی . ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی اے میاں تو شب قدر کی نشانی کو کیا پوچھتا ہے ہر رات قدر کے قابل ہے اگر تو اس کی قدر کرے۔

لیکن خیر ایسے باہمت لوگ تو اس وقت کہاں ہیں کہ وہ اس گوہر بے بہا کی تلاش میں سال بھر شب بیداری کریں مگر رمضان کے عشرہ اخیر میں تو ضرور ہی بیدار رہنا

اور عبادت کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان راتوں میں شب قدر کا ہونا اغلب ہے اور اگر کوئی شخص نہایت ہی کمزور کم ہمت ہو تو خیر وہ ستائیسویں رات کو تو ضرور ہی بیدار رہے کہ وہ شب اکثر شب قدر ہوتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر اتفاق سے وہ رات شب قدر نہ بھی ہوئی اور تم نے یہ گمان شب قدر اس میں عبادت کی تو انشاء اللہ تم کو شب قدر ہی کا ثواب عطا ہوگا اور یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں ہے۔ حدیث میں ہے اس کی اہل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ انما الاعمال بالنیات (در حقیقت اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے) پھر ممکن ہے کہ اس کلیہ سے کسی کی تشفی نہ ہو تو دوسری حدیث موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ الصوم یوم تصوموں والفقیر یوم تفترون والاضعی یوم تضحون (روزہ اسی دن سمجھا جائیگا جس دن تم یقین کر کے روزہ رکھ لو اور اسی دن افطار سمجھا جائے گا جس دن تم یقین کر کے افطار کر لو اور اسی دن قربانی شمار ہوگی جس دن تم یقین کر کے قربانی کر لو) جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک شخص نے نہایت کوشش سے رمضان کے چاند کی تحقیق کی اور اس تحقیق کی بنا پر روزہ رکھنے شروع کر دیئے پھر رمضان ختم پر عید کے چاند کی اسی طرح چھان بین کی اور اس کی بنا پر عید کر لی اسی طرح عید الفضحیٰ میں بھی کیا اور چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ تینوں تحقیق خلاف واقع تھیں تو اس صورت میں دل شکستہ نہ ہونا چاہیے بلکہ جس دن روزہ رکھا وہی دن عند اللہ باعتبار قبول روزہ کا تھا اور جس دن عید کی وہی دن عید کا تھا یعنی روزہ اور عید دونوں مقبول ہیں۔ پس اسی طرح میں کہتا ہوں کہ اگر شب قدر کی نیت سے عبادت ہوئی ہے اور اتفاق سے وہ شب قدر نہ ہوئی تو ثواب شب قدر کامل جاوے گا۔

صاحبو! اس تقریر کے بعد تو بہت ہی آسان معاملہ ہو گیا اب بھی اگر ہمت نہ کی جاوے تو غضب ہے۔ یہ دوسری فضیلت تھی عشرہ اخیر کی۔

تیسری فضیلت اس عشرہ میں یہ ہے کہ اس میں اعتکاف مشروع اور ممکن ہے کہ یہ پہلی فضیلت کا تتمہ ہو جیسا کہ بعض نے کہا کہ اعتکاف شب قدر ڈھونڈنے کے لئے

اور ممکن ہے کہ یہ مستقل فضیلت ہو جبکہ اعتکاف کو دوسری حکمتوں سے مشروع کہا جاوے خیر جو کچھ بھی ہو، ہم کو اس سے کیا غرض ہم کو کام کرنا چاہیے احکام کے حکم اولہ مصالح کی تلاش اور کاوش ہمارا کام نہیں کیونکہ یہ علوم و فنون نہیں ہیں کہ سوچنے اور غور کرنے سے سمجھ میں آجائیں گے یہ الہامی علوم ہیں خدا جس کو دے اس لئے جب تک شرح صدر نہ ہو جاوے اس وقت تک کسی ایک کی تعین نہ کرنی چاہیے دونوں احتمال ہیں۔

اور اس اعتکاف میں دو درجہ ہیں ایک درجہ کمال کا ہے وہ تو یہ ہے کہ بیس تاریخ کو قبل از مغرب اعتکاف میں بیٹھے اور عید کا چاند دیکھ کر باہر نکلے سو یہ ثواب ممکن نہیں ہے کیونکہ دن گزر گیا۔ اور دوسرا درجہ اس سے کم ہے۔ اور وہ یہ دس دن سے کم ہو لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اگر درجہ کمال حاصل نہ ہو تو ناقص درجہ سے حاصل کرنے سے فضیلت حاصل نہیں ہوتی اگر اس قدر نہ ہوگی تو کچھ تو ضرور ہو جاوے گی صاحبو اگر دس دن ممکن نہ ہو سکے ۹ دن ہی اس قدر بھی نہ ہو سکے سات دن ہی سہی۔ غرض جس قدر بھی ہو سکے اور جتنے بھی دن ہو سکے چھوڑنا نہ چاہیے اور ایک بہت بڑی فضیلت اعتکاف کی یہ ہے کہ معتکف کو ایام اعتکاف میں ہر وقت وہی ثواب ملتا ہے جو کہ نمازی کو نمازیں ملتا ہے دلیل اس کی یہ حدیث ہے لایزال احدکم فی الصلوٰۃ ما انتظر الصلوٰۃ جس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر مسجد میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کیا جاوے تو وقت انتظار میں بھی وہی ثواب ہوتا ہے جو کہ وقت ادار الصلوٰۃ میں ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ معتکف جب ہر وقت مسجد میں رہے گا تو اس کو صلوٰۃ کا انتظار ضرور رہے گا اگر یہ سوئے گا بھی تو اس نیت سے کہ اٹھ کر فلاں نماز پڑھنی ہے۔ کوئی کام بھی کرے گا تو اس نیت کے ساتھ کہ فلاں نماز تک یہ کام ہے غرض اس کا سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا ہر ہر حرکت صلوٰۃ کے حکم میں لکھی جائے گی اور اس تقریر کے بعد خیال میں آتا ہے کہ حدیث میں جو آیا ہے المعتکف بیعتکف الذنوب کلھا ویجری لہ لہ الحسنات کلھا۔ الحسنات میں

الف لام عہد کا نہیں جیسا اب تک سمجھا جاتا ہے جس کی بنا تھی کہ اعتکاف میں خاص خاص حنات کا صدور ہوتا ہے کل حنات کا صدور خلافت مشاہدہ ہے بلکہ اشتقاق کا ہو سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ معتکف اپنے ایام اعتکاف میں گوہر نیکی کر رہا ہے اس کو سب نیکیوں کا ثواب ملتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جب انتظارِ الصلوٰۃ صلوٰۃ کے حکم میں ہے اور معتکف منتظرِ الصلوٰۃ ہے تو وہ مصلیٰ کے حکم میں ہوا اور صلوٰۃ ام العبادات ہے تو اس کا ادا کرنے والا گویا تمام عبادتیں کر رہا ہے پس معتکف بجا اعتکاف سب عبادتیں ادا کر رہا ہے۔ صاحبو اس سے زیادہ اور کیا فضیلت ہوگی یہ تقریر تو اس پر مبنی ہے کہ عشرہ اخیرہ میں ایک فضیلت اعتکاف سے ہوئی اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اعتکاف میں جو فضیلت آئی ہے وہ عشرہ اخیرہ کی وجہ سے ہے کہ زمانہ افضل میں عبادت کی زیادہ فضیلت ہوتی ہے۔ لیکن یہ ہم کو کچھ مضر نہیں کیونکہ کبھی زمانہ میں بالذات ہی فضیلت ہوتی ہے جیسا کبھی بالغیر بلکہ اس کے مفروض کے ہوتی ہے جیسا شروع میں بیان ہوا بعد حکایت گفت معشوقے بعاثق الخ کے پس غرض خواہ اعتکاف عشرہ کی وجہ سے فضیلت ہو یا عشرہ میں اعتکاف کی وجہ سے دونوں صورتوں میں اعتکاف کی فضیلت ثابت ہے ہم کو اس کا حاصل کرنا ضروری ہے اس کریمہ کی ضرورت نہیں کہی نے خوب لکھا ہے

بخت اگر مدد کند دانش آدم بکف گریکشد زہے طرب در کسٹم نہی شرف

(نصیبہ) اگر مدد کرے تو میں اس کے دامن کو اپنے ہاتھ سے پکڑ لوں اگر وہ

اپنی طرف کھینچ لے تو بڑی خوشی کا مقام ہے اور اگر میں اسے اپنی طرف

کھینچ لوں تو یہ بھی میرے لئے عزت کی بات ہے۔

صاحبو چار دواؤں کا مرکب آپ کے مرض کو مفید ہے آپ کو اسے استعمال

کرنا چاہیے اس تفتیش کی ضرورت نہیں کہ اس دوا سے اس میں قوت بڑھی

یا اس سے یہ تفتیش دوسرے کا کام ہے جو اس فن کو من حیث الفن حاصل کرے

مریض کا کام صرف استعمال ہے۔

کارکن کار بگزر از گفتار کاندہیں راہ کار باید کار
قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندر ددم بے قدم
کام کرو باتیں کرنے کا کام چھوڑ دو کہ اس راستہ میں صرف کام ہی کام چاہیے
اس راستہ میں کام کے لئے قدم چاہیے باتیں بنانے کی ضرورت نہیں کہ
بغیر عمل کے باتیں بنانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہ فضیلت تو اس عشرہ کے خلاصہ خاص تھی اب ایک اور مضمون عام جو اس
عشرہ اخیرہ کے ساتھ ہی چسپاں ہیں بیان کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ حدیث میں
آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہؓ کے مجمع میں
فرمایا رَغْمِ انْفَةٍ رَغْمِ انْفَةٍ رَغْمِ انْفَةٍ (اس کی ناک کو مٹی لگ جائے یعنی خدا کرے
وہ ذلیل ہو جائے) صحابہؓ یہ الفاظ سن کر گھبرا گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کون شخص آپ نے فرمایا ایک تو وہ شخص کہ اپنی زندگی میں بوڑھے ماں باپ
کو پادے اور ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
بوڑھے کی قید اس لئے بڑھا دی کہ اگر ماں باپ خود جوان ہیں تو اول تو وہ
اس کے محتاج نہیں ہوں گے جیسے اس کے پیر ہاتھ چلتے ہیں ان کے ہاتھ بیر
بھی چلتے ہیں دوسرے ان کی خدمت سے دل بھی نہیں گھبراتا اس لئے اگر ان کی
کچھ خدمت بھی کر دی تو کچھ بڑی بات نہیں بخلافت بوڑھے ماں باپ کے کہ وہ اس
کے محتاج ہوتے ہیں اور چونکہ اکثر قویٰ بالکل کمزور ہو جاتے ہیں خود کچھ بھی
نہیں کر سکتے اور اکثر کام مرضی موافق نہیں ہوتے تو تنگ مزاج بہت
ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ایسے ماں باپ کی خدمت کرنا جو جسم ان کی معذوری
کی ضروری اور ان کی تنگ مزاجی سے تنگ ہو جانا اور نافرمانی کرنا گناہ کبیرہ
ہے مگر اکثر آدمی تنگ ہونے لگتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اپنے
زمانہ طفولیت و عالم احتیاج کو بھول جاتا ہے کہ اس وقت والدین نے کیسے کیسے

ناز اٹھائے ہیں اگر وہ یاد میں تو بڑا نفع ہو۔

ایک بننے کی حکایت مشہور ہے اس نے اپنے بڑھاپے میں ایک مرتبہ اپنے ایک لڑکے سے دریافت کیا کہ بھائی یہ دیوار پر کیا چیز بیٹھی ہے صاحبزادہ اول تو اس پر دل میں بہت خفا ہوئے کہ اس لغو سوال کی آپ کو ضرورت ہی کیا تھی۔ مگر خیر تہذیب سے کام لے کر بتلا دیا کہ ابا جان کو اے بننے نے پھر پوچھا کہ بھٹی یہ دیوار پر کیا چیز بیٹھی ہے۔ صاحبزادہ نے کہا کہ ابھی تو بتلا دیا تھا کہ کو ا ہے۔ تیسری بار اس نے پھر پوچھا تو صاحبزادہ نے بگڑ کر جواب دیا کہ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے چھکے پر پڑے رہو اس پر بننے نے اپنا بھی کھاتہ منگایا اور کھول کر دکھلایا کہ صاحبزادہ دیکھو تم نے ایک سو بار مجھ سے اپنے بچپن میں یہی سوال کیا تھا اور میں نے ہر مرتبہ محبت سے جواب دیا تھا تم دو ہی بار میں گھبرا گئے لیکن شاید کوئی شخص یہ کہے کہ صاحب بوڑھوں کی تنگ مزاجی سے ناگواری امر طبعی ہے اگر اس پر بھی باز پرس ہے تو سخت مشکل کی بات ہوگی تو اس کا جواب یہ ہے کہ امور طبعیہ پر خدا تعالیٰ نے کہیں باز پرس نہیں فرمائی باز پرس امور اختیار یہ میں ہیں۔ کلام مجید اس شبہ کا خود ازالہ فرما رہا ہے۔ پارہ سبحان الذی میں حقوق والدین کو ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے رَبِّكُمْ أَغْلُوْا بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ اِنَّ تَكُوْنُوْا صَاحِبِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلّٰہِ اَبَیْنُ غَفُوْرًا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کی ہر وقت کی تنگ مزاجیوں سے جو گھبراہٹ تمہارے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے یہ تو امر طبعی ہے اگر کوئی خشک کلمہ منہ سے نکل جاوے اس میں معذور ہو لیکن خدا تعالیٰ دل کی نیت کو جانتا ہے اگر دل میں ان کی اطاعت ہے اور غالب تم میں صلاحیت ہے تو ایسی بے اعتنائی سے معذرت کہنے کو بخشد دیتا ہے۔ صاحبو ظاہر نظر میں اس جگہ پر یہ آیت بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے لیکن تقریر بالا سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ مضمون بالا سے کس قدر چپاں ہے۔ اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ قرآن سے کلام اللہ ہونے کی یہ بھی

ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ اس میں ہر ہر بات کے وہ وہ مخفی پہلو لئے گئے ہیں کہ دوسرے کے کلام میں اس قدر رعایات ممکن نہیں اسی طرح کلام مجید کی تمام آیتیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں مگر انہوں نے لوگ کلام اللہ کو رسمی طور پر پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں اس کی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ایک شخص تو غم انفہ کا محل یہ ہوا دوسرا وہ جس کے سامنے میرا نام آوے اور وہ درود نہ پڑھے۔ تیسرے وہ شخص کہ رمضان شریف آئے بھی اور گزر بھی گئے اور اس نے اپنی مغفرت نہ کرائی یعنی ایسے عمل اور توہینہ نہ کر لی جس سے گناہ معاف ہو جاتے۔ ایک دوسری حدیث میں مغفرت سے رمضان کے متعلق کی نسبت ارشاد ہوتا ہے ہوا اللہ ہرادلہ رحمة وادسطة مغفرت و اخرة عتق من النيران (یہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کے پہلے دس دن رحمت کے ہیں اور درمیان دس دن مغفرت کے اور آخری دس دن دوزخ سے آزادی کے ہیں) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رمضان کا مہینہ سراپا رحمت و مغفرت ہے۔ پس اس میں انسان اپنی مغفرت کا سامان کرے اور مغفرت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہی ہے کہ نیک عمل کرے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مغفرت کی تحصیل امر اختیار ہی ہے چنانچہ خدا تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں۔ وَ سَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ الْحَـٰلَـٰتِ جَسَدِ كَافٍ لِّمَغْفِرَتِ اللَّهِ وَ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف دوڑو جس کو متقی لوگوں کے واسطے تیار کیا گیا ہے تو جو شخص اس رستہ چلے اور اس مقرر شدہ قانون پر عمل کرے گا وہ مغفرت کو حاصل کرے گا جو شخص ایسا نہ کرے گا محروم رہے گا پس معلوم ہوا کہ مغفرت کا حاصل کرنا خود ہمارے اختیار میں ہے اور اگر ہم چاہیں اس کو خود حاصل کر سکتے ہیں کہ متقی بن جاویں۔

اس موقع پر بے علم و غفلتوں کی ایک غلطی کا بیان کرنا بہت ضروری ہے کہ وہ غفلتوں میں کہا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ذات بالکل بے پرواہ ذات ہے وہ چاہے تو ایک نکتہ میں بخشدے اور چاہے تو ایک نکتہ میں جہنم بھیج دے اور یہ بات ایسے طور سے کہتے ہیں جس سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون نہیں بلکہ یوں ہی انا پناہ

بے تکے طور پر چمچا رہتے ہیں کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین سننے سے اکثر لوگ بالکل بالوس ہو جاتے ہیں اور عبادت و ریاضت سب چھوڑ بیٹھتے ہیں اس لئے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ خدا جانتا کس نکتہ پر اچانک پکڑ ہو جاوے اور ساری محنت ہی برباد ہو جاوے اسی طرح اکثر لوگ خوب جی بھر کر معاصی کا ارتکاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون ہی نہیں ایک نکتہ ہی پر عذاب ثواب کا مدار ہے تو اپنی خواہشات کو کیوں ترک کریں اور خواہ مخواہ کی مصیبت کیوں اختیار کریں ممکن ہے اسی میں سے کوئی نکتہ پسند آ جاوے کہ اس پر نوازش ہو جاوے گویا کارخانہ خداوندی اپنا ونگر کی سلطنت ہے کہ جہاں سارے کام بے ڈھنگے ہی ہوتے ہیں۔ مشہور ہے کہ چلیہ گرو سفر کرتے ہوئے ایک شہر پہنچے نام پوچھا تو انیا ونگر معلوم ہوا جس کے معنی ہیں بے اتفاقی کا شہر اشار کا نرخ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اناج سے لے کر گھی دودھ تک ہر چیز سولہ سیر ملتی ہے یہ سن کر چلیہ تو بہت خوش ہوا کہ خوب گھی دودھ کھا کر قرہ ہوں گے مگر گرو نے کہا کہ بھائی اس جگہ قیام کرنا مناسب نہیں یہ شہر تو بہت ہی بے تکا معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بڑے میں کچھ امتیاز نہیں مگر چلیہ نے اصرار کیا آخر رہ پڑے۔ چند روز میں سیر کرتے کرتے عدالت کی طرف پہنچے دیکھا کہ ایک مقدمہ راجہ صاحب کے اجلاس میں درپیش ہے اور لوگوں کا ہجوم ہے پوچھنے سے معلوم ہوا کہ کوئی جوہر مدعی ہے مہاجن مدعا علیہ ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ ہم دونوں جوہری کرنے اس کے گھر گئے نقب لگایا میرا رفیق اندر جانے لگا تو دیوار اوپر سے آپڑی مر گیا، قصاص چاہتا ہوں مدعا علیہ سے باز پرس ہوئی کہ وہ دیوار ایسی کیوں بنائی تھی اس نے کہا معمار سے پوچھئے بنانے والا وہ ہے وہ بلایا گیا اس نے کہا گارادینے والے سے پوچھا جاوے اس کو بلایا اُس نے کہا سقہ نے پانی ڈال دیا جس سے گارہ پتلا ہو گیا اس کو بلایا اس نے کہا سرکاری ہاتھی جھپٹا ہوا آتا تھا خوف سے پانی زیادہ نکل پڑا فیل بان کو بلایا اس نے کہا ایک عورت پازیب پہنے آتی تھی اس کی جھنکار سے ہاتھی دوڑ پڑا عورت کو بلایا اس نے کہا سنار نے ایسا ہی باجا ڈال دیا اس کو بلایا وہ کچھ جواب

نہ دے رکھا کہ ہو کہ سنا کہ کو پھانسی دی جاوے پھانسی کے لئے لے چلے جب اس کو پھانسی پر چڑھایا گیا تو پھانسی کا حلقہ اس کے گلے سے بڑا نکلا لوگوں نے آکر راجہ صاحب سے عرض کیا کہ حلقہ اس کے گلے سے بڑا ہے راجہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا تو کسی موٹے آدمی کو پھانسی دے دو عرض موٹے آدمی کی تلاش شروع ہوئی اتفاق سے مجمع بھر میں اس چیلہ سے زیادہ موٹا کوئی نہ نکلا آخر اسی کو تجویز کیا گیا اب تو چیلہ صاحب بہت گھبرائے اور گرو سے کہا کہ خدا کے لئے بچاؤ اس نے جواب دیا میں نہ کہتا تھا یہاں رہنا اچھا نہیں آخر نتیجہ دیکھا آخر گرو نے یہ تدبیر نکالی کہ پھانسی کے وقت خود بڑھ کر کہا کہ صاحبو اس کو پھانسی نہ دو مجھ کو دیدو لوگوں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ اس وقت میں نے جوش میں جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس وقت جو شخص پھانسی دیا جاوے گا وہ سیدھا میکنڈھ میں جاوے گا۔ راجہ صاحب نے جو یہ سنا تو بڑھ کر فرمایا اچھا جب ایسی بات ہے تو ہم کو پھانسی دیدو تاکہ جنت ہمیں حاصل کر لیں۔ چنانچہ راجہ صاحب کو پھانسی دے دی گئی۔ جس کم جہاں پاک صادق ہوا۔ تو ان نیم واعظوں سے ایسے بیانوں سے یوں سمجھا جاتا ہے کہ گو یا نعوذ باللہ کا رخا نہ خداوی بھی دوسرا نیاؤنگریے صاحبو! یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے ہاں ہر کام کا ایک قانون مقرر ہے۔ ثواب کا بھی ایک قانون ہے، عذاب کا بھی ایک قانون مقرر ہے۔ ثواب کا قانون تو یہی ہے جو اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے و سار عواۃ یعنی تقویٰ حاصل کر لو۔ اور مغفرت و جنت لے لو تو معلوم ہوا کہ مغفرت و رحمت کا لینا بالکل ہمارے اختیار میں ہے ورنہ اگر اس کو اختیار میں نہ مانا جاوے تو سار عواۃ کوئی معنی نہیں ہوں گے کیونکہ تکلیف مالا یطاق محال ہے اور خلاف نص ہے اور یہاں امر ہو و مسارعة الی المغفرة کا تو ضرور وہ تحت الاختیار ہے پس جب رمضان کی رحمت و غم انفہ اور مغفرت کا حاصل کرنا ہمارے اختیار میں ہے تو اس کی تحصیل کی کوشش کرو اور اس وعید و غم انفہ کے مصداق نہ بنو۔ اگر یہ خوف ہو کہ تو یہ ٹوٹ جاوے گی اور گناہوں سے باز نہ رہ سکیں گے تو ہمت نہ ہارو کیونکہ پھر تو یہ کر لینا دیکھو اگر ایک کپڑا پھٹ جاتا ہے تو اس کو بالکل پھٹا ہوا نہیں

چھوڑتے کہ سینے کے بعد پھر پھٹ جاوے گا بلکہ سی کر پھر کام میں لائے ہیں پس یہی حالت تو بہ کی ہے کہ محض اس کے ٹوٹنے کے احتمال سے اس کو ترک نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس وقت پھر تو بہ کر لے نا چاہیئے باب تو بہ بند نہیں ہوا بلکہ اگر دن میں سو دفعہ بھی تو بہ ٹوٹ جاوے تو پھر تو بہ کر لو مایوس نہ ہو جاؤ خوب کہا ہے ۔
 باز آ باز آ ہر انچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
 این در گہ مادر گہ نومیدی نیست صد بارہ اگر تو بہ شکستی باز آ
 د پھر آؤ پھر آؤ تم جس حالت میں ہو چلے آؤ اگرچہ کافر ہو یا آتش پرست
 ہو یا بت پرست ہو چلے آؤ۔ ہمارا یہ دربار نا امیدی کا دربار نہیں
 ہے اگر سو مرتبہ بھی تو بہ توڑ چکے ہو جب بھی چلے آؤ۔

بلکہ اسی ترک تو بہ ہی کی وجہ سے ہم کو معاصی پر زیادہ حیرت ہو گئی ہے کیونکہ جو شخص تو بہ کرتا رہے گا اس کے دل میں عظمت خداوندی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور باقی رہے گی یہ بڑا سبب ہے معاصی سے رُک جانے کا برخلاف اس شخص کے جو کبھی تو بہ نہ کرے گا وہ خدا کو بالکل بھول جاوے گا اور جب اس کی عظمت پیش نظر نہ ہوگی تو کچھ بھی اس سے ہو جاوے بعید نہیں۔ یہ مضمون اس عشرہ اخیرہ کے متعلق تھا اور ایک بات اس کے متعلق یاد آئی چونکہ بعض لوگوں کو اس کی ضرورت ہوگی اس لئے اس کا بیان کر دیتا بھی اس مقام پر مناسب ہے۔ بات اگرچہ بہت بُرائی ہے اور بہت دفعہ تقریر اور تحریر لوگوں کے سامنے پیش ہو چکی ہے مگر چونکہ اکثر لوگوں نے اس کو دل سے بھلا دیا ہوگا اس وقت پھر اعادہ کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اس عشرہ میں اکثر مساجد میں قرآن شریف ختم ہوگا اس میں اکثر لوگ پرٹھنے والوں کو کچھ دیا کرتے ہیں سو یہ لینا چھوڑ دو۔ دوسرے اکثر مساجد میں ختم کے دن شیرینی تقسیم ہوتی ہے اس میں جو گڑ بڑ ہوتی ہے سبھی جلتے ہیں اور ان گڑ بڑوں کی وجہ سے جو شرعی قباحتیں اس میں پیدا ہو جاتی ہیں ان کو بھی متعدد مرتبہ بیان کر دیا گیا ہے اس وقت ان کے دہرانے کا وقت ہے نہ چنداں ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ

اس کے مفاسد پر نظر کر کے اس کو بھی چھوڑ دو دیکھو اس کی بدولت بچا لے بعض غریب سچت بار ہو جاتا ہے اس انتظام کے متعلق بعض غریب جلاہوں نے شکریہ میں یہ کہا کہ ہم بہت ممنون ہیں کیونکہ ہم کو چندہ دینے کی مصیبت سے بچا لیا معلوم ہوا کہ لوگوں پر چندہ لینے سے بار ہو جاتا ہے یہ کیونکر جائز ہو گا بعض رئیسوں نے مجھ سے کہا کہ آپ غریبوں کو منع کیجئے لیکن امیروں کو منع کرنے کی ضرورت نہیں حالانکہ یہ خیال بالکل لغو ہے اس لئے کہ اگر امیروں نے چھوڑا تو شرم و حجاب کی وجہ سے غریب سے چھٹنا بہت مشکل ہے اور اگر امیروں نے چھوڑ دیا تو غریبوں کو چھوڑنا کچھ مشکل نہیں بعض مساجد ایسی بھی ہیں کہ ان میں چندہ سے شیرینی تقسیم نہیں ہوتی لیکن وہاں دوسری خرابیاں ہوتی ہیں مثلاً ریا و نمود کے لئے تقسیم کرنا عوام الناس اور بچوں کے ہجوم سے مسجد کی بے حرمتی ہونا لڑکوں کا حصہ مانگنے میں بلاوجہ پٹنا غرض اس قسم کی بہت سی خرابیاں ہیں کہ زیرک آدمی ان کو خود سمجھ سکتا ہے۔ ایک دفعہ بریلی میں قرآن سنانے کا اتفاق ہوا ختم کے روز میرے بھائی نے تقسیم شیرینی کے لئے کہا میں نے منع کیا لیکن انھوں نے کہا کیا مضائقہ ہے۔ ان کا اصرار دیکھ کر میں نے سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ ان کو خود ان خرابیوں کا مشاہدہ ہو جاوے۔ چنانچہ میں خاموش رہا شب کو شیرینی تقسیم کی گئی اور انھوں نے اپنے اہتمام سے خود تقسیم کی۔ لوگوں کے بے ڈھنگے پن کو دیکھ کر وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ بعد تقسیم خود کہا کہ آپ کی رائے بہت صائب تھی واقعی یہ خرافات کبھی نہ کرنی چاہیے اور اس کا احساس ان کی دانشمندی کی دلیل ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض لوگ باوجود خرابیاں سمجھ جانے کے بھی اپنے خیال سے باز نہیں آتے اور اس کو نہیں چھوڑتے۔ یہ احکام تھے عشرہ اخیرہ کے متعلق ان سب کو یاد رکھنا چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ ان پر پورے طور سے عمل ہو جاوے اور جو لوگ حج میں حاضر نہیں ہیں ان کو بھی پہنچا دینا چاہیے اور خدا سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ توفیق عمل میں لاوے۔ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا اٰمِیْن بِحَوْلِہٖ جَاہِلِہٖ سِلِّیْہِ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ ھَلَلِ اللّٰہُ تَعَالٰی

علیہ والیہ واصحابہ وسلم

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً

(رداء البخاری)

دعوات عبدیت جلد دوم

۶

سأتواں وعظ ملقب بہ

اکمال الصوم والعباد

منجملہ ارشادات

حکیم الامتہ مجدد الملتہ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب کھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

محمد عبد المثنیٰ غفرلہ

مکتبہ کھانوی دفتر الاہتمام

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم اے جتھہ روڈ) کراچی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

دعوات عبدیت جلد دوم کا

ساتواں وعظ ملقب بہ

اکمال الصوم والعبادۃ

ابن	مات	سفی	ماذا	من ضبط	الستفون	الشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۲۸ رمضان ۱۳۲۹ھ	۳ گھنٹہ	بیٹھ کر	تذکرہ فقیرات وفات احکام عید	مولوی سید احمد صاحب تقریباً ۲۵۰	

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله وحده نستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرورنا ونقستنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له وشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا ونبينا ومولانا محمداً عبده ورسوله صلى الله عليه وسلم - اما بعد فقد قال النبي صلى الله عليه وسلم - شهر رمضان - هو شهر اوله رحمة ووسطه مغفرة وآخره عتق من النيران -

فضائل رمضان کے متعلق گزشتہ جمعہ میں مبسوط مضمون بیان ہو چکا ہے

آج صرف دو مضمونوں کا بیان کرنا مقصود ہے ایک بقیہ رمضان المبارک کے متعلق اور دوسرا عید کے متعلق۔ اس حدیث شریف کو اس لئے اختیار کیا گیا کہ اس میں دونوں مضمونوں کے متعلق ذکر ہے۔ یہ حدیث شریف ایک بڑی حدیث کا جزو ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان المعظم کے آخری جمعہ کے دن خطبہ میں پڑھا تھا اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری جمعہ میں ایک خاص خطبہ پڑھا جو کہ اور جمعوں میں نہ پڑھتے تھے۔ مسلمانوں کے تعجب ہے کہ انھوں نے اس منصوص خطبہ پر توجہ نہ کی اور شعبان کے آخری جمعہ کے لئے کوئی خاص خطبہ تجویز نہ کیا جس سے وہ عامل بالسنت ہوتے اس کے بجائے رمضان کے آخری جمعہ کے لئے ایک خاص خطبہ الوداع اختراع کیا جس کا کہیں حدیث میں پتہ نہیں اور پھر اس کے ساتھ ایسا شغف ہوا کہ بغیر اس خاص خطبہ کے پڑھے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گویا جمعہ ہی نہیں ہوا اگرچہ بکرا اللہ اس وقت لوگوں کو اس کے نہ پڑھنے سے وہ وحشت جو کہ اس کے قبل ہوتی تھی نہیں ہوتی لیکن تاہم اب بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کہ اس خاص الوداعی خطبہ کو آخری جمعہ رمضان کا لازمی عمل سمجھتے ہیں اور بڑا تعجب تو یہ ہے کہ بعض اہل علم کو بھی دھوکا ہو گیا اور وہ سخت غلطی میں مبتلا ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ آخری جمعہ کے لئے کوئی خاص خطبہ تجویز نہ کرنا بدعت ہے لیکن چونکہ اس کی وجہ سے لوگ اکثر جمع ہو جاتے ہیں اس لئے اس کو اجتماع کے لئے معین اور ادارہ صلوٰۃ کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے باقی رکھنا چاہیے حالانکہ یہ سخت غلطی اور من وجہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنا ہے۔ غلطی تو اس لئے کہ شریعت کا مشہور حکم ہے کہ اگر کسی کام کے کئے میں سچھ مصلحتیں بھی ہوں اور کچھ مفاسد بھی ہوں تو وہ کام بالذات یا بغیر مطلوب شرعی نہ ہو تو ان مفاسد پر نظر کر کے اس کام کو ترک کر دیں گے اور مفاسد سے بچیں گے مصالح کا اعتبار نہ کریں گے۔ اور یہ ایک کلیہ و قاعدہ ہے جس کو اہل علم بخوبی سمجھ گئے ہوں گے لیکن عوام کے سمجھانے کے لئے میں اس کو ایک مثال میں عرض کرتا ہوں۔ مثلاً ایک شخص مجلس رقص منعقد کرے

اور کہے کہ اگرچہ رقص فی نفسہ ممنوع اور حرام ہے لیکن میری غرض اس مجلس سے لوگوں کو جمع کرنا ہے تاکہ جمع ہو جانے کے بعد میں اپنی وجاہت سے کام لے کر ان کو نماز پڑھتے پر مجبور کروں اور اس طرح ان کو نماز پڑھنے کی عادت ہو جائے تو دیکھتے بظاہر اس مجلس کی غایت کس قدر خوبصورت ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو نماز پڑھنے کی عادت ڈالی جاتی ہے لیکن چونکہ اس مجلس میں ایک مصلحت کے ساتھ بہت سے مقاصد بھی ہمہدوش ہیں اور مجلس رقص بالذات یا بالغیر مطلوب نہیں جیسا کہ ظاہر ہے اس لئے شریعت اس مصلحت مذکورہ کی وجہ سے اس کی اجازت نہ دے گی بلکہ اس کے مفاسد پر نظر کر کے اس مجلس کے انعقاد سے باز رکھے گی۔ ہاں اگر کوئی کام بالذات یا بالغیر مطلوب ہو اور اس میں مصلح کے ساتھ مفاسد بھی ہوں تو اس کام کو ان مفاسد کی وجہ سے ترک نہ کیا جاوے گا بلکہ اس کو باقی رکھ کر مفاسد کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جاوے گی مثلاً عید گاہ کا اجتماع اداۓ صلوٰۃ کے لئے شرعاً مطلوب ہے پھر اگر لوگ اپنی بدتمیزی کی وجہ سے اس میں کچھ خرابیاں آمیز کر لیں جیسا کہ مثلاً آج کل عام طور سے بچوں کو عید گاہ لے جانے کا رواج ہو گیا ہے جس کو دیکھو وہ اپنے ساتھ ایک دم چھٹا ضرور لے ہے اور حیرت تو یہ ہے کہ باوجود ہر سال تکلیف اٹھانے کے پھر بھی لوگوں کو اس کی ذرا حس اور تمیز نہیں ہوتی شاید کوئی سال ایسا ہوتا ہو کہ بچے عید گاہ میں جا کر عین نماز کے وقت روتا بسورتانہ شروع کرتے ہوں بلکہ ایک دو تو ان میں سے ہگ موت بھی دیتا ہے۔ خود میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ میرے ایام تعلیم میں ایک میرا عزیز کم عمر میرٹھ کی عید گاہ میں والد صاحب کے ساتھ گیا اور اس نے نماز کے وقت قضاۓ حاجت کی فرمائش کی اس کی فرمائش سن کر سخت پریشانی ہوئی اول تو عین نماز کا وقت دوسرے میرٹھ کی عید گاہ جس میں ہزاروں آدمیوں کا مجمع کہیں قریب ایسا جنگل بھی نہیں جس میں اس کو بٹھلادیا جاتا پھر نماز کھڑے ہونے کا وقت بالکل

قریب آخر یہ تجویز ہوئی کہ ایک حلوائی کو چار آٹے دیئے گئے اس نے اپنے تنجنے کے نیچے ان کو بٹھالیا چاروں طرف سے کپڑا لٹکا ہوا تھا اوپر رنگ برنگ کی مٹھائی اور اندر یہ تحفہ بھرا ہوا تھا یہاں ایک عبرت ناک مضمون خیال میں آیا کہ یہ بھی حالت ہم لوگوں کی ہے کہ اس مٹھائی کی طرح ہمارا ظاہر تو نئے نئے انداز سے پر رونق اور چمکنا چیرا رہتا ہے لیکن ہمارے باطن کی یہ حالت ہے کہ گودر گومرغی کا گوہو لائے نفسانی سے لبریز یہ ہودہ خیالات سے پُر خدا سے دور شیطان سے قریب ایک محقق نے خوب فرمایا ہے

از بروں چوں گور کا فر پر حلل و اندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید و از درد نت تنگ میدارد یزید
ظاہر کے اعتبار سے تو کافر کی قبر کی طرح ہے جو کپڑوں سے آراستہ ہے
حالانکہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب ہے۔ تو نے اپنی ظاہری
حالت ایسی بنا رکھی ہے کہ تو حضرت یازید بیطامیؓ پر طعنہ کرنے والا ہے
حالانکہ تیرے باطن سے یزید بھی شر مانتا ہے۔

صورت تو ایسی مقطع کہ معلوم ہو کہ اگر وحی منقطع ہو نہ چکی ہوتی تو حضرت جبریل
انھیں کی خدمت میں آتے۔ اور دل کی یہ حالت کہ شیطان کے بھی شیطان جیسا حدیث
میں ہے۔ السنہہ اخلی من السکر و قلوبہم امر من الذیاب یدبسون جلود
النفان (ان کی زبانیں تو شکر سے بھی زیادہ شیریں ہیں اور ان کے قلوب بھیڑیلوں سے
بھی زیادہ سخت ہیں جو پہنے ہوئے ہوں بھیڑیلوں کی کھالیں) غرض عید گاہ کی حاضری
میں مصلحت بھی ہے اور مقصد بھی ہے تو اگر کوئی عاقل پہلے کلیہ کی بنا پر یہ کہے
کہ ان مفاسد کی وجہ سے عید گاہ کا اجتماع بھی چھوڑ دینا چاہیے جس طرح رخصت
کی مجلس باوجود ایک مصلحت کے کثرت مفاسد کی وجہ سے واجباً ترک ہوئی
تو اس سے کہا جاوے گا کہ چونکہ عید گاہ کا اجتماع شریعت میں مطلوب ہے اس لئے اس موقع پر
وہ قاعدہ نہ بڑتا جاوے گا اور عید گاہ اور عید گاہ کا جانا ترک نہ کیا جاوے گا بلکہ بجائے اس کے
ان مفاسد کی اصلاح کی کوشش کی جاوے گی یعنی مثلاً لوگوں سے کہا جاوے گا کہ بچوں کو

عید گاہ میں لے کر نہ آیا کریں اور اگر کسی کو اس اجتماع کی مطلوبیت میں کلام ہو جیسا اس وقت بعض نام کے مشائخ بجائے عید گاہ کے اپنی مسجد ہی میں بلا ضرورت صرف امتیاز کے لئے عیدین پڑھتے ہیں تو میں اس کا ثبوت حدیث سے دیتا ہوں دیکھئے مسجد نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے لیکن باوجود اس کثرت ثواب کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس موقع پر عید گاہ میں تشریف لے گئے اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز نہیں پڑھی پس معلوم ہوا کہ عید گاہ کا اجتماع ایک مہتمم بالشان مطلوب ہے اور ممکن ہے کہ عید گاہ کے ثواب میں بجائے کثرت کمی کے کیفاً کثرت ہو جاتی ہو یعنی وہ ایک ثواب ہی ان پچاس ہزار ثواب سے زیادہ ہوتا ہو اور اسی کثرت کیفی کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کو چھوڑ کر عید گاہ جاتے ہوں اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بچے کے سامنے ایک گنی اور دس روپیہ پیش کئے جاویں تو بچہ دس روپوں کو عدد میں زیادہ دیکھ کر انھیں کو اٹھالے گا۔ اگر کسی بڑے آدمی کے سامنے ان دونوں کو پیش کیا جاوے تو وہ روپوں کو چھوڑ دے گا اور گنی اٹھا کیونکہ گنتی میں گوا ایک اور دس کا فرق ہے لیکن کیفاً وہ ایک اُن دس سے زیادہ ہے پس اسی طرح ممکن ہے کہ عید گاہ کے اجتماع میں کیفاً اس قدر ثواب ہو کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتماع میں وہ نہ ہو اور ہر چند کہ یہ تضاعف ثواب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص ہے فرائض کے ساتھ اور اس وجہ سے ممکن ہے کہ کسی کو استدلال مذکور میں خدشہ ہو کہ صلوٰۃ عیدین میں یہ تضاعف مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ تھا۔ پس استدلال تام نہیں سو جواب یہ ہے کہ واجب بھی ملحق ہوتا ہے فرض کے ساتھ پس دونوں کا یکساں حکم ہو گا اور عید گاہ کے اجتماع میں بالخصوص یہ بھی بھید ہے کہ مسلمان مختلف اطراف سے سمٹے ہوئے ہر ایک میدان میں جمع ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کا اجتماع ان کے بدخواہوں کے قلب پر موثر ہوتا ہے اور اسلامی شوکت ظاہر ہوتی ہے اور یہ اعظم مقاصد ملت سے ہے اور اس خاص اجتماع میں مطلق اجتماع جو محقق ہے وہ خود بھی اسرار مہتمم پر مشتمل ہے چنانچہ ایک ادنیٰ راز یہ ہے کہ سب کی عبادات مجتمع ہو کر جو سرکار میں پیش

ہوں گی اگر بعض قابل قبول ہوئی تو اس کی برکت سے بقیہ بھی مقبول ہوں گی اور انہیں حکمتوں سے شرع میں جماعت کا بہت اہتمام ہے حتیٰ کہ جماعت کی نماز اگر دوسو سوں کے ساتھ بھی ہو تو تب بھی تنہا نماز سے بدرجہا بڑھ کر ہے اس لئے کہ وہ شرعاً مطلوب ہے اور قطع و ساوِس اس درجہ مطلوب نہیں ہے

چوں طمع خواہد ز من سلطان دین خاک بر فرق قناعت بعد از این
افسوس ہے کہ بعض اکابر کو یہ دھوکہ ہو گیا کہ اگر جماعت کی نماز میں دس سو آدمی اور تنہائی میں اجتماع قلب ہو تو تنہا بڑھنا بہتر ہے جماعت کو چھوڑ دینا چاہیے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اس کو ہم اپنی رائے سے غلط نہیں کہتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی تغلیظ فرمائی ہے ہم ان بزرگوں پر اعتراض نہیں کرتے ہم صرف ان کی غلطی کا اظہار کرتے ہیں غرض چونکہ شریعت میں اجتماعی مصالح کی زیادہ رعایت ہے اور ظاہر ہے کہ جو اجتماع عید گاہ میں ہوگا مسجد میں نہ ہوگا لہذا گو گما عید گاہ کا ثواب زیادہ نہ ہو لیکن کیفاً زیادہ ہے اس لئے باوجود کسی مفید کے اس میں جمع ہونا ترک نہ کریں گے بلکہ اس میں جو مفید بچوں کے اجتماع کا ہے اس کی اصلاح کریں گے اور ہم خود کیا اصلاح کریں گے ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام خود اس کی اصلاح فرما گئے ہیں ارشاد ہے جذبوا مساجدکم وہیبا نکو داپنی مسجدوں سے اپنے بچوں کو علیحدہ رکھو کہ اپنی مسجدوں سے اپنے بچوں کو علیحدہ رکھو لیکن ممکن ہے کہ کوئی صاحب عید گاہ کو مسجد میں داخل نہ کریں اس لئے استدلال مذکور کو کافی نہ سمجھیں تو ہم اس کا جواب دیں گے کہ مساجد کم میں دو احتمال ہیں یا تو اس کو عام لیا جاوے کہ مطلق مقام صلوٰۃ مراد ہو تب تو عید گاہ کا اس حکم میں دخل ہونا ظاہر ہے اور اگر اس کو عام نہ کیا جاوے تو گو ان الفاظ میں عید گاہ داخل نہ ہوگی لیکن یہ کیسے چاہیے کہ آخر علت اس حکم کی کیا ہے شو ظاہر ہے کہ علت اس حکم کی یہی ہے کہ چونکہ بچے پاک و صاف نہیں ہوتے ان کی آمدورفت سے ایسی جگہ کے ملوث ہونے کا اندیشہ ہے جہاں نماز ہوگی اور اس سے نماز میں خلل پڑے گا اور یہ علت جیسے کہ مسجد میں پائی جاتی ہے عید گاہ میں بھی پائی جاتی ہے لہذا وہاں بھی یہ حکم جاری ہوگا چنانچہ خود عید گاہ کے

باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ولینغیرنزلن ای محض المصلیٰ البتہ الگ رہیں حالۃ غور تو اس عید گاہ سے) پس اس مثال سے سمجھ میں آگیا ہوگا۔

کہ وہ کلیہ اس وقت ہے جبکہ وہ امر مطلوب نہ ہو ورنہ مفسدہ کی اصلاح کریں گے اور اس کام کو ترک نہ کریں گے۔ یہ تو دعویٰ غلطی کی دلیل میں تھا، رہا دوسرا دعویٰ کہ خطبۃ الوداع میں مصلحتیں بیان کرنا من وجہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض ہے سو اس کا بیان یہ ہے کہ جب بعض بدعتیں بھی بوجہ مصلح مطلوب ہوئیں تو گو کیا اس شخص کے نزدیک کتاب و سنت کی تعلیم نا تمام ہوئی کہ بعض مصلح ضروریہ کی تعلیم میں فروگزاشت ہو گئی کیا کوئی اس کا قابل ہو سکتا ہے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بدعت کو ضلالت فرمایا ہے اور بعض بدعت کے حسنہ ہونے سے اگر شبہ ہو تو درحقیقت وہ بدعت ہی نہیں اور اس قسم کا احتمال خطبۃ الوداع میں نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر یہ معنی سنت ہوتا تو سلف میں اس کی نظیر ضرور ہوتی پھر بعد عرق ریزی کے اگر کوئی دور کی نظیر نکال بھی لی جائے تو دوسرے مانع کا کیا جواب ہوگا کہ عوام کے التزام سے بدعت ہو گیا اور بدعت بھی بدعت ضلالت جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناز کی وعید فرما رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عین ارشاد حق ہے تو ایسے امر کا التزام اور اس میں مصلحتیں نکالنا خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض بھی ہے اور خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مزاج بھی ہے لیکن ہمارے اس قول سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ارشاد خداوندی ہے کوئی یہ نہ سمجھ جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد نہ فرماتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد ضرور فرماتے تھے لیکن آپ کا اجتہاد موقوف رہتا تھا اگر وحی میں اس پر تکلیف نہ ہو تب تو وہ حجت رہتا تھا کیونکہ سکوت اس کی تقریر پر دلالت کرتا ہے ورنہ وحی سے اس کی اصلاح ہو جاتی تھی غرض ہر حال میں وہ اجتہاد بھی حکماً وحی ہو جاتا تھا لہذا باوجود وجود اجتہاد کے بھی یہ کہتا صحیح ہے ۵

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اہل علم کی ایسی ہی لغزشوں کی وجہ سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ بعض لوگ بدعات

میں مصالح بیان کرتے ہیں اور اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے یہ کہا جاتا ہے کہ تربیت اور ارشاد خصوص حکمت فہمی اور اجتہاد ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے چند اصطلاحات یاد کر کے مستند ارشاد یہ پر متمکن ہو جاوے بلکہ یہ اس شخص کا کام ہے کہ ظاہری ضروری علم کے ساتھ مدد خداوندی بھی اس کے ساتھ ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ علماء امت نے اس کے اقوال کو قبول کر لیا ہو اور علماء کا گروہ اس کی طرف متوجہ ہو چناںچہ اس قسم کی ایک لغزش یہ ہے کہ بعض لوگ جمعہ کی نسبت کہتے ہیں کہ دیہات میں گو نہ ہو لیکن اگر پڑھ ہی لیا جاوے تو نہ پڑھنے سے تو بہر صورت پڑھنا اچھا ہے میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ اسی طرح ایک شخص کہتا ہے کہ بھئی میں گوج نہیں ہوتا لیکن اگر پھر بھی کر لیا جاوے تو کیا حرج ہے نہ کرنے سے تو اچھا ہے اس کا کیا جواب ہے آخر یہی کہو گے کہ بھئی گج کا محل نہیں ہے مگر کہو گاد دیہات جمعہ کا محل نہیں غرض فہم دین کے لئے عقل کامل کی ضرورت ہے اس میں ظاہر بینی اور بھولا بھالا ہونے سے کام نہیں چلتا اور یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء کامل العقل ہوئے ہیں کوئی نبی بھی بھولا نہیں ہوا۔ اکثر لوگ بزرگوں کی تعریف میں کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ بہت بھولے ہیں لیکن یاد رکھو کہ بھولے ہونے سے اگرچہ بعض وقتاً انسان بہت سی برائیوں سے بچ جاتا ہے اور اس لئے بھولا ہونا بھی گو نہ فضیلت ہے لیکن فی نفسہ بھولا ہونا کوئی کمال نہیں ہے کیونکہ اس سے آدمی بہت سے فضائل سے محروم رہتا ہے اس لئے کوئی نبی بھولا نہیں ہوا تمام انبیاء کرام کامل العقل ہوئے ہیں اور واقع میں عقل ہے بھی بڑی نعمت۔ ایک صوفی سے میرے سامنے ایک شخص نے سوال کیا کہ سالک کا مرتبہ بڑا ہے یا مجذوب کا انھوں نے اس کا عجیب جواب دیا مجھے وہ جواب بہت ہی پسند آیا فرمانے لگے کہ اتنا تو ہم جانتے ہیں کہ عقل اتنی بڑی نعمت ہے کہ شریعت نے شرب خمر کو حرام کر دیا جس سے وہ زائل ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ سالک کی عقل ٹھکانے رہتی ہے اور مجذوب عقل سے باہر ہوتا ہے اب تم خود سمجھ لو کہ سالک کا مرتبہ بڑا ہے یا مجذوب کا مشرح الصدور علامہ سیوطیؒ کی ایک کتاب ہے وہ اس میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت

فرمایا کہ اے عمر اس وقت تمھاری کیا حالت ہوگی کہ جب تم قبر میں تنہا رکھے جاؤ گے اور دو عجیب الخلفت فرشتے تم سے آکر توحید و نبوت کے بارے میں سوال کریں گے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اور کس قدر پیارا جواب عرض کیا اور اگر وہ بھی یہ جواب نہ دیتے تو کون دیتا عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیے کہ اس وقت ہماری عقل رہے گی یا نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں عقل باقی رہے گی بلکہ عقل میں اور ترقی ہو جاوے گی (کیونکہ بیولانی حجاب اس وقت باقی نہ رہیں گے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر عقل باقی رہے گی تو کوئی خوف کی بات نہیں انشاء اللہ سب معاملہ درست ہوگا۔ دیکھئے یہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہما عقل کی کس قدر عزت کرتے تھے اور اس کو کتنی بڑی نعمت سمجھتے تھے ایک ہم لوگ ہیں کہ ذباب عقل کو امارات بزرگی سے سمجھتے ہیں ایک قصہ اس مقام پر یاد آیا گو میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا اور اس لئے ممکن ہے کہ غلط ہو لیکن اس کے غلط ہونے سے ہمارا ضرر نہیں کیونکہ ہم تو اپنے مضمون کو حدیث سے موید کر چکے ہیں وہ قصہ یہ ہے کہ حضرت رابعہؓ کو جس وقت دفن کیا تو حسب قاعدہ فرشتوں نے آکر سوال کیا تو حضرت رابعہؓ نہایت اطمینان سے جواب دیتی ہیں کہ کیا اس خدا کو جسکو عمر بھریا درکھا گزہ بھرزہ میں کے نیچے آکر اُسے بھول جاؤں گی تم اپنی خبر لو کہ بڑی مسافت طے کر کے آئے ہو تم کو بھی یاد ہے کہ نہیں سبحان اللہ ان حضرات کا بھی کیا اطمینان ہے اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ۵

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست گویم آنکس کہ ربوداں دل دیوانہ ما
(اگر منکر نکیر آکر پوچھیں گے کہ تمھارا رب کون ہے تو کہوں گا کہ وہی ہے جو ہمارے
اس دیوانے دل کو لے گیا ہے)

کیسے اطمینان سے فرماتے ہیں کہ میں تو یہ جواب دیدوں گا کہ ع
آنکس کہ ربوداں دل دیوانہ ما

تو یہ سارا اطمینان بقا عقل ہی کے ساتھ ہو سکتا ہے اس لئے اس صوفی نے یہ کہا کہ

بھائی سالک کا رتبہ بڑا ہے کیونکہ اس کی عقل باقی رہتی ہے جس کی بدولت اس کو سینکڑوں مصیبتوں سے نجات ہو جاتی ہے لیکن اب یہ سمجھنا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام تو سب کے سب کامل العقل ہوئے جو صوفیاء میں جو کہ انبیاء ہی کے نائب ہیں کچھ سالک یعنی کامل العقل اور کچھ مجذوب یعنی جن کی عقل علیہ حالات سے مغلوب ہو گئی ان میں یہ دو قسمیں کیوں ہوئیں سو اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو سب کے سب ارشاد و تربیت کی غرض سے بھیجے گئے تھے اس لئے ان کا کامل العقل ہونا ضروری تھا کیونکہ اس کے بغیر تربیت نہیں کر سکتے تھے اور اولیاء بعض تو ارشاد و خلق کی غرض سے پیدا ہوتے تھے ان کو تو سلوک کا مرتبہ عطا ہوتا ہے تاکہ بقائے عقل کے ساتھ تربیت کا کام انجام دے سکیں اور یہی لوگ ہیں جن کو در ثمتہ الانبیاء کہا جاتا ہے اور بعض محض اپنے ہی کام کیلئے پیدا ہوتے ہیں ان کے متعلق تربیت نہیں ہوتی مجذوبین ان ہی میں ہوتے ہیں گو بعض غیر مجذوبین بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی یہ شان ہوتی ہے کہ

احمد تو عاشقی بیشیخت ترا چہ کار دیوانہ باش سلسلہ شریعت نشد نشد

مخلاف سالکین کے کہ ان کی حالت ان کی حالت کے بالکل خلاف ہے ان کی حیات ہے کہ صر خاص کندیندہ مصلحت عام را

ہاں مجذوبین سے بھی ایک قسم کا فیض ہوتا ہے جو بلا ان کے اختیار کے محض وجود یا وجود کی بدولت ہے سو اس کے لئے بھی عقل کی ضرورت نہیں عقل کی ضرورت اس فیض کے لئے ہے جو باختیار ہو غیر اختیاری فیض کی مثال آفتاب کا نور ہے کہ گو آفتاب قصد نہ کرے لیکن اس کا نور عالم کو پھر نور ضرور کرے گا۔ اسی طرح اللہ کے نیک بندے جہاں کہیں ہوتے ہیں ان کی برکات عالم کو منور ضرور کرتے ہیں اسی برکت کی نسبت ارشاد خداوندی ہے۔ ما کان اللہ لیعدن بھودانت فیہم (جب تک آپ ان لوگوں میں اللہ بھی ان لوگوں کو عذاب نہیں دے گا) جیسا کبھی اس کا عکس بھی ہوتا ہے کہ بدکاروں کی بدولت اچھے لوگ تباہ و ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس سے پہلا قاعدہ ٹوٹ گیا کیونکہ وہ اچھے لوگ جو کہ ان بدکاروں کی وجہ سے تباہ

و ہر باد ہوئے یا تو وہ صبوراً اچھے ہوتے ہیں واقعے میں اچھے نہیں ہوتے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام سے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ فلاں شہر کو الٹ دو۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کی اے اللہ اس شہر میں فلاں شخص رہتا ہے جس نے کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی کیا اس کو بھی سب کے ساتھ الٹ دوں ارشاد ہوا کہ گو ظاہراً اُس نے نافرمانی نہیں کی مگر دوسروں کی نافرمانی دیکھ کر اس میں کبھی تغیر پیدا نہیں ہوا لہذا اس کو بھی الٹ دو دیکھئے یہ شخص ظاہری حالت میں ایسا بزرگ تھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو بھی دھوکا ہو گیا لیکن واقع میں ایک بہت بڑے گناہ میں مبتلا تھا کہ اس کو خدا تعالیٰ اور اس کے احکام کے ساتھ محبت کا جوش ذرا نہیں تھا ورنہ یہ ممکن نہیں کہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہو اور ان کی مخالفت و نافرمانی دیکھ کر یا شریعت کا استحقاق سن کر اس کے دل میں مخالفین سے غیظ نہ پیدا ہو یا اس کو ان کی حرکات ناگوار نہ ہوں اگر کسی دیندار کو ایسے امور ناگوار ہوتے ہیں تو اس کو متعصب اور بد مزاج کہا جاتا ہے اور یہ رائے دی جاتی ہے کہ صاحب نرمی سے جواب دینا چاہیے تھا مگر میں کہتا ہوں کہ کسی شخص سے یہ کہا جاوے کہ ہم نے تمہاری ماں کو بازار میں بیٹھے ہوئے بازاری عورتوں کے حرکات میں مبتلا پایا ہے تو کیا یہ شخص اپنی ماں کی نسبت ٹھنڈے دل سے یہ الفاظ سن لے گا اور کہنے والے پر حملہ کرنے کو آمادہ نہ ہو جاوے گا کیا اُس کے اُس جوش کو تعصب کہا جاوے گا اس کو بھی ایسی رائے دی جاوے گی مگر مولویوں پر الزام ہے کہ یہ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں اور ان کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے یہ بڑے متعصب ہیں لیکن صاحبو ذرا غور کیجئے اور انصاف سے کام لیجئے کوئی مولوی بھی سیدھی بات پر خفا نہیں ہوتا نہ کسی مولوی کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے اگر پوچھنے کی طرح ان سے پوچھا جائے اور بات کرنے کی طرح ان سے بات کی جاوے تو کوئی وجہ نہیں کہ مولوی غصہ کریں اور خفا ہوں، ہاں جہان کے ساتھ استہزا اور خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر اعتراض بطور عناد کیا جاتا ہے تو ضرور وہ بے تاب ہو جاتے ہیں اور غصہ یا کجیابی

تعصب نہیں ہے یہ دین کی حیثیت ہے صاحبِ جو کیا شریعت کے احکام کی وہ عظمت اور محبت بھی دل میں نہ ہونا چاہیئے جو کہ اپنی ماں کی ہے کہ ماں کے نسبت ناگوار کلمات سن کر تو انسان قابو سے باہر ہو جائے اور اپنے آپے میں نہ رہے اور شریعت کی ہمتک ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کو غصہ بھی نہ آ جاوے اور جن کو غصہ نہیں آتا وہ نا حقیقت شناس ہیں اس لئے ان کو غیرت نہیں آتی کچھ دنوں اس رنگ میں اپنے قلب کو رنگو اور پھر بھی اگر یہ حالت رہے تو جانیں۔ صاحبِ جو محض الفاظ کے سننے سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ کیفیت کیونکر ہو جاتی ہے وجہ یہ ہے کہ اپنے اوپر یہ حالت گذری نہیں کسی نے خوب کہا ہے۔

پرسیدہ کے عاشقی چھیت گفتم کہ چونما شوی بدای
کسی شخص نے بوجھا کہ عاشقی کیا چیز ہے۔ میں نے کہا کہ جب تو ہمارے جیسا ہو جائے گا خود ہی جان جائے گا۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تقلیداً کہہ رہا ہوں لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جن حضرات کی تقلید اختیار کی ہے ان کو سچا سمجھتا ہوں۔ صاحبِ جو ان حضرات کی غیرت کی یہ حالت تھی کہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دور کرنے والی چیزوں کو گو وہ چیزیں ان کی کیسی مرغوب و محبوب ہوں طاغوت سمجھتے ہیں۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک پرندہ اس میں اڑ کر آ گیا اور چونکہ باغ نہایت گنجان تھا باہر نکل جانے کے لئے اس کو کوئی راستہ نہ ملا پریشانِ ادھر ادھر اڑتا پھرنے لگا۔ اس پرندہ کی یہ حالت دیکھ کر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے دل میں باغ کے گنجان ہونے پر گونہ مسرت پیدا ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ ما شاء اللہ کہ میرا باغ کس قدر گنجان اور اس کے درخت ایک دوسرے سے کیسے پیوستہ ہیں کہ کسی پرندہ کو بھی باہر نکل جانے کی جگہ نہیں ملتی۔ یہ خیال آگیا لیکن چونکہ دل میں عظمت و محبت خداوندی معراجِ کمال پر تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پُر برکت سے فیضیاب تھے اس لئے فوراً ہی تنبیہ ہوا اور دل میں سوچے کہ اے طلحہ تیرے دل میں مال کی یہ محبت کہ حالتِ نماز

میں تو اُدھر متوجہ ہو آخر نماز کے بعد بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے باغ نے آج مجھے عین نماز کی حالت میں خدا سے غافل کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیا لہذا اس کو میں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا اور اس غفلت عن الحق کے کفارہ میں اس کو وقف کرتا ہوں آخر اس کو وقف کر دیا جب دل کو اطمینان ہوا ان حضرات کی یہ شان ہے کہ اذا مسہو طائف من الشیطان تنکر و اذا ہو مبصر و ان کہ اگر شیطان کے دوسرے کسی ضعیف درجہ میں بھی ان کے قلب کو میلان الی الدنیا ہو جاتا ہے تو فوراً متنبہ ہوتے ہیں اور ایسا قلق ہوتا ہے کہ گویا ہفت اقلیم کی سلطنت ان کے قبضہ سے نکل گئی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت نکل جانے میں بھی اتنا صدمہ نہیں ہوتا جو ان حضرات کے قلب پر اس میلان سے ہوتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ۵

بہرچہ دوست دامانی چہ کفران حرف چہ ایمان بہرچہ از یار دور رفتی چہ زشت آں نقش چہ زیبا
جو کلمات دوست سے ملانے والے ہیں اس میں کفر کے کلمے ہوں یا ایمان کے برابر ہے اور جو نقش دوست سے دور کرنے والا ہے وہ اچھا ہو یا بُرا سب برابر ہے۔

شاید لوگوں کو یہ تعجب ہے کہ ذرا سا خیال آج لانے سے ان کے دل پر ایسا صدمہ کیسے گذرا تو سمجھ لینا چاہئے کہ ان لوگوں کے نزدیک تمام دنیا بھی شغلِ حق کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتی ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

بر دل سالک ہزاراں غم بود گم نہ باغ دل خلائے کم بود
اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے تو اللہ والوں کے دل پر ہزاروں غم چھا جاتے ہیں۔

ایک خلال اتنا قیمتی ہے کہ دنیا تمام اس پر فدا ہے اور دنیا تو کیا ان کو مطلوب ہوتی عالمِ آخرت کی طرف بھی ان حضرات کی توجہ صرف اس لئے ہے کہ وہ ان کے مطلوب یعنی رضائے حق کا محل ہے ورنہ ان کی یہ شان ہے کہ ۵

باتو دوزخ جنت است اے جاں فزا بے توجہ دوزخ است لے دل ربا

اے میری جان کو بڑھانے والے تیرے ساتھ رہ کر تو دوزخ بھی جنت ہے
اور اے میرے محبوب تیرے بغیر جنت بھی میرے لئے دوزخ ہی ہے۔

اور مولانا یہ بھی فرماتے ہیں ۵

گفت معشوقے بعاشق کلے فتنے تو بغربت دیدہ پس شہر ہا
پس کد امی شہرا ز آہنا خوشتر شست گفت آں شہرے کہ دیشے دلبرست
کسی معشوق نے اپنے عاشق سے کہا کہ اے میاں تو نے سفر کی حالت میں بہت
سے شہر دیکھے ہیں تو ان میں سے کونسا شہر تیرے نزدیک پسندیدہ ہے۔

جنگل میں اگر محبوب کا ساتھ ہو جاوے تو ہزار آبادی سے بڑھ کر ہے شاید کسی
کو یہ شبہ ہو کہ یہ اقوال غلبہ حالت و دلولہ محبت کے ہیں کوئی واقعی تحقیق نہیں
ہے تو یاد رکھو کہ اس کے بارہ میں نص موجود ہے۔ حدیث میں ایک صحابی حضرت
ثوبانؓ کا واقعہ آیا ہے کہ وہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہم جنت میں گئے
بھی تو ہم کو وہ درجہ تو نصیب نہیں ہو سکتا جو درجہ آپ کا ہوگا اور جب
ہم اس درجہ پہ نہ پہنچ سکیں گے تو آپ کے دیدار سے محروم رہیں گے اور
جب آپ کا دیدار نصیب نہ ہوگا تو ہم جنت کو لے کر گیا کریں گے حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر سکوت فرمایا آخر وحی نازل ہوئی کہ من یطعم اللہ والرسول
فالثلاث مع الذین انعم اللہ علیہم الایہ (جو شخص اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم
کی فرمانبرداری کرتا ہے وہ قیامت میں ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام
فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا) جب حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے ان کی تسلی فرمائی یعنی یہ ضرورت نہیں کہ اس درجہ میں عارضی طور پر
پہنچنے کے لئے اسی درجہ کے اعمال کی ضرورت ہو صرف اتباع اور محبت نبی کافی
ہے جیسے دربار شاہی میں خدمت گار محض معیت و خدمت شاہ کی وجہ سے دیگر
رؤسارے پہلے پہنچتا ہے اس لئے مع الذین فرمایا اگے ذالک الفضل میں بھی تصریح

بھی فرمادی ہے کہ اس کو اپنے اعمال کا اثر مست سمجھنا یہ محض فضل ہے اور واقع میں اگر غور کیا جاوے تو صاف معلوم ہوگا کہ ہمارا دین اور ایمان اور ہماری دنیا اور سب سامان ہماری نماز ہمارا روزہ ہمارا ثواب درجات جو بھی کچھ ہے سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی طفیل ہے۔ چنانچہ ان آیات کے شان نزول کے انضمام سے صاف معلوم ہوتا ہے جن میں ارشاد ہوتا ہے ذلک الفضل من اللہ وکفی باللہ علیہما اس کا یا تو یہ مطلب ہے کہ اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں یہ محض فضل خداوندی ہے کہ تم کو ایک بہانہ محبت سے یا ربیابی کی دولت نصیب ہو گئی اور یا یہ مطلب ہے کہ ذلک الفضل سے بعض مغلوب الیاس لوگوں کی ناامیدی دور کرنا ہے کہ شاید کسی کو یہ خیال ہو جاوے کہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ ہم اس درجہ تک پہنچ سکیں تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے کہ اگرچہ تم اس قابل نہیں لیکن نعمت تمہارے اعمال کی جزا نہیں ہے کہ تم ان پر نظر کر کے اس نعمت سے بالوسس ہو جاؤ یہ تو محض خدا تعالیٰ کا فضل وجود ہے جس کے لئے تمہارے اعمال کامل ہونے کی ضرورت نہیں ہے سبحان اللہ قرآن پاک بھی کیا عجیب چیز ہے کہ دو متعارض شے ایک عجیب دوسرا یا اس اور ایک جملہ میں دونوں کا جواب خواہ یوں کہہ لو خواہ یوں کہہ لو

بہارِ عالم حش دل و جان تازہ میدارد ہرنگ اصحاب صورت را بہوار باب معنی را
اس کے عالم حسن کی بہار دل کو بھی اور جان کو بھی تازہ رکھتی ہے جو
رنگ و روپ کو پسند کرتے ہیں ان کو صورت کے ذریعہ اور جو لوگ
اندرونی حقیقتوں کا خیال رکھتے ہیں ان کو اپنی خوشبو سے تازہ اور خوش
رکھتا ہے۔

ہر مذاق ہر طبیعت ہر رنگ کا علاج قرآن میں موجود ہے پس روایت ثوبان
رضی اللہ عنہ سے بھی یہ بات بالکل صاف معلوم ہو گئی کہ

یا تو دوزخ جنت است اے جانفزا بے توجہ دوزخ است اے دلبر با
کیونکہ ان کے اس خیال پر انکار نہیں فرمایا گیا بلکہ تسلیم کر کے تسلی کی گئی غرض یہ
مضمون بالکل سنت کے موافق ہے نہ انکے تصوف یا شاعرانہ نہیں۔ سو یہ ہے ان
حضرات کی شان کہ دونوں عالم بھی ان کے نزدیک خدا تعالیٰ کی رضا یا نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی لقا کی برابر نہیں خوب کہا ہے ۵

قیمت خود ہر دو عالم گفتم نرخ بالا کن ارزانی ہنوز

تو اپنی قیمت یہ دونوں عالم بتلاتے ہیں قیمت اور بڑھاؤ یہ تو بہت سستا ہے

محبت اور غیرت کی تو خاصیت ہی ہے کہ جب یہ بڑھ جاتی ہے تو سب کچھ چھوٹ جاتا ہے
حضرت ابراہیم بن ادہم نے غیرت ہی میں سلطنت چھوڑ دی تھی اور وجہ اس سب کی
یہ ہوتی ہے کہ ایک حالت میں دو طرف توجہ کرنی پڑتی ہے اور یہ ممکن نہیں اس واسطے
مجبوراً ایک طرف کی توجہ کو ترک کر دینا پڑے گا۔ اب رہی یہ بات کہ کس جانب کو
ترک کیا جاوے تو ظاہر ہے کہ توجہ الی اللہ کی دولت تو قابل ترک نہیں لہذا
دنیا ہی پر لات مار دیتے ہیں خوب کہا ہے ۵

بفراغ دل زمانے نظرے بہارے روئے بہ از آنکہ چہر شاہی ہمارو رہائے ہوئے

دل کے اطمینان کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے محبوب کی طرف نظر کرنا اس سے بہتر ہے

کہ سر پر شاہی تاج ہوا اور سارے دن ہوتا ہوا ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم نے اسی کے تحصیل کے لئے سلطنت پر لات مار دی لیکن
انبیاء علیہم السلام پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جب دو طرف کامل توجہ نہیں ہو سکتی
اور یہ حضرات علی سبیل الیقین جیسا کہ حکمت بعثت شاہد ہے متوجہ الی الخلاق
تھے اور جب متوجہ الی الخلق تھے تو توجہ الی اللہ یقیناً کم ہوگی اور جب یہ کم
ہوگی تو نقص ہوگا۔ اور نقص اس لئے منافی نبوت ہے کہ مرتبہ نبوت مبرا
کمال کے اعلیٰ پایہ کا نام ہے کہ بشر کو اس سے بڑھ کر مرتبہ عطا ہو ہی نہیں
سکتا۔ پس اگر ان کو بھی جانا جاوے اور اس کی وجہ سے کامل فرض کیا جاوے

تو کیا وجہ کہ ان میں انقطاع عن الخلق جو لازمہ کمال ہے نہیں پایا جاتا وجہ اس شبہ کی گنجائش نہ ہونے کی یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جو توجہ الی الخلق ہوتی ہے وہ چونکہ بامر خداوندی ہے لہذا اس امتثال کی وجہ سے اس توجہ الی الخلق میں خود توجہ الی اللہ موجود ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام امت کی طرف جو متوجہ ہوتے اور ان کو پیغام حق پہنچاتے ہیں سو اسی لئے کہ اس توجہ اور تبلیغ کا ان کو حکم ہے اور اس کا امتثال ان پر واجب ہے حضرت انبیاء علیہم السلام اس توجہ الی الخلق کے ساتھ توجہ الی اللہ کی مثال یہ ہے کہ اگر تم کسی آئینہ کی طرف اس لئے متوجہ ہو کہ اس میں تمہارے محبوب کا عکس نظر آ رہا ہے جب کہ کسی وجہ سے خود اس کے عین کو نہ دیکھ سکو تو گو ظاہر تمہاری توجہ آئینہ کی طرف ہے لیکن عین یہ توجہ عین محبوب کی طرف توجہ ہے اسی طرف انبیاء علیہم السلام کے لئے تمام خلایق مرآت ہیں جس کی طرف متوجہ ہونے سے مقصود اُن کا توجہ الی الخلق ہے پس ان کے لئے توجہ الی الحق سے مانع نہیں غرض مہمان حق غیر حق کی طرف متوجہ ہونے سے غیرت کمر تے ہیں اور اسی صفت غیرت سے ان میں جوش دین پیدا ہوتا ہے جس کو لوگ تعصب کا غصہ سمجھتے ہیں اور وہ ایسا مطلوب ہے جس کے نہ ہونے سے وہ شخص اُلٹ دیا گیا پس یہ شخص ظاہر میں نیک تھا اور واقع میں نیک نہ تھا پس وہ قاعدہ نہ ٹوٹا یا اگر وہ واقع میں بھی نیک ہوں تو وہ صورت ہلاک ہوتا ہے اور معنی رحمت بہر حال یہ بات ثابت رہی کہ نیکوں کی بعض برکات اضطراری بھی ہوتی ہے جس میں قصداً اور اختیاراً کی ضرورت نہیں لیکن جو برکت اختیاری ہوگی اس کے لئے عقل کامل وافر کی احتیاج ہے سو ایسے ہی لوگ جو کامل العقل ہیں اہل ارشاد ہوئے ہیں اور بعض اولیاء اللہ جن سے کوئی تربیت عام کام متعلق نہیں ہوتا ایسے لوگ البتہ بھولے بھالے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی سپرد صرف اپنی ذات کا معاملہ ہے اور اس میں وہ اسی قدر کے مکلف ہیں جس قدر ان کو عقل دی گئی ہے کسی دوسرے شخص کی تربیت اُن کے متعلق نہیں سو حاصل یہ ہوا کہ جن لوگوں کے متعلق تربیت عام ہے جیسے انبیاء

امت مسند ارشاد پر متمکن ہیں ایسے لوگ بھولے بھالے نہیں ہوتے یہ لوگ بڑے فطین پورے عاقل ہوتے ہیں اور یہی کامل ہیں اور جن لوگوں کے متعلق کسی دوسرے کی تربیت نہیں ہوتی بلکہ محض اپنے ہی نفس کیلئے پیدا ہوتے ہیں یہ لوگ البتہ بھولے بھالے نہیں اس لئے بعض نے یہ تقسیم کی ہے کہ انسان چار قسم کے ہیں ایک وہ جن کو دین کی عقل بھی ہے اور دنیا کی بھی جیسے انبیاء علیہم السلام اور ورثۃ الانبیاء یعنی وہ علماء مسند ارشاد پر متمکن ہیں دوسرے وہ جن کو دین کی عقل ہے اور دنیا کی نہیں جیسے بھولے بھالے صلحاء اولیاء امت تیسرے وہ جن کو دین کی عقل نہیں ہے اور دنیا کی عقل ہے جیسے عاقل کفار چوتھے وہ جن کو نہ دنیا کی عقل نہ دین کی عقل جیسے بیوقوف کفار غرض انبیاء اور علماء محققین کامل العقل ہوتے ہیں۔ گو تجربہ میں اس لئے کمی ہو کہ وہ دنیاوی امور میں منہمک نہیں ہیں۔ بعض لوگوں نے اس میں عجب خلط کر دیا ہے کہ عقل اور تجربہ کو ایک چیز سمجھتے ہیں اس میں فرق نہیں کرتے اور چونکہ علماء کو تجربہ کار نہیں پاتے اس لئے علماء کو کم عقل اور بیوقوف کہتے ہیں، حالانکہ تجربہ دوسری چیز ہے اور عقل دوسری چیز ہے تجربہ تکرار مشاہدہ جزئیات کا نام ہے مثلاً سقمونیا کو دس مرتبہ آزمایا گیا اس نے اسہال کا فائدہ دیا تو اس مشاہدہ تکرار سے کہیں گے کہ سقمونیا مہل ہے اور عقل ایک قوت ہے جو خدا تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کی ہے جس سے کلیات کا ادراک کرتا ہے۔

مولوی محمد حسین عظیم آبادی سے جو کہ میرے ایک دوست تھے ان کے طالب علمی کے زمانہ میں ایک کالج کے طالب علم نے سوال کیا کہ آسمان پر کل کس قدر ستارے ہیں انہوں نے فرمایا مرصودہ تو معلوم ہیں مگر غیر مرصودہ معلوم نہیں اس طالب علم نے کہا کہ مولوی صاحب تعجب ہے کہ سائنس کا اتنا ضروری مسئلہ اور آپ کو اس کی اطلاع نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا اچھا بتائیے سمندر میں کس قدر مچھلیاں ہیں اس طالب علم نے کہا کہ مجھے تو علم نہیں۔ تو مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ افسوس ہے آپ اس قدر سائنس کے دلدادہ ہیں اور

آپ کو زمین کی چیزوں کی بھی اطلاع نہیں پھر جب آپ کو ہنوز زمین کی بھی پوری اطلاع نہیں ہے تو مجھ کو آسمان کے تاروں سے اطلاع نہ ہونا کیا تعجب ہے یہ جواب سن کر ان طالب علم صاحب کی آنکھ کھلی اور ہوش آیا اس طرح لوگ صنّاع قوموں کو کہتے ہیں کہ یہ بڑے عاقل ہیں حالانکہ وہ صرف ایک صنعت کے تجربہ کار ہیں لہذا ان کو صنّاع کہنا چاہیے نہ کہ عاقل صنّاعی دوسری چیز ہے عاقل ہونا دوسری بات ہے۔ اگر ہم ایک بڑی فلسفی مثلاً افلاطون کو ایک جلاہے کے گھر لے جا دیں اور اس کی کارگاہ میں بٹھلا دیں اور کہیں کہ ایک مہینہ تنزیب بنو تو یقیناً وہ اس پر فتادرنہ ہوگا۔ اور جلاہا عمدہ سے عمدہ بن وے گا اس فرق کی وجہ سے یہ کہیں گے کہ یہ جلاہا اس فلسفی سے زیادہ عاقل ہے، ہرگز نہیں ہاں یہ کہیں گے کہ یہ فلسفی اس صنعت کو اس قدر نہیں جانتا جس قدر یہ جلاہا جانتا ہے۔ پس علماء محققین خواہ تجربہ کار نہ ہوں مگر کامل العقل ہوتے ہیں اور یہی ورثۃ الانبیاء ہیں۔ انہی کے متعلق ارشاد و تربیت کا کام ہوتا ہے۔ پس ان کے ساتھ احکام و حکم دینے میں کسی کو حق مزاحمت نہیں ہے جیسا کہ اس فتاعہ شرعیہ کو کہ مقصدہ کی وجہ سے مصلحت غیر ضروریہ کو چھوڑ دیتے ہیں نہ سمجھنے سے بعض کو غلطی ہوگئی کہ وہ علماء سے مزاحمت کرنے لگے غرض جو چیز مطلوب نہ ہو اور اس کے ارتکاب میں مقصدہ بھی ہو تو اس کو ترک کر دیں گے۔ جب یہ قاعدہ کلیہ معلوم ہو گیا تو اب سمجھنا چاہیے کہ الوداع کا خطبہ کسی دلیل سے شرعاً مطلوب نہیں ہے اور اس کے پڑھنے میں بہت سے مفاسد ہیں لہذا اس کو ضرور ترک کیا جاوے گا رہی یہ بات کہ لوگ اس بہانہ سے آجاتے ہیں اگر یہ نہ ہوگا تو لوگ نماز میں آنا چھوڑ دیں گے سو سمجھ لینا چاہیے کہ جو لوگ خدا کے لئے نماز پڑھتے ہیں وہ تو ہر حالت میں آویں گے خطبہ و دواع پڑھا جاوے یا کوئی دوسرا خطبہ اور جو لوگ محض پابندی رسم کے لئے آتے ہیں وہ اگر اس کے ترک سے آنا چھوڑ بھی دیں تو ان کے اس خیال سے ہم ایک مقدمہ

قباح کے کیوں مرتکب ہوں خواہ وہ آدمی یا نہ آدمی۔

ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اگر نکاح بیوگان کا ذکر نہ کرو تو میں وعظ میں آؤں، میں نے کہا کہ تو آج ضرور ہی بیان کروں گا تمہارا۔ جی چاہے آؤ نہ جی چاہے نہ آؤ دین کسی کے آنے کا محتاج نہیں۔

رعشق ناتمام ماجال یار مستغنی ست باب درنگِ دُخال خطبہ حاجت لکھنویا
جس کا حسن ذاتی حسن ہے اس کو تکلفات کی اور کسی کے دیکھنے نہ دیکھنے کی کیا پرواہ ہے
خواہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے وہ بالکل مستغنی ہے، اسی طرح ہم کسی کے آنے نہ آنے
کی پرواہ نہ کریں گے اور شرع کو محض اس مصلحت سے نہ چھوڑیں گے۔ ہمارے
اکابر سلف کا اس استغناء مذکور پر پورا عمل تھا۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ
عنه کے زمانہ خلافت میں جبکہ ابن اسہم غسانی جو کہ ملوک غسان میں سے تھا مسلمان
ہوا موسم حج میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ ایک دوسرا غریب آدمی بھی ساتھ
طواف کرتا تھا اتفاق سے اس غریب آدمی کے پاؤں کے تلے اس کی ازار کا کنارہ
دب گیا جب آگے بڑھا تو اس کی لنگی کھل گئی اور برہنہ رہ گیا۔ چونکہ وہ اپنے کو
بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا اور یہ دوسرا شخص نہایت غریب آدمی تھا لہذا اس کو بہت
غصہ آیا اور اس نے ایک طاپچہ اس زور سے مارا کہ اس پتھر سے اس کا دانت ٹوٹ گیا
وہ شخص اس حالت کو لئے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں پہنچا
عرض کیا کہ امیر المؤمنین جبکہ نے میرا دانت توڑ دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا
کہ جبکہ کو ہمارے پاس بلا لاؤ۔ صاحبو غور کیجئے یہ امتحان کا وقت ہے کہ ایک بادشاہ
کو ایک غریب آدمی کے معاملہ میں پکڑ کر بلایا جاتا ہے۔ چنانچہ جبکہ کو لایا گیا حضرت
عمر رضی اللہ عنہ نے واقعہ دریافت فرما کر اس غریب شخص کو اجازت دی کہ جبکہ سے
اپنا بدلہ لے لے۔ جبکہ نے جب یہ سنا تو طیش میں آکر کہا کہ امیر المؤمنین مجھ کو ایک
معمولی بازاری غریب آدمی کو کس چیرنے برابر کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام نے
اور اس میں امیر غریب سب برابر ہیں تم نے اس کا دانت توڑا تمہارا دانت ضرور

توڑا جاوے گا دیکھتے یہ ہے اخوتِ اسلام ایک آج وقت ہے کہ امراءِ در و سارِ عالم ہی اس عالم سے جدا اور بڑا لا ہے غربا کو وہ گویا انسانیت ہی سے خارج سمجھتے ہیں لیکن اگر اسی گئے گذرے وقت میں بھی اگر اس کا کچھ اثر باقی ہے تو اللہ والوں میں ہے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے ہاں ایک بڑے عہدہ دار کوئی شخص مہمان آئے جب کھانے کا وقت ہوا تو حضرت نے اپنے ساتھ ان کو بٹھلایا کیونکہ وہ بڑے آدمی سمجھے جاتے تھے ان کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر دوسرے غریب طلبہ مہمان پیچھے کو ہٹے۔ حضرت مولانا نے فرمایا صاحبو آپ لوگ کیوں ہٹ گئے کیا اس وجہ سے کہ ایک عہدہ دار میرے ساتھ بیٹھا ہے خوب سمجھ لیجئے کہ آپ لوگ میرے عزیز ہیں میں جس قدر آپ کو معزز سمجھتا ہوں اس کے سامنے ان کی کچھ بھی وقعت نہیں چنانچہ سب غریب طلبہ کو بھی ساتھ بٹھلا کے کھلایا شاید اس سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ مولانا نے اپنی شان جتلانے کو ایسا کہہ دیا ہو گا خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہاں شان اور بڑائی کا نام بھی نہ تھا جن صاحبوں نے مولانا کو دیکھا ہے تو وہ خوب جانتے ہیں مگر جن لوگوں نے نہیں دیکھا ہے ان کے لئے ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے اندازہ ہو گا کہ وہاں شان اور بڑائی کتنی تھی۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا حدیث شریف کا درس دے رہے تھے ابرہہ رہا تھا کہ اچانک بوندیں پڑنا شروع ہو گئیں جس قدر طالب علم شریک درس تھے سب کتاب کی حفاظت کے لئے کتابیں اٹھا کر بھاگے اور سہ درمی میں پناہ لی اور کتابیں رکھ کر جوتے اٹھانے چلے صحن کی طرف جو رخ کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت مولانا سب کے جوتے سمیٹ کر جمع کر رہے ہیں اس واقعہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہاں کس قدر شان کو جتلا یا جاتا تھا شان نہ تھی بلکہ محض محبتِ دینی تھی کہ غریب کو امراء سے کچھ کم نہیں سمجھا یہ ہی لوگ ہیں کہ جن کی بدولت دنیا کا کارخانہ قائم اور نظام عالم مسلسل ہے جس دن یہ حضرات نہ رہیں گے قیامت قائم ہو جاوے گی

غرض یہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا امتحان تھا جس میں وہ پورے اترے آگے جیلہ کا امتحان ہے کہ دیکھیں کیا سمجھ کر ایمان لایا ہے آیا کوئی دنیاوی غرض عروہ جاہ کی ہے کہ مسلمان ذی عزت ہوتے چلے جا رہے ہیں ان کے ہمرنگ ہو جاویں گے تو ہم کو بھی عزت نصیب ہوگی یا یہ کہ محض طلبِ آخرت کے لئے ایمان لایا ہے چنانچہ بعض لوگ بزرگوں سے بھی اس لئے ملتے ہیں کہ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں ان کو بڑا سمجھتے ہیں اگر ہم ان کے ساتھ رہیں گے ہماری بھی عزت ہوگی اکثر چھانٹ چھانٹ کر ایسے ہی بزرگوں سے بیعت ہوتے ہیں کسی جلاہے تیلی کے گو وہ کیسا ہی بزرگ اور نیک ہو مرید نہیں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ محض مدعی ہیں بس ہم کو نہ طلبِ صادق ہے نہ محبتِ واقعی جہاں اپنی دنیاوی غرض پوری ہوتے دیکھتے ہیں چار قدم بڑھادیتے ہیں یہ نہ ہو تو یہ بھی نہیں ایسے ہی لوگ ہیں جو کہ امتحان کے وقت ادھورے اترتے ہیں عند الامتحان یکرم الرجل اور یہاں خوب کہنا صوفی نہ شود صافی تا در نکشد جائے بسیار سفر باید تا پنجنہ شود خائے کوئی صوفی اس وقت تک صاف دل نہیں ہوتا جب تک کہ جائے یعنی کسی کمال کے در پر نہ پڑا رہے بہت سفر چاہئے تب خامی دور ہو کر کھینگی حاصل ہوتی ہے چنانچہ جیلہ کا امتحان ہوا اور وہ اس میں ناکام ثابت ہوا یعنی اس نے کہا کہ اچھا مجھے ایک دن کی مہلت ہو سکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہو سکتی ہے اگر یہ شخص مہلت دے صاحبِ حق سے پوچھا گیا وہ بیچارہ اس قدر نیک دل تھا کہ اس نے اجازت دیدی جیلہ موقعِ پاکِ رات کو اٹھ بھاگا اور رومیوں سے جا ملا اور بدستور سابق نصرائی ہو گیا دیکھئے اس کو طلبِ صادق اور محبتِ واقعی دین سے نہ تھی کہ ذرا دہمیِ ذلت کے خوف سے دین چھوڑ دیا جس کا نتیجہ ابد الابد کی ذلت ہے ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھئے کہ ذرا پرواہ نہ کی کہ یہ امیر ہے دوسرا غریب ادھر اس کو دیکھئے کہ ذرا سی تکلیفِ نفس پر گوارا نہ کر سکا۔ ایسے بہت لوگ ہیں کہ وہ اتباعِ شریعت محض نفعِ دنیاوی کے لئے کرتے ہیں لیکن جو خدا کے مخلص بندے ہیں ان کی یہ حالت ہے

ان پر کچھ بھی گزر جائے مگر ان کو حق کے مقابلہ میں سب بیچ معلوم ہوتا ہے۔
 کشندانہ برائے دلے بارہا خورند از برائے گلے خارہا
 ایک دل کی دل داری کے لئے بارہا تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور ایک پھول کے
 لئے بہت کانٹے کھاتے ہیں۔

اور پھر چاہے طلب اور جستجو میں عمر بھی ختم ہو جاوے مگر گھبراتے اکتاتے نہیں کیونکہ
 ان کی طلب صادق طلب ہے اور ان کو معلوم ہوتا ہے کہ محبوب اور مطلوب کون
 ہے وہ زبان حال سے یوں کہتے ہیں کہ

طلب گار باید صبور و حمول کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول
 یعنی فن کیمیا کا طالب اکثر ساری عمر طلب میں برباد کر دیتا ہے اور ہمیشہ ایک
 تاؤ کی کسر میں رہتا ہے۔ لیکن آپ نے کسی طالب کیمیا کو نہ دیکھا ہو گا کہ وہ ناکہ
 سے گھبرا کر اکتا گیا ہو اور کیمیا کی فکر چھوڑ دی ہو تو کیا خدا کا طالب کیمیا کے برابر
 بھی نہ ہو خوب سمجھ لو کہ جو اکتا گیا وہ طالب نہیں صورت طلب کو طلب نہیں
 کہتے جیسے صورت آدمی کو آدمی نہیں کہتے، خوب کہا ہے

این کہ می بینی خلاف آدم اند نیستند آدم غلات آدم اند
 یہ جو کچھ کہہ تو دیکھ رہا ہے آدمی ہونے کے خلاف ہے یہ آدمی نہیں بلکہ آدمی
 کا اوپر کا غلاف ہے۔

پس جو لوگ الوداع کے خطبہ نہ ہونے سے نہ آدیں ان کے نہ آنے کی کچھ بھی پرواہ
 نہ کی جاوے گی اور ایسے وہی مصالح سے اس قسم کی بدعات کی اجازت نہ دی جائیگی
 البتہ اس سے زیادہ آخری شعبان کا خطبہ بیشک مستون ہے چنانچہ حضور صلی اللہ
 علیہ وسلم نے ایسا خطبہ پڑھا جس میں کا یہ ایک ٹکڑا ہے جس کے متعلق یہ بحث خطبہ
 الوداع کی بطور جملہ معترضہ کے بیان کی گئی اب اصل مقصود مذکور ہوتا ہے حضور
 صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینہ کے برکات و آثار کے باب میں امثالاً فرماتے ہیں ہوا شہر
 اولہ رحمة و واسطہ مغفرة و آخرہ عقیق من البیضان۔ (ترجمہ اس کا یہ ہے) کہ ماہ

رمضان ایسا مہینہ ہے کہ اس کا اول حصہ رحمت ہے اور درمیان فی حصہ مغفرہ ہے اور آخری حصہ آگ سے آزادی ہے میں نے کہا تھا کہ اس حدیث کو دو باتوں کے بیان کے لئے پڑھا ہے مگر اول اس حدیث کی شرح کر دوں تو پھر ان کو بیان کروں تو سمجھنا چاہیے کہ یہ جو فرمایا گیا کہ اس کا اول حصہ رحمت ہے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ رحمت ایک لطف ہے چونکہ ابتداء حصہ میں خداوند تعالیٰ کی طرف سے عمل کرنے کی توفیق عطا ہوتی ہے کہ بدون اس توفیق کے کوئی عمل بھی نہیں ہو سکتا اس لئے اول رحمت فرمایا گیا اور ہمیں سے یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ بعض لوگوں کو جو اپنے تھوڑے سے عمل پر ناز ہو جاتا ہے کہ ہم بہت کچھ کرتے ہیں یہ کوتاہی نظر کی دلیل ہے انسان کوئی کام نہیں کر سکتا جب تک کہ اُدھر سے امداد و توفیق نہ ہو خوب کہا ہے ۵

بے عنایات حق و خاصان حق گر ملک باشد سیہ مستش ورق
حق تعالیٰ جل شانہ اور اللہ والوں کی عنایات کے بغیر اگر کوئی فرشتہ بھی ہو تو اس کا کارنامہ سیاہ ہی رہے گا۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں ۵

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر پیچ بے عنایات خدا ہیچیم و ہیچ

یہ کچھ ہم نے کہا ہے لیکن درحقیقت حق تعالیٰ کی عنایات کے بغیر ہیچ اور ہیچا رہے

کہ گو ہم نے سب کچھ بتلایا لیکن عنایات خداوندی نہ ہو تو ہم کچھ بھی نہیں پس خدا کی عنایت سے توفیق ہوتی ہے اپنا کوئی کمال نہ سمجھے جب تک کہ دل میں کوئی بات نہیں ہوتی آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا اور یہ خدا کے اختیار میں ہے ۵ ”من چو کلکم درمیاں اصبیعن“
آخر کیا سبب تھا کہ ابو جہل جو کہ نہایت سمجھدار سمجھا جاتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ میں کا چچا ہوتا تھا تیرہ برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دعوتِ ایمان فرمائی لیکن اس کو کلمہ پڑھنا نصیب نہ ہو سکا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو کہ حبشہ کے رہنے والے تھے یہ کچھ بڑے ذریعہ سمجھے جاتے تھے نہ پہلے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے تھے کیونکہ مکہ مکرمہ میں آکر ایک کافر کے پھندے میں پھنس گئے کہ آزادی بھی نصیب

نہ تھی جس سے تحقیقات ہی کا موقع ملتا پھر تکالیف کا یہ عالم کہ پتھر پیتا ہوا سینہ پر رکھ دیا جاتا تھا لیکن باوجود اس کے آپ کی زبان سے احد ہی احد نکلتا تھا۔ پس وجہ یہ ہی تھی کہ ابو جہل کو توفیق نہیں دی گئی اُن کو توفیق دی گئی تھی۔ حسن زبیرہ ہلال از حبش صہیب از روم ز خاک مکہ ابو جہل ایں چہ پوئے عجبی است بڑے درجے کے لوگ بصرہ سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حبشہ سے حضرت ہلال رضی اللہ عنہ اور روم سے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ جیسے شخص پیدا ہوئے اور مکہ شریف میں ابو جہل (زبردست کافر) پیدا ہوا یہ عجیب معاملہ ہے۔

حقیقت میں جب تک ادھر سے جذب اور مدد نہ ہو کچھ نہیں ہو سکتا تو یہ کہنا کہ انا کن ادا نا کن انا محض جہل ہے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ چلے جا رہے تھے شاہی محل کے نیچے سے گزر رہا بادشاہ نے ان کو اپنے پاس ملنے کے لئے بلایا انہوں نے کہا کہ کیوں کراؤں کہ دروازہ بڑی دور پھروہاں پہرہ چوکی بادشاہ نے کمند ڈکا دی یہ اس کے سہارے سے اوپر پہنچ گئے جب یہ وہاں پہنچے تو بادشاہ نے ان سے گفتگو شروع کی۔ اثنائے گفتگو میں بادشاہ نے پوچھا کہ آپ خدا تعالیٰ تک کیونکر پہنچے، انہوں نے کہا کہ جس طرح آپ تک پہنچا۔ یعنی جس طرح تم نے وہ کمند ڈال دی اور اس کے ذریعے مجھے کھینچ لیا اسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی جذب کی کمند ڈال کر مجھے کھینچ لیا خوب کہا ہے۔

مگر دو قطع ہرگز جادۂ عشق از دوید نہا کہ میہا لد بخود این راہ چون تک از برید نہا عشق کا راستہ ہرگز بھی بھاگ دوڑ سے پورا نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس راستہ پر خود بخود بڑھتا ہے جیسے انگور کو شاخ کاٹنے سے بڑھتی رہتی ہے۔ یہ تو اپنے عمل کے بارہ میں ہے اور ایک دوسرے شخص نے جذب کے بارہ میں کہا ہے لیکن یہ مضمون محبوب مجازی کے باب میں ہے اس لئے الفاظ اچھے نہیں۔

خود بخود آں بت عیار بہ برمی آید نہ بزد و نہ بزداری نہ بزرگی آید

وہ چالاک معشوقِ خود ہی پہلو میں آسکتا ہے روپیہ پیسے سے یا روئے پیٹنے سے یا دباؤ سے نہیں آتا ہے۔

میں نے الفاظِ بدل دیئے ہیں کہ محبوبِ حقیقی کے مناسب ہو جاوے عطر خود بخود آں مہ دلدار بہمی آید۔

جب محبوبانِ مجازی کا یہ عالم ہے تو اس محبوبِ حقیقی کو کون مجبور کر سکتا ہے وہ تو اس کے شائبہ سے بھی منزہ ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قربان ہو جائیے فرماتے ہیں لا تقل اللهم ارحمني ان شئت فانت لا مکوہ لہ کہ یوں دعا نہ مانگو کہ اے خدا اگر آپ چاہیں تو ہم پر رحم فرمائیے۔ اس واسطے کہ خدا تعالیٰ پر تو کوئی اکراہ و جبر کرنے والا نہیں ہے۔ صاحبو دیکھئے ظاہرِ نظر میں مشیتِ موقوف کر کے دعا مانگنا ادبِ معلوم ہوتا ہے لیکن واقع میں سخت بے ادبی ہے لیکن کسی کی نظر اس بے ادبی تک نہیں پہنچ سکتی یہ نظر نورِ نبوت اور وحی کی محتاج ہے اور وجہ اس کی داخل بے ادبی ہونے کی یہ ہے کہ درخواست میں مشیت کی قید لگانے کی ضرورت تو اسی وقت ہوتی جب کہ خدا تعالیٰ میں مجبور ہونے کا احساں بھی ہوتا اس لئے یہ قید لگاتے کہ اللہ تعالیٰ پر دباؤ نہ پڑے یہاں یہ بات کہاں تم دس ہزار مرتبہ مانگو اور دعا کرو وہ چاہیں گے قبول کر لیں گے یا رد کر دیں گے کیوں تم قید لگاتے ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر دنیا بھر کے عقلا جمع ہو کر غور کرتے تو اس قبضہ تک نہ پہنچتے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہنچے ہیں اور جب خدا تعالیٰ مجبوری سے بالکل پاک ہیں تو اگر تم کو توفیقِ روزہ رکھنے اور تراویح و قرآن پڑھنے کی نہ دیتے تو تم کیا کر سکتے تھے اسی لئے فرمایا کہ اولہ رحمۃ کیونکہ صوم وغیرہ کی توفیق دینا عبادت کی توفیق دینا بہت بڑی رحمت ہے۔ اور چونکہ ارشاد خداوندی ہے کہ ان المحسنات یذہبن السیئات کہ نیکیوں سے برائیاں معاف ہو جاتی ہیں تو جب اول رمضان میں توفیق ہو جانے کی وجہ سے اعمالِ نیک شروع کئے تو ان سے گناہ معاف ہوئے شروع ہوئے جب ان کی بدولت گناہ معاف ہو گئے تو وسطِ رمضان مغفرت ہو اسی کو فرماتے ہیں و اوسطہ مغفرتہ اور ظاہر ہے کہ گناہوں کا معاف ہو جانا یہی دونوں سے بچنا ہے

تو اس پر متفرع ہو کر یہ ارشاد بھی صحیح ہو کہ داخلہ عتق من النیران اور یہ تقسیم یا تو مجموعہ شہر کے اعتبار سے لئے جاویں تو اس میں رات بھی آجاوے گی اور اس صورت میں روزہ کی تخصیص نہ ہوگی بلکہ اعمال لیل کا بھی اس فضیلت میں دخل ہوگا اور یا باعتبار اجزاء متفرقہ کے کہ وہ صرف دن کے اوقات ہیں جیسے اس قول میں بھی مراد ہوتا ہے کہ حمت الشہر کلہ تو ظاہر ہے کہ ضمیر مہینہ کی طرف اجزاء متفرقہ یعنی ہمارے اعتبار سے راجع ہوگی پس اسی طرح حدیث میں بھی احتمال ہے تو اس صورت میں یہ مصلحت خاص ہو جاوے گی روزہ کے ساتھ اور اسی طرح اس تقسیم میں دوسرے اعتبار سے بھی دو احتمال ہیں یعنی ایک یہ ممکن ہے کہ ایک ایک اثر ایک ایک حصہ میں ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تینوں اثر ہر حصہ میں ہوں لیکن غلبہ اثر کے اعتبار سے تقسیم فرما دیا گیا یعنی چونکہ اول حصہ رمضان میں وصف رحمۃ کا غلبہ تھا اس کو رحمۃ کہا گیا گو مغفرت و عتق اس میں بھی ہو اور وسط میں مغفرت غالب تھی اس پر مغفرت کا اطلاق کیا گیا اور اخیر حصہ عتق من النار کا وصف غالب تھا اس لئے اس کو عتق من النیران کہا گیا غرض جس اعتبار سے بھی لیا جاوے آج کا دن حدیث کی آخری جزو کا مصداق ہے ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے ہم کو دوزخ سے نجات بخشی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آزادی کو رحمۃ اور مغفرت پر مرتب فرمایا ہے لہذا ہر شخص اپنی حالت کو دیکھ لے اور سوچ لے کہ اس نے رحمۃ مغفرت کا کام کیا ہے یا نہیں اور صرف روزہ و تراویح کی ظاہری صورت سے کوئی گمان نہ کرے کہ میں نے رحمت و مغفرت کا کام کیا ہے کیونکہ ہر عمل کی فضیلت اس وقت ثابت ہوتی ہے کہ جب اس عمل کو مع اس کے حقوق کے ادا کیا جاوے اور حدیث میں روزہ کے باب میں ہے من لم یدع قول الذر والعل بہ فلیس ذلہ حاجۃ فی ان یداع طعامہ وشرابہ (جو شخص جھوٹ بات کہنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ بندہ صرف اپنا کھانا پینا چھوڑے)

اب ہر شخص غور دیکھ لے کہ اس نے آج تک کے دن کیونکر گزارے، نمازیں پڑھیں یا نہیں پڑھیں اور پڑھیں تو ان کے جملہ حقوق ادا کئے یا نہیں کئے دن میں ہماری کیا حالت رہی رات کو ہم نے کیا کام کئے کسی جگہ نگاہ کو تو آلودہ نہیں ہونے دیا کسی کی غیبت تو نہیں کی جھوٹ تو نہیں بولا۔ پس اگر کسی نے ہمت کی کہ وہ سب گناہوں سے بچا اور سب عبادتوں کو جمع اس کے حقوق سے بچالایا تو آج اس کے لئے خوشخبری کا دن ہے اور جس نے ہمت سے کام نہیں لیا اس پر آج حسرت ہے لیکن جن لوگوں نے آج تک کچھ نہیں کیا ہے ان کو بھی مایوس ہو کر نہ بیٹھ رہنا چاہیئے بلکہ ابھی کم و بیش وقت باقی ہے اس میں ہی جو کچھ ہو سکے کر لینا چاہیئے انشاء اللہ اس کو بھی عقیق من النار ہو گا وہ بارگاہ عجیب بارگاہ ہے یہ حالت ہے کہ ۵

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر و گریب و بت پرستی باز آ
 ایں درگہ مادر کہ تو میدی نیست صد بار اگر تو بہ شکستی باز آ

ہمارے پاس آہم ایسے پاس آ جس حالت میں بھی ہے تو ہمارے پاس آ۔ اگرچہ تو کافر ہے یا بد مذہب ہے بت پرست ہے پھر بھی آ جا کہ ہمارا یہ دربار نامیک
 کا دربار نہیں ہے اگر تو سومرتیہ بھی تو بہ توڑ چکا ہے پھر بھی آ جا۔

اور جس طرح وہاں ہر وقت باب رحمت کشادہ ہے کہ کسی کو آنے کی ممانعت روک ٹوک نہیں اسی طرح وہاں کسی کے آنے نہ آنے کی پرواہ بھی نہیں ۵

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برود دار و گیر و حاجب دربان دیں درگاہ نیست
 کہند جس کا جی چاہے آئے اور جس کا جی چاہے چلا جائے اس دربار میں کسی پر روک ٹوک یا دروازہ پر دربان و پہرہ دار نہیں ہے۔

کہ جس کا جی چاہے جب چاہے چلا آئے اور جس حالت میں چاہے چلا آوے اور ہر کہ خواہد کے عموم سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ بعضے لوگ جو کسی ہندو یا عیسائی کو مسلمان کرنے کے قبل اول غسل دیا کرتے ہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہر کہ کے عموم میں بے غسل والا بھی داخل ہے ماحو اسلام میں آنے کے لئے نہ غسل کی ضرورت

ہے نہ وضو کی بلکہ اگر استنجا بھی نہ کیا ہو تو اس کے انتظار کی بھی ضرورت نہیں پہلے مسلمان کر لو اور اس کے بعد غسل وغیرہ دو اور ایک یہ بھی تو بات ہے کہ کسی کو کیا خبر ہے کہ چار منٹ کے بعد زندہ رہے گا یا ختم ہو چکے گا۔ بعض لوگ تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ مسلمان کرنے کے بعد مسہل دینے کی تجویز کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر طہارت حاصل کرنے کے لئے یہ ہی شرط ہے کہ حالت کفر کی کوئی چیز باقی نہ رہے تو قصد بھی لینا چاہیے بلکہ گوشت پوست بھی نیا ہونا چاہیے الحاصل یہ سب لغو قیود ہیں اس دربار میں جس کا جی چاہے جب چاہے اور جس حالت میں بھی ہو چلا آوے۔ صاحبو کیا آج کوئی بادشاہ ہے کہ وہ ناپاکوں کو بھی اپنے دربار میں حاضری کی اجازت دے اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں ۷

ہر کہ خواہد گو بیاوہر کہ خواہد گو برو دار و گیر و حاجب درباں درین درگاہ نیست
غرض جس طرح یہاں کسی کو آنے کی ممانعت اور روک ٹوک نہیں اسی طرح اگر بگڑ جاوے
تو رکھنے کی بھی کوئی تمنا نہیں کرتا کسی کو اس طرح سر نہیں چڑھایا گیا کہ وہ ذرا بھی ناز
کر سکے پس جب یہ حالت ہے تو ہم لوگوں کو مایوس نہ ہونا چاہئے اور یہ نہ سمجھنا
چاہئے کہ اب تو سارا رمضان گزر چکا ہے اب ہماری مغفرت کیونکر ہو سکے گی آج
اٹھائیسواں روزہ ہے ابھی ایک یا دو دن باقی ہیں میں حسب وعدہ شریعت دعویٰ
کرتا ہوں کہ اگر آپ چاہیں گے اور کوشش کریں گے تو آج ہی مغفرت ہو جاوے گا
یہ ایک دو دن ہی کافی ہو جاوے گا۔ اس کی ایسی مثال ہے ۷

گر جہان برف گزد سر بسر تاب خور بگدازوش از یک نظر
یعنی اگر سارا عالم بھی برف سے الٹ جاوے تو عالم تاب آفتاب کے نکلنے ہی ب
پانی ہو کر رہ جاوے گی اسی طرح اگر سارا عالم بھی گناہ سے بھر جاوے تو ادھر
کی ایک نگاہ کافی ہے۔ سبحان اللہ کس پاکیزہ مثال سے کتنے بڑے مسئلہ
کو باسانی حل کر دیا۔

واقعی بات یہ ہے کہ اہل اللہ ہر چونکہ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اس لئے

ان سے زیادہ بہتر کوئی مثال بھی پیش نہیں کر سکتا۔ سچ یہ ہے کہ یہی لوگ سچے فلسفی ہیں چنانچہ افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا اور اس سے ایک ایک حکیم کا نام لے کر پوچھا کہ یہ کیسے تھے رب کی نسبت یہی کہتا رہا کچھ نہیں پھر اسے حضرت بارئیدہؓ حضرت شیخ شہاب سہروردیؒ کی نسبت پوچھا تو اس نے کہا کہ اولئک ہم الفلاسفہ حقاً خیر مقصود یہ ہے کہ دو دن جو باقی ہیں ان میں تو اپنی کچھ فکر کر لیتی چاہیے پھر تو بعد رمضان معلوم ہی ہے کہ آزاد و غافل ہو جاؤ اگرچہ ادھر کے الطاف و مراعہ پر نظر کر کے تو ایک دم کی غفلت بھی جائز نہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں ۷

یک چشم زدن غافل از شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی
جتنی دیر میں پلک جھپکتے ہیں اتنی دیر بھی اس بادشاہ سے غافل نہ رہنا
چاہیے شاید کہ وہ توجہ فرمائے اور توبہ بے خبر ہے۔

بخدا جس کا کام بنانا ہے ایک ہی لمحہ میں بن گیا ہے ایک ہی لمحہ کی عنایت کافی ہو گئی ہے مگر بہت دن تک اس لئے لگے رہتے ہیں کہ وہ لمحہ معین نہیں یعنی یہ خیر نہیں کہ وہ ایک لمحہ کس وقت ہو گا جس میں نگاہ اکسیر اثر پڑ جاوے گی اسی کو مولانا بھی ایک تفسیر پر فرماتے ہیں ۷

صحبت نیرکان اگر یک ساعت است بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است
یک زمانے صحبت با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
اولیاء اللہ کے ساتھ ایک گھڑی کی صحبت نصیب ہو جائے تو وہ سو
سال کے زہد و طاعت سے بہتر ہے اولیاء اللہ کے ساتھ تیری تھوڑی
دیر کی صحبت تیری سو سال کی بے ریا کاری کی عبادت سے بھی بہتر ہے۔

بعض نے اس کی یہی توجیہ کی ہے کہ تمام اوقات میں سے ایک وقت ایسا ہوتا ہے
چنانچہ شاہ بھیک صاحب اور شاہ ابوالعالی صاحب کا قصہ ہے کہ شاہ ابوالعالی
صاحب کسی بات پر شاہ بھیک صاحب سے خفا ہو گئے اور علیحدہ کر دیا یہ جنگلوں میں

رہتے پھرتے تھے برسات آئی حضرت کا مکان گرہ پڑا بی بی صاحب نے فرمایا ایک آدمی گنوار سان کاموں کے لائق تھا اسی کو آپ نے نکال دیا حضرت نے فرمایا کہ میں نے ہی تو نکالا ہے تم بلا لؤ تم کو تو منع نہیں کرتا بی بی صاحب نے بلا بھیجا ان کی عید آگئی آ موجود ہوئے۔ بی بی صاحب نے مکان کی حالت دکھلائی وہ فوراً جنگل پہنچے اور لکڑی مٹی جمع کر کے مرحمت میں لگ گئے حتیٰ کہ مکان کی تکمیل کر کے چھت پر مٹی کوٹ رہے تھے کہ حضرت گھر میں تشریف لائے اور کھانا کھانے بیٹھ گئے اور چھت پر سے مٹی کوٹنے کی آواز سن کر رحمت کا جوش ہوا اور باہر صحن میں تشریف لاکر ان کو ٹکڑا روٹی کا دکھلایا کہ لو وہ وہیں سے کو دو پڑے حضرت نے ان کے منہ میں لقمہ دیا اور سینہ سے لگایا بس سارا کام ایک لمحہ میں بن گیا۔ اس لئے کہتا ہوں کہ ایک لمحہ بھی غفلت مت کرو مگر خیر اتنی ہمت نہ ہو تو رمضان رمضان تو بیدار رہو یہ ایک دو دن رہ گیا ہے اس کو ضائع مت کرو۔ نیز اس مضمون کے متعلق میں وہ حدیث پھر یاد دلاتا ہوں جو کہ جمعہ گذشتہ کو بیان کی گئی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں رَغِمَ أَنْفُهُ رَغِمَ أَنْفُهُ رَغِمَ أَنْفُهُ اس کی ناک خاک میں بھرے یعنی وہ شخص ذلیل ہو جائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون شخص فرمایا ایک تو وہ کہ میرا نام اس نے سنا اور مجھ پر درود نہ بھیجا دوسرا وہ شخص کہ اس کے سامنے اس کے پوئے ہاں باپ زندہ رہے اور اس نے ان کی خدمت کر کے جنت نہ لے لی۔ تیسرا وہ شخص کہ رمضان شریف آئے بھی اور گزر بھی گئے اور وہ اسی طرح گنہگار سیہ کار رہا اور نیک عمل کر کے اس نے اپنی مغفرت نہ کرائی۔

صاحبو! غور کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کو کوس رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوسنا خدا کا کوسنا ہے اور جس شخص کو خدا تعالیٰ کو پس اس کا ٹھکانا کہاں ہو سکتا ہے ۵

چوں خدا از خود سوال و گد کند پس دعائے خویشتن چوں رد کند
جب حق تعالیٰ اپنے بندہ سے خود ہی سوالات اور صحبتیں کرنے لگے تو پھر
اپنی خواہش کو وہ کس طرح رد کر سکتی ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ ارشادِ خداوندی ہوتا ہے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو وہ حالت ہے ۵

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتم ام انچه استاد ازاں گفت بگو میگویم
میں تو آئینہ کے پیچھے طوطے کی طرح رہتا ہوں جو کچھ استاد کہتا ہے کہ
کہو میں وہی کہتا ہوں۔

تو آپ کا بد دعا کرنا خالی نہیں جا سکتا اب فکر کرو اگر مغفرت چاہتے ہو تو خدا
تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو اور معاف کرانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ
صرف تسبیح پاتھ میں لیکر استغفر اللہ استغفر اللہ پڑھتے رہو۔ بلکہ یہ بھی کرو اور اُس کے ساتھ
اہل حقوق کے حقوق بھی ادا کرتے رہو اگر کسی شخص کے پاس دوسرے
کی زمین دبی ہو یا موروثی ہو اس کو چھوڑ دو کسی کے ذمہ کسی کا قرض ہو اس کو
ادا کر دو اور سبکدوش ہو جاؤ لوگ اپنے جی میں کہتے ہوں گے کہ موروثی زمین
چھوڑنے کی بے ڈھب کہی پھر ہم کھا دیں گے کہاں سے لیکن صاحبو
غور کرو اگر کسی شخص کے موروثی کھیتوں میں کوہریل مکل جاوے اور اس کے
سب کھیت ریل میں آجا دیں اور معاوضہ ملے زمیندار کو تو یہ کیا
کرے گا اور کہاں سے کھاوے گا۔ افسوس ہے کہ ظاہری حکومت
کے سامنے تو کان نہ ہلایا جاوے اور خداوندی حکم کے سامنے چون و
چرا کی گنجائش ہو۔ اصل یہ ہے کہ آپ لوگوں کے دلوں میں اسلام
اور اس کے احکام کی چونکہ بلا مشقت مل گئے ہیں باوجود سرتاسر
نافع ہونے کے کہ بڑا نفع رضائے حق ہے قدر و قیمت نہیں ہے خوب
کہا ہے ۵

اے گرانجاں خوار دیدستی مرا

زنانکہ بس از ان خریدستی مرا

اے سست طبیعت والے تو مجھ کو حقیر سمجھ رہا ہے اس لئے

کہ تو نے مجھ کو سستا خرید لیا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے ما قدر الله حق قدره سبب یہ ہے کہ اسلام

کے ملنے میں کچھ زائد خرچ نہیں ہوا کہ اس کی قدر ہوتی۔ ۷

ہر کہ او ارزاں خسرو ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرص نان دہد

جو شخص کہ اس کو سستا خریدتا ہے سستا ہی دیتا ہے قیمتی موتی کو بچہ روٹی

کے بدلہ میں دے دیتا ہے۔

حکام کی خوشنودی تو بڑی بڑی کوششوں کے زور و جواہر خرچ کرنے سے حاصل ہوتی ہے بخلاف

رضائے خداوندی کے لیکن حقیقت میں یہ سخت رذالت ہے کیونکہ جس قدر زیادہ احسان کسی

کا ہوتا ہے اسی قدر زیادہ اس کے سامنے بگھلا کرتے ہیں اور شرماتے ہیں نہ کہ الٹی شرارت اور

نافرمانی پر کمر بستہ ہو جاویں لہذا اپنی اس معمولی تکلیف اور مشقت کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہیے

اگر کسی کے پاس موروٹی زمین ہے تو اس کو چاہیے کہ فوراً اس کو چھوڑ دے بلکہ میں

کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص موروٹی زمین کو چھوڑ دے تو وہ زیادہ آرام و آسائش میں

رہے گا کیونکہ ایسا کرنے سے وہ ایماندار اور خوش معاملہ مشہور ہو جاوے گا

پھر ہر زمیندار کوشش کرے گا کہ اس کی زمین اسی کے کاشت میں رہے۔ اگر

اب بھی لوگوں کی سمجھ میں نہ آوے اور نہ مانیں تو وہ جانیں۔ دو شخص ضلع

سہارنپور کے میرے پاس آئے، میں اتفاق سے موضع بھنسانی گیا ہوا

تھا وہ میرے پاس وہیں پہنچے کہ ہم کو مرید کر لو۔ میں نے پوچھا تمہارا

پاس موروٹی زمین تو نہیں معلوم ہوا کہ ہے میں نے کہا کہ اُس کو چھوڑ دو

کہنے لگے کہ پہلے مرید کر لو پھر چھوڑ دیں گے میں نے کہا کہ پہلے چھوڑ آؤ

جب مرید کروں گا۔ یہ سن کر چھوڑ آنے کا وعدہ کر گئے اور آج تک

واپس نہیں آئے۔

ایک گاؤں کے لوگ مدت سے مجھے بلارہے ہیں لیکن اس لئے جانے کی نوبت نہیں آئی کہ وہاں سب کے پاس موروثی زمینیں ہیں۔ بس وہ میرے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ مجھ کو روٹی کہاں سے کھلاؤ گے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک درہم حرام اور نوحلال کے ہوں تو اس ایک کے بل جانے سے اس کی سب عبادت غارت ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ لوگ حرام کمائی بیوی بچوں کے لئے کماتے ہیں یہ بھی نہیں کہ اپنے لئے ایسا کریں۔ لیکن اسی سے کوئی یہ تجویز نہ کر لے کہ جب ہمارے پاس حلال کی آمدنی نہیں ہے اور حرام کی آمدنی کھانے سے روزہ قبول نہیں ہوتا تو روزہ رکھنے سے کیا فائدہ کیونکہ اب تو صرف ایک گناہ ہے کہ حرام مال سے پیٹ بھرا اگر روزہ نہ رکھو گے تو ایک دوسرے اس سے بھی زیادہ سخت گناہ میں ماخوذ ہوں گے۔

یہ بیان تھا بقیہ رمضان کے متعلق اب حسب وعدہ دوسرا مضمون عید کے متعلق بیان کرتا ہوں اور اتفاق سے اس حدیث سے اس کا بھی تعلق ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں رمضان کے آخری حصہ کو عتق من النیران فرمایا گیا ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ عتق رحمۃ اور مغفرت پر مرتب ہے۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی تو معلوم ہوا کہ آخر رمضان میں رحمۃ اور مغفرت اور عتق من النیران تینوں کا تحقق ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا اس کے ساتھ ایک دوسرا مقدمہ قرآن سے ملاؤ کہ قل بفضل اللہ وبرحمۃ فبذلک فلیفرحوا (کہہ دو کہ یہ صرف اللہ کا فضل و رحمت ہے پس اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت ہی سے خوشی حاصل کرو) ان دونوں مقدموں کے ملانے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس موقع رحمت پر کوئی فرحت ہونی چاہیے اور اس فرحت کا جزئیہ بھی حدیث سے اثبات کیا جاتا ہے فرماتے للمصائم فرحان

فرحۃ عند الافطار وفرحۃ عند لقاء ربہ (روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی افطار کے وقت اور ایک خوشی اپنے رب سے ملنے کے وقت) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وقت افطار کا وقت فرحت کا ہے اس کے بعد یہ سمجھنا چاہیے کہ افطار دو ہیں ایک افطار صغیر جو کہ روزمرہ ہوتا ہے دوسرے افطار کبیر یعنی وہ افطار کہ ختم رمضان پر ہو جس پر روزے پورے ہو جاتے ہیں جس کی طرف عید کو مضاف کر کے عید الفطر کہتے ہیں پس یہ افطار مجموعہ شہر کا ہے نہ کہ کسی خاص جزو کا جیسا کہ ہمارے ناواقف بھائیوں نے ایک جاہلانہ مسئلہ ایجاد کیا ہے کہ عید کی شب کو بالکل نہیں کھاتے جب صبح صادق صادق ہو چکتی ہے تو کچھ کھا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روزہ کھول لو۔ اس رسم کو اپنے ایام طفلی سے میں دیکھتا چلا آتا ہوں تحقیق کرنے سے اس کی اصل یہ معلوم ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ عید کے روز صبح کو کچھ کھا لیا کرتے تھے اس کے بعد نماز کو تشریف لے جاتے تھے اور دقیقہ شناساں امت نے اس کی ایک حکمت بالقادر حق بیان کی ہے اور بالقادر حق کی قید میں نے اس لئے لگا دی کہ اسرار حکم میں غور و فکر کرنا مناسب نہیں کیونکہ جو کچھ فکر سے حاصل ہوگا تمہارے ذہن کا اختراع ہوگا حکمت کیونکہ وصول الے الحقائق کا طریق ہی نہیں۔

فہم و خاطر تیز کر دن نیست راہ

جز شکستہ مے نگیر و فضل شاہ

دل و دماغ کو تیز کرنا صحیح راستہ نہیں ہے جب تک کہ خلوص کا

ساتھ شکستہ دل نہ ہو اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں ہوتا۔

پس ہم کو بالکل شکستگی اختیار کرنی چاہیے اس سے البتہ ہم پر فیضان ہو سکتا

ہے خوب کہا ہے

ہر کجا پستی رست آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

پانی ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں پستی ہوتی ہے جس بات کو سمجھنا مشکل ہوتا

ہے جواب کی اس جگہ ضرورت ہوتی ہے دوا کی اس جگہ ضرورت ہے
جہاں درد تکلیف ہوتی ہے شفا کی ضرورت و فکر اسی جگہ ہوتی ہے
جہاں مرض ہوتا ہے۔

تو جب تم بالکل اپنے کو سپرد کر دو گے تو خدا تعالیٰ خود بخود ان علوم کا القاء
تمہارے قلب میں کریں گے اور وہ حالت ہوگی یہ

یعنی اندر خود علوم انبیاء

بے کتاب و بے معید دادستا

اپنے اندر انبیاء علیہ السلام کے علوم کو دیکھو گے جو کسی کتاب
و مددگار اور استاد کے بغیر تم کو حاصل ہوں گے۔

غرض دقیقہ شناساں است کو بالقہ حق یہ بات معلوم ہوئی کہ حضور نبی کریم
علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اپنے اس فعل سے یہ بات ظاہر فرماتے ہیں کہ آج روزہ
نہیں ہے تاکہ لوگ حد شرعی سے آگے نہ بڑھ جائیں تو جس طرح حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے ابتداء رمضان کی ایک حد مقرر فرمادی ہے اسی طرح انتہا
رمضان کی بھی ایک حد مقرر فرمادی اگر ایسا نہ فرماتے تو یہود و نصاریٰ کی
طرح سب لوگ گڑ بڑ میں پڑ جاتے اسی واسطے رمضان سے پہلے مستقلاً
روزہ رکھنے کو بھی منع فرمایا لیکن اس میں فرق کیا کہ تقدم کو تو حرام نہیں کیا
اور تاخر کو حرام کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقدم میں احتمال اس بات کا
بھی ہے کہ ممکن ہے آج رمضان ہو کیونکہ بعض دفعہ ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ
۲۹ کا چاند دس پانچ جگہ نظر آوے اور دو چار جگہ نظر نہ آوے پس ممانعت
حقیقت ہوئی تاکہ ممانعت بھی اپنے حد پر رہے۔ اور رمضان کے ختم پر اس وقت
تک عید کرنا جائز نہیں جب تک کہ رویت کا یقین نہ ہو جاوے اور جب
یقین ہو جاوے تو اب اس میں احتمال رمضانیت کا نہیں اس لئے رمضان
کے بعد متصلاً یعنی عید کے روز روزہ رکھنا حرام ہوا وھذا من المواہب

پس اتباعِ سنت اسی اظہار کے لئے اکثر بزرگ صبح ہوتے ہی کچھ کھا لیتے تھے تاکہ معلوم ہو جاوے کہ آج روزہ نہیں لوگوں نے سمجھا کہ یہ رات کے روزہ کا افطار ہے حالانکہ وہ افطار کبیر تھا اور یہ سمجھ کر اس رات میں روزہ رکھنا شروع کر دیا جس کا نام شبہ ہونا زیادہ مناسب ہے غرض اس سے معلوم ہوا کہ شرعاً افطار کبیر بھی کوئی چیز ہے اور وہ بھی محلِ فرحت ہونا چاہیئے پس اسی افطار کبیر کی فرحت کا نام عید ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر اس کی نصاً تشریح نہ ہوتی تو اس حکمت کی بنا پر رائے سے تقرر عید کا ہو سکتا حکمت کا رائے سے سمجھنا اور اس پر بنا حکم کرنا یہ کافی نہیں مدارِ اصلی تشریح ہی پر ہے۔ اگرچہ اس کی حکمت بالکل منہ معلوم ہو۔ البتہ بعد تشریح کے بھروسہ کچھ حکمت بھی سمجھ میں آ سکتی ہے باقی حکمت کے سمجھنے پر حکم کا ماننا موقوف نہیں ہماری تو وہ حالت ہونی چاہیے

زبان تازہ کردن با فسرار تو

نیکیختن علت از کار تو

اور ہمارا وہ مذہب ہے جیسا حضرت استادِ علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے کہ ہر درویشے کہ چوں چرا کند و ہر طالب علمے کہ چوں و چرا نکند ہر دور اور چراگاہ باید فرستاد (جو درویش ہر بات میں چوں چرا کرے یعنی اعتراض کرے اور ہر وہ طالب علم جو مسائل میں چوں چرا نہ کرے یعنی اس کی دلیل اور وجوہ کے سمجھنے میں سوالات کر کے اطمینان حاصل نہ کرے ان دونوں کو اس چراگاہ یعنی خانقاہ مدرسہ سے دور بھیج دینا چاہیئے)

طالب علم کو تو چون و چرا کا حق اس لئے ہے کہ وہ طالب فن ہوتا ہے لیکن طالب عمل کو اس کی اجازت ہرگز نہیں۔ اور حکمت کی تلاش میں ایک مفسدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ عوام یوں سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ہی مصالح بناؤ حکم ہیں اور جب کسی حکم میں ان کو مصالح نظر نہیں آتے تو اس حکم کے من اللہ ہونے میں ان کو شبہ ہونے لگتا ہے یا اگر کوئی مصلحت اپنے

ذہن سے مخترع کی اور اس کو مدار حکمت سمجھا اور وہ مخدوش ہو گئی تو اس کے انہدام سے حکمت کے انہدام کا شبہ ہو جاتا ہے ہاں اگر مصلحت خود بخود بلا تلاش ذہن میں آجاوے تو اس کے بیان میں مضائقہ نہیں ہے اور وہ بھی ظناً غرض جب ادھر سے بولنے کا اشارہ پاوے جیسا بلا فکر کوئی وارد قلب میرا جاوے زبان کھولے ورنہ لب بستہ رہے کہ نطق و سکوت میں اسی کا تابع رہنا چاہیے۔ خوب کہا ہے ۷

بگوش عمل سخن گفته کہ خندان ست بغدلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست

غرض یہ کہ عید ایک ایسا زمانہ ہے جس میں ہم کو بشارت کا حکم ہے اور چونکہ یہ دینی خوشی ہے اس لئے اس کے اظہار کا طریقہ بھی دین ہی سے تحقیق کرنا چاہیے تفصیل اس کی یہ ہے کہ خوشی دو قسم کی ہوتی ہے ایک دنیوی خوشی اور ایک دینی خوشی سو دینی خوشی پر کسی خاص ہیئت پر خوشی منانا یہ محتاج وحی کا ہے یعنی اگر ہم کسی مذہبی خوشی میں کسی خاص طریقہ سے خوشی منانا چاہیں تو ہم کو دیکھنا چاہیے کہ شریعت نے اس موقع پر عید کرنے اور خوشی منانے کی ہم کو اجازت دی ہے یا نہیں کیونکہ اس میں اپنی رائے سے اختراع کرنا متضمن ہوگا ایک مفسدہ پر یعنی چونکہ اصل بناء اس کی دین ہے۔ اس لئے عوام اس طریق مخترع کو بھی دین سمجھیں گے اور یہ مفسدہ عظیم البتہ دنیوی عید جبکہ اس میں کسی مفسدہ کا اندیشہ نہ ہو خود اپنی تجویز سے بھی ہو سکتی ہے۔ آج کل ہمارے چند اخوان زمانہ نے ایک عظیم الشان مفسدہ کی بنیاد ہندوستان میں ڈالی ہے یعنی یوم ولادت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوم عید بنانے کی تجویز کی ہے۔ اور یہ خیال ان کے ذہن میں دوسری اقوام کے طرز عمل کو جو اپنے اکابر دین کے ساتھ کرتے ہیں دیکھ کر پیدا ہوئے۔ لیکن اس قاعدہ مذکورہ کی بناء پر لوگوں کو سمجھ لیستنا چاہیے کہ یوم ولادت کی خوشی دنیوی خوشی نہیں ہے یہ مذہبی خوشی ہے پس اس کے تعین طریق کے لئے وحی کی

اجازت ضروری ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہم بطور ساگرہ کے دنیوی طرز پر کرتے ہیں تو میں کہوں گا کہ ایسا کرنے والے سخت بے ادبی اور گستاخی جناب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کر رہے ہیں۔ صاحبو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جلالت و عظمت پر دنیا کے بادشاہوں پر جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی نسبت نہیں ہے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس فرحت کے لئے بس ایک دنیوی رذیل سامان اُسی طرح کا کرتے ہو جیسا اُن سلاطین کے لئے کیا کرتے ہو

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

”اس عالم پاک کے ساتھ اسی خاک مٹی کی کیا برابری“

مجھے اس موقع پر ایک بزرگ کی حکایت یاد آگئی۔ وہ جنگل میں رہتے تھے ایک کتیا پال رکھی تھی اتفاق سے ایک مڑہ کتیا نے پچھے دینے تو آپ نے تمام شہر کے معززین کو مدعو کیا۔ لیکن ایک بزرگ شہر میں رہتے تھے ان کو نہیں بلایا۔ ان بزرگ نے اذرا بے تکلفی دوستانہ شکایت کی تو ان بزرگ نے جواب میں کہلا کر بھیجا کہ حضرت میرے یہاں کتیا نے بچے دیئے تھے اس کی خوشی میں رگان دنیا کی دعوت کر دی۔ سخت گستاخی تھی کہ میں ان دنیا کے کتوں کے ساتھ آپ کو مدعو کرتا جس روز میرے اولاد ہوگی اور مجھ کو خوشی ہوگی اس دن آپ کو مدعو کروں گا اور ان کتوں میں سے ایک کو بھی نہ پوچھوں گا۔ جب اولیا کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ بے ادبی ہے تو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ کیسے بے ادبی نہ ہوگی۔ اب اس کی دلیل سنئے کہ یوم ولادت مذہبی خوشی ہے دنیوی خوشی نہیں ہے یہ تو سب کو معلوم ہے کہ دنیا کے اطلاق اس خطہ زمین پر زیادہ سے زیادہ چند فرسخ اس کے متصل ہوا پر ہوتا ہے۔ پس اگر کوئی دنیوی خوشی ہوگی تو اس کا

اثر اسی خطہ زمین تک محدود رہے گا اس سے متجاوز نہ ہوگا اور ولادت حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے دن نہ صرف زمین کے موجودات بلکہ ملائکہ عرش و کرسی اور باشندگان عالم بالا سب کے سب سرور اور شادمان تھے وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بشریہ کفر و ضلالت کی ماحی اور توحید حق کی حامی تھی جس کی بدولت عالم کا قیام ہے کیونکہ قیامت اسی وقت قائم ہوگی جب ایک شخص بھی دنیا میں خدا کا نام لینے والا نہ رہے گا اور قیامت کے قائم ہونے سے فرشتے بھی اکثر فنا ہو جائیں گے۔

آپ کا ظہور چونکہ سبب تھا تمام عالم کے بقا اس لئے تمام عالم میں یہ خوشی ہوئی جب اس کا اثر دنیا سے متجاوز ہو گیا تو اس خوشی کو دنیوی خوشی نہیں کہہ سکتے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ دنیوی خوشی نہیں بلکہ مذہبی خوشی ہے تو اس میں ضرور ہر طرح سے وحی کی احتیاج ہوگی یعنی اس کے وجود میں بھی اور اس کی کیفیت میں بھی اب مجوزین ہم کو دکھلائیں کہ کس وحی سے یوم ولادت کے یوم العید بنانے کا حکم معلوم ہوتا ہے اور کیا صورت اس کی بتلائی گئی ہے۔ اگر کوئی قتل بفضل اللہ سے استدلال کرے تو میں کہوں گا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور تمام عالم سے زیادہ کلام مجید کو سمجھتے تھے ان کی سمجھ میں یہ مسئلہ کیوں نہیں آیا بالخصوص جب کہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی اُن کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی۔ علیٰ ہذا تابعین رحمہم اللہ جن میں بڑے بڑے مجتہد ہوئے ہیں اُن کی نظر یہاں تک کیوں نہیں پہنچی

ہاں جن امور کے متعلق حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے

اجازت ہے اس کو ضرور کرنا چاہیے۔ مثلاً آپ نے اپنی ولادت کے دن روزہ رکھا اور فرمایا ذالک الیوم الذی ولدت فیہ ربه وہ دن ہے جس دن میں پیدا کیا گیا ہوں، اس لئے ہم کو بھی اس دن روزہ رکھنا مستحب ہو سکتا ہے دوسرے پیر کے دن نامہ اعمال حق تعالیٰ کے رو برو پیش ہوتے ہیں پس یہ مجموعہ وجہ ہوگی اس حکم کی اور اگر منفرداً بھی مانا جاوے تب بھی صحیح ہے لیکن صرف اسی قدر کی اجازت ہوگی جتنا کہ ثابت ہے اور جس طرح یوم ولادت کی خوشی میں اختراعات باطل ہیں اسی طرح کسی کی وفات کی تاریخ کے کہ وہ دن بزرگوں کی خوشی کا دن ہے۔ اختراعات بھی اور۔۔۔ ہمیں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ آجکل جو لوگوں نے بزرگوں کے عرس کا طریقہ اختراع کیا ہے یہ بھی محض لغو اور تجاوز عن الحد ہے اصل حقیقت اس کی یہ تھی کہ عرس کے معنی لغت میں شادی کے ہیں اور حاصل شادی کا یہ ہے کہ محب کا محبوب سے وصل ہو۔ پس چونکہ ان حضرات کی موت ان کے لئے وصل محبوب ہے۔ اس لئے ان کے یوم وصال کو یوم العرس کہا جاتا ہے نیز ایک روایت میں بھی آیا ہے کہ جب کسی مقبول بندہ کی وفات ہوتی ہے اور فرشتے اس کی قبر میں آکر سوال کرتے ہیں تو سوال و جواب کے بعد کہتے ہیں نہ کنو ملة العروس (سو جایا جیسے کہ دلہن آرام سے اور عزت کے ساتھ سو جاتی ہے) تو وہ دن ان حضرات کے لئے یوم العرس ہوا۔ اسی کو ایک بزرگ خوب کہتے ہیں۔

خوشا روزے و خرم روزگارے کہ یارے بر خور داند وصل یا سے
وہ کیا اچھا دن ہے اور خوشی کا زمانہ ہے کہ ایک دوست اپنے محبوب کے وصل کا پھل کھا تہے۔

اور گو وصل ان حضرات کو دنیا میں بھی ہوتا ہے تاہم اس وصل میں اور اس وصل میں فرق ہے کہ یہاں یہ حجاب ہے اور وہاں بلا حجاب جیسا مولانا نے فرمایا ہے

گفت مکشوف و برہنہ گو کہ من می نہ کینم با صنم در سپیر ہوں
 مکشوف و برہنہ ہو کر کہنے لگا کہ میں معشوق کے ساتھ لباس میں نہیں ماسکتا ہوں
 اگرچہ خدا تعالیٰ جسم اور لوازم اور عوارض جسم سے پاک ہے لیکن یہ مثال کے لئے
 کہا جاتا ہے اور جیسا کہ حضرت غوث پاکؒ فرماتے ہیں ۛ
 بے حجابانہ در آ از در کاشانہ ما کہ کسے نیست بجز درد تو در خانہ ما
 ہمارے محل کے دروازہ سے بے پردہ ہو کر آ کیونکہ ہمارے گھر تیرے درد
 کے سوائے اور کوئی نہیں ہے۔

یہ کیفیت تو وہاں کے وصال کی ہے اور دنیا میں بوجہ حجاب اور سیری نہ ہونے
 کے ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ۛ
 دل آرام در بردل آرام جو لب از تشنگی خشک بر طرف جو
 نگویم کہ بر آب فتا در نیند کہ بر ساحل نیل مستقی اند
 تو اپنے محبوب کو ڈھونڈ رہا ہے حالانکہ تیرا محبوب تیرے پہلو میں ہے تو
 دریا کے کنارے کھڑا ہے اور تیرے ہونٹ پیاس کی وجہ سے خشک ہیں میں
 یہ نہیں کہتا ہوں کہ وہ پانی میں قدرت نہیں رکھتے بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ
 دریائے نیل کے کنارہ پر استسقار کے بیمار کھڑے ہیں۔

اور چونکہ مرکز ان کو یہ دولت نصیب ہوتی ہے اس لئے وہ اس کی تمنائیں
 کرتے ہیں اور شدت شوق میں یوں کہتے ہیں ۛ
 خرم آنروز کہ میں منزل ویراں بردم راحت جاں طلبم وز پئی جانان بردم
 وہ دن کس قدر خوشی کا ہو گا کہ اس ویران منزل سے میں جاؤں گا میں اپنی
 روح کا آرام ڈھونڈوں گا اور محبوب کے پیچھے پیچھے جاؤں گا۔

اور ان حضرات کو چونکہ مرنے کی خوشی ہوتی ہے اس لئے اس میں نہایت مطمئن ہوتے
 ہیں چنانچہ ایک نقشبندی بزرگ کی حکایت ہے کہ انھوں نے وصیت کی تھی
 کہ جب میرا جنازہ لے چلو تو ایک شخص یہ اشعار ساتھ ساتھ پڑھتا چلے ۛ

مفلسانِیم آمدہ در کوئے تو شینا للشد از جمالِ روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما آفریں بردست و بر بازوئے تو
ہم سب محتاج ہیں تیری گلی میں آئے ہیں خدا کے لئے اپنے موئے مبارک کے
جمال سے کچھ تول جائے اپنے ہاتھ کو ہماری جھولی کی طرف بڑھا دے
تیرے دست و بازو کو شاہِ بائش ہے۔

کیوں صاحب کیا بے اطمینانی میں کسی کو ایسی فرمائشوں کی سوچھ سکتی ہے یہ غایت
فرحت کا اثر تھا۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی حکایت
مشہور ہے کہ جب آپ کا انتقال ہو گیا اور جنازہ لے چلے ایک مرید نے شہر
غم میں درد کے ساتھ یہ اشعار پڑھے۔

سرو سیمینیا بھیرا میردی سخت بے مہری کہ بے مامیروی
اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا میروی
اے سرو سیمین تو جنگل کی طرف جا رہا ہے بڑی بے مروتی ہے کہ ہم کو
چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اے وہ ذات کہ تیرا روئے مبارک ایسا ہے کہ سب لے لگ
اس کو ہر وقت دیکھنا چاہتے ہیں تو خود کس طرف تماشا دیکھنے جا رہا ہے۔
لکھا ہے کہ ہاتھ کفن کے اندر بلند ہو گیا۔ صاحبو ایک ایسا شخص جس کی یہ حالت
ہو کہ پا بدستے دگرے دست بدست دگرے۔ کیا اس کو وہد ہو سکتا
ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی بے حد فرحت کا دن ہوتا ہے۔ ایک دوسرے
بزرگ انتقال کے وقت منتظرانہ و مشاقانہ فرماتے ہیں۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جہاں شوم
وہ وقت آگیا ہے کہ میں یرہنہ ہو جاؤں جسم کو بھی چھوڑ دوں اور
پوری طرح روح ہی روح بن جاؤں۔

اور یہ حالت کیوں نہ ہو جب کہ وہ جانتے ہیں کہ اب پردہ ہائے ہیولانی
جو کہ مانع دیدار تھے اٹھتے ہیں اور کوئی گھڑی ہے کہ محبوب حقیقی کا دیدار

نضیب ہو گا صرف یہ نہیں کہ ان کو جنت کی یا حوروں کی ہوس ہوتی ہے حضرت ابن القارضؒ کا واقعہ لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوئے لگا تو جنت منکشف ہوئی آپ نے اس طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا ہ ان کان منزلتی المحب عندکم ما قدرہم آیت فقد ضیعت ایامی اگر میرے لئے یہ کوئی خاص مقام علیحدہ اپنے نزدیک مقرر کر دیا گیا ہے آپ کی محبت کی وجہ سے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی عمر ضائع ہی کر دی۔

کہ جان تو آپ کے لئے دے رہا ہوں جنت کو کیا کروں آخر جنت چھپ گئی اور فوراً سخی ظاہر ہوئی اور جان بحق ہوئے ان کی بالکل وہی حالت ہو گئی کہ ہ

گر بیاید ملک الموت کہ جانم برو تانہ بینم رخ تو روح و میدان ندیم اگر میری جان لینے کے لئے ملک الموت آئے گا تو میں اس وقت تک جان کر نہ نکلنے دوں گا جب تک کہ تیرے روئے مبارک کو نہ دیکھ لوں۔

اکثر لوگ ان حالات کو سُن کر تعجب کریں گے۔ لیکن یہ تعجب صرف اس وجہ سے ہے کہ خود اس سے محروم ہیں مگر ایسے لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ عذ تو مشو منکر کہ حق بس قادر است

غرض بزرگوں کے حالات اور حدیث وغیرہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان بزرگوں کی وفات کا دن یوم العرس ہے۔ لیکن لوگوں نے اسکی مفہوم و مصداق دونوں کو بالکل خراب کر دیا ہے۔ مصداق کی خرابیاں تو ظاہر ہیں کہ تمام شرک و بدعت اس عرس کا جزو ہو گئی باقی مفہوم کی خرابی یہ کہ اس لفظ کے لغوی معنی لے کر شادی کے لوازم بھی وہاں جمع کر دیئے چنانچہ اکثر جگہ رسم ہے کہ بزرگوں کی قبر پر مہندی چڑھاتے ہیں نوبت نقارہ رکھتے ہیں اسی طرح مزا میر وغیرہ سب لغو حرکتیں جمع کر رکھی ہیں غریب مردہ پر

تو بس چلتا نہیں قبر کی گت بنائی جاتی ہے تو حقیقت میں وہ یوم العرس اس اعتبار سے ہے کہ جس کو ذکر کیا گیا کہ وہ ان بزرگوں کی خوشی کا دن ہے اور یہ کوئی دنیوی خوشی نہیں ہے تو اس میں کوئی طریقہ مقرر کرنے کے لئے ضرورت وحی کی ہوگی اور وحی ہے نہیں بلکہ اس کے خلاف پروجی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لا تتخذوا قبوی عیداً کہ میری قبر کو عید نہ بنانا عید میں تین چیزیں ضروری ہیں ایک اجتماع دوسرے تعین وقت تیسرے فرحت تو ممانعت کا خلاصہ یہ ہوا کہ میری قبر پر کسی یوم معین میں سامان فرحت کے ساتھ اجتماع نہ کرنا ہاں اگر خود بخود کسی وقت میں کسی غرض سے اجتماع ہو جاوے تو اور بات ہے۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہاں سے تشریف لیجانا اگرچہ آپ کے لئے باعث سرور ہے لیکن ہمارے لئے تو باعث حزن ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے جو ہم پر نعمت کامل فرمائی ہے جس کو میں نے نشر الطیب میں لکھا آگاہ دوسرے اعتبار سے ہے۔ پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر ایسا اجتماع جائز نہیں تو دوسروں کی قبر پر ایسا اجتماع کیونکر جائز ہوگا اور عجیب برکت ہے کہ آج تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر اجتماع کا کوئی خاص دن معین نہیں ہوا۔ بحمد اللہ اس مسئلہ کی تحقیق کافی ہو گئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حدیث سے ہم کو افطار اکبر پر عید کرنے کا حکم ہے اور اس میں یہ باتیں ہونی چاہئیں ملاقات کرو خوش ہو اکثار صدقہ کرو سب مجتمع عید گاہ میں دو گانہ ادا کرو صابو غور کیجئے کہ خدا تعالیٰ ہماری خوشی کو بھی کس انداز پر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں نماز کا حکم فرمایا اکثار صدقہ کا حکم فرمایا کہ یہ زکوٰۃ کے مشابہ ہے۔ اور مناسز کی بھی ایک خاص ہیئت

لہ نشر الطیب ملنے کا پتہ : مکتبہ تھانوی بندر روڈ ریم۔ ۱۷ جلع روڈ کراچی ۷

مقرر مائی کہ اس میں چند تکبیریں پڑھا دیں کہ امتیاز علامت ہے اہتمام شان کی اور اسی لفظ سے قرآن میں بھی ارشاد ہے ولتکبروا لله علی ما ہدانا کہ تا کہ تم بڑائی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی اس بات پر کہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے) اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف ہو گیا کہ لتکملوا العدة میں تکمیل رمضان مراد ہوا اور لتکبروا سے عید اور ایک حکمت دیکھئے مسلمان میں دو چیزیں ہیں ایک دین اور ایک طبیعت اور جس طرح اس کی طبیعت میں بعض امور کا جوش اور تقاضا پیدا ہوتا ہے اسی طرح اس کے دین کو بھی جوش ہوتا ہے اور ان دونوں کی معدل عقل ہوتی ہے۔ پس خدا تعالیٰ نے جوش دین کا تو یہ انتظام فرمایا کہ نماز مقرر فرمائی اور جوش طبیعت کا یہ انتظام فرمایا کہ اس دن اچھے سے اچھا کپڑا پہننے کی اجازت دی سبحان اللہ شریعت کا کیا پاکیزہ انتظام ہے کسی نے خوب کہلے گویا جمال شریعت ہی کے شان میں ہے ۵

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم کمر شمر امن دل مے کشد کہ جا اینجاست چوٹی سے لیکر ایڑی تک جس جگہ بھی میں دیکھتا ہوں ہر جگہ کی خوبی دل کے دامن کو کھینچتی ہے کہ دیکھنے کی جگہ یہی ہے یعنی ہر جگہ پسندیدہ ہے۔

افسوس اس شریعت کو لوگوں نے بھیا نک صورت میں ظاہر کیا اور لوگوں کو اس سے متوحش بنا دیا ورنہ وہ تو عجیب و غریب ہے یہ احکام تھے عید کے متعلق لیکن عید کے متعلق فرعی احکام میں نے اس وقت اس لئے بیان نہیں کئے کہ متعدد بار بیان ہو چکے ہیں مثلاً چاند دیکھنے میں کوشش کرنا خبروں کے اعتبار کرنے میں احتیاط کرنا وغیرہ لیکن صدقہ فطر کے متعلق اس وقت اتنا بیان کرتا ہوں کہ جس کے پاس پچاس روپیہ کی مالیت اپنی حاجت سے زیادہ ہو اس پر واجب ہے کہ اپنی اور اپنے چھوٹے بچوں کی طرف سے پونے دو سیر بچہ گندم مساکین کو دے دو مگر تنخواہ میں دینا درست نہیں کیونکہ تنخواہ دار کی تنخواہ میں دینے سے صدقہ فطر ادا نہیں ہوتا۔ ہاں ایک فضیلت یوم عید کی

اور یاد آئی حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں کے عید گاہ میں جمع ہونے کے بعد خدا تعالیٰ فرشتوں کو مخاطب بنا کر فرماتے ہیں ما جزاء اجیدوفی عملہ یعنی اس مزدور کو کیا بدلہ دیا جاوے جس نے اپنے عمل کو پوری طرح کیا ہو فرشتے عرض کرتے ہیں جزاء دان یونی اجرہ کہ اس کی ہرزایہ ہے کہ اسے پوری مزدوری دی جاوے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وعزتی وجلالی وادتفاع شافی لاغفرنھو فیوجعون مغفوراً للھو یعنی خدا تعالیٰ فرما دیں گے کہ اپنے جلال اور عزت کی قسم آج میں اُن کی مغفرت کئے دیتا ہوں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اس گفتگو کو نقل فرما کر ارشاد فرماتے ہیں کہ بس لوگ بے نیچے بختائے واپس آتے ہیں تو اس حدیث کے سننے کے بعد اب لوگوں کو غور کرنا چاہیئے کہ عید گاہ میں کیسی ہیئت بنا کر جانا چاہئے کہ اس کرامت کے اہل تو ہوں افسوس ہے کہ اکثر لوگ نا فرمانوں کی صورت بنا کر جاتے ہیں بہتر بلکہ ضروری بات ہے کہ جو لوگ ڈاڑھی منڈاتے ہیں یا ترشواتے ہیں آج سے توبہ کر لیں ہمیشہ کے لئے نہ ہو سکے تو عید بقرعید کے گزرنے تک تو اس سے بچے رہیں کہ ان دقتوں میں بڑی حاضری ہوتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر ڈاڑھی نہ منڈائی جائے تو کوئی نقصان بھی تو نہیں اور منڈانے سے کوئی نفع بھی تو حاصل نہیں ہوتا پھر اس بے لذت گناہ سے کیا نتیجہ کہ خدا کے سامنے ذلیل بھی ہوئے دنیا میں کچھ مزاتک بھی نہیں آیا اسی طرح بعض لوگ ریشمی لباس پہن کر عید گاہ میں جاتے ہیں ان لوگوں کو سمجھنا چاہیئے کہ ان کی منساہ مقبول نہیں ہوتی نیز اپنے لڑکوں کو بھی ایسا لباس نہ پہنا دیں صابو کیا کسی بادشاہ کے دربار میں جاتے ہوئے کوئی شخص بغاوت کے متمتع سجا کر جاسکتا ہے۔ پھر کیا خدا کی عظمت شاہان دنیا کے برابر بھی نہیں اس کو بوجھو اور خدا تعالیٰ کے عذاب کو پیش رکھ کر ان سب خرافات سے باز آجاؤ۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ توفیق عمل دے آمین ثم آمین۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً

(سداۃ البخاری)

دعواتِ عبیدیت جلد دوم

ک

آٹھواں وعظ ملقب بہ

غَضُّ الْبَصَرِ

(مبجلہ ارشادات)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ :

ناشر: محمد عبدالمتنان

مکتبہ تھانوی۔ دفتر الابقار

مسافر خانہ۔ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعوات عبدیت جلد دوم کا

آٹھواں وعظ ملقب بہ

غض البصر

ابتدائی	میں	کھ	کھینچ	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	پیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تحیدنی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۱۳ شوال ۱۳۲۹ھ	۳ گھنٹے	پیٹھ کر	چشم معصیت	مولوی عبداللہ صاحب کنگوہی	تقریباً دو ہزار	.

الحمد لله محمدًا ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله وصلى الله تعالى عليه وعلى آله واصحابه وبارك وسلم۔ اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم۔ بسم الله الرحمن الرحيم يعلم خائنة الاعين وما تخفي الصدور۔

ترجمہ آیہ شریفہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو جانتے ہیں اور جس شے کو سینے میں چھپاتے ہیں اس کو بھی جانتے ہیں۔ یہ ایک آیہ ہے جس کے الفاظ تھوڑے ہیں اور معانی بہت ہیں اس اللہ تعالیٰ نے ایک امر قبیح پر مطلع فرمایا ہے اور علاوہ اطلاع کے اس میں زجر بھی ہے اس کو اس وقت اس لئے اختیار کیا۔ ہے کہ جس مرض کا اس میں بیان ہے آج کل اس میں بہت ابتلا ہے اور امراض میں سے

وہی مرض متنبہ کرنے کیلئے لیا جاتا ہے جس میں ابتلا ہوا اور مرض سے یہاں مراد معصیت ہے گو لوگ اس کو مرض سمجھیں کہ تعجب ہوگا کہ اس کو مرض کیوں کہا گیا لیکن بعد بیان حقیقت مرض کے اس کی وجہ سمجھ میں آجاوے گی مرض کی حقیقت ہے اعتدال سے مزاج کا خارج ہو جانا اور معصیت میں بھی قلب کا مزاج اعتدال سے خارج ہو جاتا ہے بلکہ یہ خروج عن الاعتدال جو قلب کے متعلق ہے زیادہ مضر ہے اس لئے کہ بدنی مرض کا انجام بہت سے بہت یہ ہے کہ مر جاوے گا اور مرنے سے بعض اوقات نفع ہوتا ہے کہ بہت سے جھگڑوں سے چھوٹ جاتا ہے کیونکہ جس قدر آرام ہیں وہ اس بدن اور روح ہی کے تعلق کی وجہ سے ہیں دیکھئے مرض حذر یعنی سن ہو جانے میں بدن کو اگر کاٹ ڈالیں تو کچھ بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی اور مفلوج کے فالج زدہ حصہ میں اگر سرنیاں بھی چھبوتیں تو کچھ بھی اثر نہیں ہوتا کیونکہ روح کا تعلق بدن سے ویسا نہیں رہا باوجودیکہ اس حالت میں روح سے تعلق رہتا ہے گو وہ تعلق ضعیف ہی ہے اور اس تعلق ہی کا اثر یہ ہے کہ وہ عضو گلنا سڑتا نہیں جیسے مردہ کا بدن گل جاتا ہے اور جبکہ بالکل ہی روحی مفارقت ہو جاوے اور یہ تعلق ضعیف بھی نہ رہے گا تو ظاہر ہے کہ بطریق اولیٰ تکلیف نہ ہوگی یعنی جو مفہوم تکلیف کا ہمارے نزدیک ہے اور جو معنی متبادر الم کے ہیں وہ نہ ہوگی ہاں دوسری دلائل سے معلوم ہوا کہ روح کو بعد مفارقت جسم کچھ تازی ہوتی ہے ، جیسا کہ بعض نصوص میں ہے کہ مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا جس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ ایسے فعل سے روح کو کچھ الم ہوتا ہے مگر جس قسم کا الم روح کے تعلق مع الجسم کی حالت میں ہڈی توڑنے سے روح کو ہوتا ہے وہ الم نہیں ہوتا اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھنا چاہیئے کہ مثلاً زید کے بدن کو اگر مارا جائے تو اس کو تکلیف ہوگی اور زید کی رضائی اتار کر جو لٹھے میں رکھ دی جاوے تب بھی تکلیف ہوگی مگر دونوں تکلیفیں جدا جدا ہیں پس روح کے مفارقت ہونے کے بعد روح کو ایسی تکلیف ہوتی ہے جیسے رضائی جلانے سے زید کو ہوئی اور اس تکلیف کی وجہ بھی وہی تعلق سابق ہے جو بدن کے ساتھ اس کو تھا وہ تعلق اس کو مستحضر ہوتا ہے ۔

اس لئے تکلیف ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب روح مفارق ہو جاتی ہے تو کوئی الم نہیں رہتا۔ اس وقت ایک لطیفہ یاد آیا ایک طیب کی تعریف کی گئی کہ یہ بڑے اچھے حکیم ہیں ان کے علاج سے مرض ہی نہیں رہتا یعنی مریض ہی نہیں رہتا جو مرض رہے کیونکہ مرض نہ رہنے کی دو صورتیں ہیں یا تو مریض رہے اور تندرست ہو جاوے، یا یہ کہ مریض ہی چل دے۔ جیسے کسی افیونی کی ناکٹ کھی اگر بیٹھی اس نے اڑا دیا وہ پھر آ بیٹھی جب کئی بار اڑانے سے نہ گئی تو آپ نے چھری لے کر ناک اڑا دی اور کہا وہ اڑا ہی نہیں رہا جس پر اب بیٹھے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے نہ زکام رہتا ہے نہ کھانسی نہ بخار نہ فکر نہ رنج سب بلائیں اور آلام دور ہو جاتے ہیں بالکل سکون ہو جاتا ہے سکون کے لفظ پر ایک شرعی لطیفہ یاد آیا اور وہ حکیمانہ لطیفہ ہے۔ اور وہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ اور ان کی بی بی ام سلیم کا قصہ ہے ان دونوں میاں بی بی کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے ایک مرتبہ ان کا بچہ بیمار ہو گیا۔ حضرت ابو طلحہ ہمیشہ اکبر بی بی سے اس کا حال پوچھتے۔ ایک روز وہ بچہ انتقال کر گیا حضرت ابو طلحہ اس وقت باہر تھے بی بی یہ خیال کیا کہ اگر میں اب اطلاع کروں گی تو شب کا وقت ہے نہ کھانا کھائیں گے اور نہ ان کو نیند آئے گی خواہ مخواہ بے چین ہوں گے اس لئے مناسب ہے کہ اس وقت اطلاع ہی نہ کی جائے حقیقت میں دین عجیب شے ہے تمام عمر کی اصلاح کر دیتا ہے۔ حضرت ابو طلحہ جب باہر سے تشریف لائے تو حسب عادت دریافت فرمایا کہ بچہ کیسا ہے، اب یہ وقت بڑے امتحان کا تھا اگر سچ بولیں تو وہ مصلحت فوت ہوتی ہے اور جھوٹ میں شرعاً گناہ حقیقت میں بڑی کشمکش کا وقت تھا لیکن دین فہم کو تیز کر دیتا ہے چنانچہ من جانب اللہ ایک جواب ان کو القاء ہوا۔ فرمایا اب تو اس کو سکون ہے آرام ہے اس لئے کہ موت سے بڑھ کر کوئی سکون اور آرام نہیں ہے اس لئے کہ آرام و راحت کی دو صورتیں ہیں دفع مضرت یا جلب منفعت دونوں حالتوں میں عرفاً آرام سے ہونا کہا جاتا ہے۔ موت میں دونوں چیزیں موجود ہیں دفع

مضرت بھی ہے وہی وہی ہے اور جلدِ منفعت یہ ہے کہ موت سے وصول الیٰ محبوب الحقیقی ہوتا ہے یہ خاص مسلمانوں کے لئے ہے ایک لطیفہ یاد آیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میرے باپ یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو جیسا کہ ایک اعرابی نے مجھ کو تسلی دی ایسی کسی نے نہیں دی سچ یہ ہے کہ دیندار خواہ گاؤں کا ہو یا شہر کا اس کا فہم چونکہ دین کی وجہ سے درست ہو جاتا ہے اس لئے وہ حقائق امور کو خوب سمجھتا ہے وہ مضمون تسلی کا یہ ہے۔ اصبر تنکون بک صابرین فاما صبر الرعیۃ بعد صبر الراس خیر من العباس اجرک بعدک۔ واللہ خیر منک للعباس مطلب یہ ہے کہ اب صبر کیجئے ہم بھی آپ کی وجہ سے صبر کریں گے کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑے کے صبر کے بعد ہوتا ہے اور اس واقعہ میں نہ تمہارا کچھ نقصان ہوا بلکہ نفع ہی ہے اور وہ نفع یہ ہے کہ تم کو ثواب ملا اور وہ ثواب تمہارے لئے حضرت عباسؓ سے بہتر ہے اور حضرت عباسؓ کا بھی کچھ نقصان نہیں ہوا اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ سے مل گئے اور اللہ تعالیٰ انہیں کے لئے تم سے بہتر ہے یعنی تمہارے پاس رہنے سے اللہ کے پاس رہنا بہتر ہے یہ عجیب مضمون ہے حقیقت میں موت ایسی ہی آرام کی شے ہے حدیث میں آیا ہے کہ موت مؤمن کا تحفہ ہے اور انسان کی حالت یہ ہے کہ اس سے بھاگتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اس عالم کو دیکھا نہیں۔ موت ایک ریل گاڑی کی طرح ہے جیسے گاڑی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہے اسی طرح موت اس عالم سے دارِ آخرت میں پہنچا دیتی ہے جب گاڑی میں آدمی بیٹھا ہوتا ہے تو اس کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ میرے لئے وہاں کیا کیا تیار ہو رہا ہے جب ریل سے اسٹیشن پر اُترے دیکھا تو وہاں طرح طرح کے سامان ہیں ایک مخلوق استقبال کے لئے کھڑی ہے اقسام اقسام کی نعمتیں کھانے پینے کی موجود ہیں تو اس وقت جانتا ہے کہ اللہ اکبر یہاں تو ہمارے لئے بڑا سامان ہے اور جہاں سے آیا تھا وہ سب اُس کی نظر میں بیچ معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کا خیال تک بھی نہیں آتا اسی طرح اس دنیا کا حال ہے کہ اس وقت یہاں کچھ خبر نہیں لیکن جب یہاں سے رحلت ہوگی تو انشاء اللہ تعالیٰ وہاں دیکھ لیں گے کہ یہاں ہمارے

کیا نعمتیں ہیں اور بزرگوں نے بصر سے یا بصیرت سے دیکھا ہے اس لئے اُن کی نظر میں دنیا کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ دنیا کو عالمِ آخرت کے ساتھ وہ نسبت ہے جو ماں کے رحم کو اس دنیا کے ساتھ ہے جیسے بچہ اپنی رضامندی سے دنیا میں نہیں آتا اسی طرح آدمی وہاں جانا نہیں چاہتا اور جیسے بچہ ماں کے رحم ہی کو سمجھتا ہے کہ تمام جہان یہی ہے اور آگے اس کی نظر ہی نہیں جاتی اور جب ماں کے رحم سے نکلتا ہے تو حقیقت معلوم ہوتی ہے اسی طرح ہم لوگ جب یہاں سے جاویں گے تو اس دنیا کی حقیقت معلوم ہوگی۔ بہر حال موت ہر طرح سکون اور آرام کی شے ہے۔ اسی واسطے حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے فرمایا اب اس کو سکون ہے اس کے بعد حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے کھانا کھایا اور پھر ان کو بی بی کے پاس جانے کی رغبت ہوئی اور بی بی کا حال یہ کہ ظاہر میں تو جو کچھ میاں کہتے تھے ان کی رضامندی کے واسطے سب کچھ کر رہی تھیں مگر اندر جو کچھ تھا وہ حق تعالیٰ کو معلوم تھا غرض میاں تو فارغ ہو کر سو رہے اور بی بی کو کیا تین دن آئی ہوگی صبح کے وقت جب حضرت ابو طلحہ نماز پڑھ کر تشریف لائے تو بی بی نے پوچھا کہ بھلا ایک بات تو بتلاؤ اگر کوئی شخص کسی کے پاس کوئی امانت رکھ دے تو جب وہ اپنی امانت مانگے تو ہنسی خوشی دینا چاہیے یا ناک منہ چڑھانا چاہیے۔ انھوں نے فرمایا کہ نہیں ہنسی خوشی دینا چاہیے کہا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی امانت لے لی۔ اب تم صبر کرو، میاں ناراض بھی ہوئے کہ رات تم نے خبر نہ کی، فرمایا کہ کیا نفع تھا تم پریشان ہو گئے مجھے اس پر قصہ یاد آیا تھا کہ انھوں نے موت کا نام سکون رکھا۔ حاصل یہ کہ امراضِ بدنہ کا انتہائی انجام موت ہے اور موت چونکہ قاطع تمام مصائب کی ہے اس لئے کچھ مضر نہیں مگر پھر بھی امراضِ بدنہ کا اس قدر اہتمام ہوتا ہے جس کی کوئی حد نہیں بخلاف مرضِ روحانی کے جس کی حقیقت ہے حدودِ شرعیہ سے تجاوز کرنا اور اعتدال سے خارج ہو جانا کہ اس کا انجام وہ ہلاکت ہے جس کی نسبت فرمایا ہے لا موت فیہا دلا یعنی جس کا نام جہنم ہے اگر موت آجاتی تو سب قصے ختم ہو جاتے

مگر وہاں موت بھی نہیں پس جس مرض کا انجام صرف ہلاکت بدن ہے اس کو جب قابلِ اہتمام سمجھتے ہیں تو جس مرض کا نتیجہ ہلاکتِ ابدی یا مدیدِ شدید ہے کیا وہ قابلِ اہتمام نہیں کیا اس کو مرض نہ کہا جاوے گا مگر حالت یہ ہے کہ زکام ہو جاوے تو حکیم جی کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں اور ہار و حافی امراض میں مبتلا ہیں اور کچھ پرواہ نہیں اور یوں تو ہر معصیت قابلِ اہتمام و فکر ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ وہ معصیت زیادہ قابلِ فکر ہے جس کو خفیف سمجھا جاوے کسی نے بقراط سے پوچھا تھا کہ امراض میں کونسا زیادہ شدید ہے کہا کہ جس مرض کو خفیف سمجھا جاوے وہ بہت اشد ہے۔ اسی طرح جس گناہ کو ہلکا سمجھا جاوے وہ بہت شدید ہے اس لئے کہ وہ لا علاج ہے سو منجملہ ایسے امراض کے ایک مرض یعنی گناہ وہ ہے جس کا اس آیت کریمہ میں ذکر ہے اور اسی واسطے اس کو اس وقت اختیار کیا گیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں **يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ الْخُلَاصَةَ** یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو گناہوں کا ذکر فرمایا ہے آنکھوں کے گناہ کو اور دل کے گناہ کو اور یوں تو آنکھوں کے بہت سے گناہ ہیں لیکن یہاں ایک خاص گناہ کا ذکر ہے وہ کیا ہے بد نگاہی۔ اسی طرح دل کے بہت سے گناہ ہیں لیکن یہاں بقرینہ سابق خاص گناہ کا ذکر ہے یعنی نیت بُری ہونا ان دونوں گناہوں کو لوگ گناہ سمجھتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ جس درجہ اُن کی مضرت ہے اس قدر نہیں سمجھتے چنانچہ گناہ کا ادنیٰ اثر یہ ہونا چاہیے کہ دل تو میلا ہو جائے مگر اس گناہ کے بعد دل بھی میلا نہیں ہوتا بہت خفیف سمجھتے ہیں۔ کسی عورت کو دیکھ لیا کسی لڑکے کو گھور لیا اس کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے کسی اچھے مکان کو دیکھ لیا یا کسی پھول کو دیکھ لیا اور یہ گناہ وہ ہے کہ اس سے بوڑھے بھی بچے ہوئے نہیں ہیں۔ بدکاری سے تو بہت محفوظ ہیں کیونکہ اس کے لئے بڑے اہتمام کرنے پڑتے ہیں اول تو جس سے ایسا فعل کرے وہ راضی ہو اور روپیہ بھی پاس ہو اور نیز حیا و شرم بھی مانع نہ ہو غرض اس کے لئے شرائط بہت ہیں اسی طرح موانع بھی بہت ہیں۔ چنانچہ کہیں تو یہ

امرائع ہوتا ہے کہ اگر کسی کو اطلاع ہو گئی تو کیسا ہو گا۔ کسی کو خیال ہوتا ہے کہ کوئی بیمار ہی نہ لگ جاوے۔ کسی کے پاس روپیہ نہیں ہوتا کسی کو اس کی وضع مانع ہوتی ہے چونکہ موائع زیادہ ہیں اس لئے کوئی شائستہ آدمی خصوصاً جو دیندار سمجھے جلتے ہیں اس میں بہت کم مبتلا ہوتے ہیں بخلاف آنکھوں کے گناہ کے کہ اس میں سامان کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ نہ اس میں ضرورت روپیہ کی اور نہ اس میں بدنامی کیونکہ اس میں خبر تو اللہ ہی کو ہے کہ کیسی تبت ہے کسی کو گھور لیا اور مولوی صاحب مولوی صاحب رہتے ہیں اور قاری صاحب قاری صاحب رہتے ہیں نہ اس فعل سے ان کی مولویت میں فرق آتا ہے اور نہ قاری صاحب کے قاری ہونے میں کوئی دھبہ لگتا ہے اور گناہوں کی خبر تو اوروں کو بھی ہوتی ہے مگر اس کی اطلاع کسی کو نہیں ہوتی۔ معصیت کرتے ہیں اور نیک نام رہتے ہیں۔ لڑکوں کو گھورتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو بچوں سے بڑی محبت ہے جبکہ آنکھوں کے گناہ میں اطلاع نہیں ہوتی تو دل کے گناہ پر تو کیسے ہو سکتی ہے اور جن کو اطلاع ہوتی بھی ہے وہ حضرات ایسے متحمل اور ظرف والے ہیں کہ کسی کو خبر نہیں کہتے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور وہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ کر آیا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خطاب خاص سے تو اس کو کچھ نہ فرمایا لیکن یہ فرمایا ما بان اقوام یتوشح الزنا من اعینہم۔ یعنی لوگوں کا کیا حال ہے کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے تو یہ عنوان ایسا ہے کہ اس میں رسوائی کچھ نہیں لیکن جو کرنے والا ہے وہ سمجھ جائے گا کہ مجھے فرما رہے ہیں اہل کشف نے لکھا ہے کہ بدنگاہی سے آنکھوں میں ایک ایسی ظلمت ہو جاتی ہے کہ جس کو تھوڑی سی بصیرت ہو وہ پہچان لے گا کہ اس شخص کی نگاہ پاک نہیں ہے اگر دو شخص ایسے لئے جاویں کہ عمر میں حسن و جمال میں اور ہر امر میں وہ برابر ہوں فرق ان میں صرف اس قدر ہو کہ ایک فاجر ہو دوسرا متقی ہو جب چاہے دیکھ لو متقی کی آنکھ میں رونق اور دل فریبی ہوگی اور فاسق کی آنکھ میں ایک قسم کی ظلمت اور بے رونقی ہوگی لیکن اہل کشف

خصوصیت سے کسی کو کہتے نہیں بلکہ عیب پوشی کرتے ہیں اس پر مجھے مولانا شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت یاد آئی شاہ صاحب مسجد میں بیٹھ کر حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حسب معمول حدیث کا درس ہو رہا تھا کہ ایک طالب علم وقت سے دیر کر کے سبق کے لئے آئے حضرت شاہ صاحب کو منکشف ہو گیا کہ یہ جنبی ہے غسل نہیں کیا وہ طاعلم معقولی تھے معقولی ایسے ہی لاپرواہ ہوتے ہیں شاہ صاحب نے مسجد سے باہر ہی روک دیا اور فرمایا کہ آج تو طبیعت مسست ہے جہنا پر چل کر نہائیں گے سب لنگیاں لے کر چلو سب لنگیاں لے کر چلے اور سب نے غسل کیا اور وہاں سے آکر فرمایا کہ تا غممت کرو کچھ پڑھ لو وہ طاعلم ہمدامت سے پانی پانی ہو گیا۔ اہل اللہ کی یہ شان ہوتی ہے کیسے لطیف انداز سے اس کو امر بالمعروف فرمایا اور جب بزرگوں کی شان معلوم ہو گئی کہ وہ کسی کو رسوا نہیں کرتے تو اب مستفیدین کو بھی چاہیئے کہ ایسے شیوخ سے اپنے عیب کہ نہ چھپا یا کریں اس لئے کہ عیب ظاہر نہ کرنا دو وجہ سے ہوتا ہے یا خوف ہوتا ہے کہ یہ ہم کو حقیر سمجھیں گے سو ان حضرات میں نہ تو یہ بات ہے کہ کسی کو حقیر سمجھیں اس لئے کہ یہ حضرات سوائے اپنے نفس کے کسی کو حقیر نہیں سمجھتے اور یا نہ خوف ہوتا ہے کہ کسی کو اطلاع کر دیں گے سو نہ ان حضرات میں یہ بات ہے اس لئے ان سے صاف کہہ دینا چاہیئے مگر یہ اظہار معالجہ کے لئے ہے نہ کہ بلا ضرورت کیونکہ بلا ضرورت گناہ کو ظاہر کرنا بھی گناہ ہے اور بضرورت ظاہر کرنے کے حق میں حضرت عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں ۵

چند اداں کہ گفتیم غم با طبیبیاں در ماں نکر دند مسکیں غریباں
ما حال دل را با یار گفتیم بتواں نہفتن در و از حبایاں
میں نے طبیبوں سے جتنی بھی اپنے غم کی داستان کی وہ بے چارے میرا کوئی
علاج نہ کر سکے ہم نے اپنے دل کا حال اپنے دوستوں سے کہہ دیا کیونکہ دوستوں
سے حالت چھپائی ہی نہیں جاتی۔

غرض چونکہ وہ لوگ کسی کو فحیحت نہیں کرتے اور جو فسحیت کرنے والے ہیں ان کو اطلاع نہیں ہوتی اس لئے یہ گناہ بدنگاہی کا اکثر چھپا ہی رہتا ہے اس لئے لوگ بے دھڑک اس کو کہتے ہیں۔ پھر زنا و دیگر معاصی مثل سرقہ وغیرہ میں تو ضرورت اس کی بھی ہے کہ قوت و طاقت ہو اس میں اس کی بھی ضرورت نہیں اس لئے بوڑھے بھی اس میں مبتلا ہیں۔ دیکھئے بوڑھا اگر عاشق ہو جاوے اور قابو بھی چل جاوے تو کچھ بھی نہیں کر سکتا اس لئے کہ وہ قوت ہی نہیں ہے۔ مگر آنکھوں کے سینکنے میں تو اس کی بھی ضرورت نہیں خواہ لب گور ہی ہو جاوے مجھ سے ایک بوڑھے آدمی ملے اور وہ بہت متقی تھے انھوں نے اپنی حالت بیان کی کہ میں لڑکوں کو بڑی نظر سے دیکھنے میں مبتلا ہوں۔ ایک اور بوڑھے بھی عورتوں کے گھونٹنے میں مبتلا تھے اور یہ مرض اول جوانی میں پیدا ہوتا ہے بلکہ سب گناہوں کی یہی شان ہے کہ اول جوانی میں تقاضے کی وجہ سے کیا جاتا ہے پھر وہ مرض اور روگ لگ جاتا ہے اور لب گور تک کیا جاتا جیسے حقہ کہ اول کسی مرض کی وجہ سے پیدائش شروع کیا تھا مگر پھر یہ مرض لگ جاتا ہے اور شغل ہو جاتا ہے لیکن جوان اور بوڑھے میں فرق یہ ہے کہ جوان آدمی تو معالجہ کے لئے کسی سے کہہ بھی دیتا ہے اور بوڑھا آدمی شرم کی وجہ سے کسی سے کہتا بھی نہیں پس اس کے محفی رہنے اور خفیف ہونے کی وجہ سے اس میں کثرت سے ابتلا واقع ہے اسی واسطے فرماتے ہیں *یعلم خائنة الاعین وما تخفی الصدور* یعلمہ کا لفظ داں ہے کہ اور لوگ اس سے واقف نہیں ہیں ہم ہی واقف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے اس گناہ کی کسی کو خبر نہیں یہ صحیح نہیں ایسے کو خبر ہے کہ جس کو خبر ہو جانا غضب ہے اس لئے کہ اس کو تم پر پوری قدرت ہے اور اس گناہ کو ذکر فرما کر اس کی سزا بیان نہیں فرمائی بخلاف دیگر معاصی کے کہ ان کی سزا ساتھ ساتھ بیان فرمادی ہے۔ اس میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ طبائع ہم لوگوں کی مختلف ہیں بعض طبائع تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو سزا ہونا مانع اور زاجر ہوتا ہے وہ تو وہ

لوگ ہیں جو بے حیا و بے شرم ہیں کہ جو توں سے ڈرتے ہیں اور بغیر جوتیوں کے خواہ کسی کو خبر ہو جاوے اُن کو کچھ باک نہیں اور بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ سزا کی اگر اطلاع ہو جائے تو رکاوٹ کم ہوتی ہے لیکن اس سے وہ گریہ جاتے ہیں کہ فلاں کو خبر ہو جاوے گی بالخصوص جب یہ معلوم ہو جاوے کہ ہمارا یہ جرم معاف بھی ہو جائیگا تو اور بھی زیادہ عرق عرق ہو جاتے ہیں کیا خوب کہا ہے ۔

تصدق اپنے خدا کے جاؤں کہ پیارا آتا ہے مجھ کو انشا

ادھر سے ایسے گناہ پیہم اُدھر سے وہ دمدم عنایت

اسی بنا پر ایک آیت کی تفسیر یاد آگئی وہ یہ کہ غزوہ احد کے قصہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں کچھ خطا واقع ہوئی تھی وہ یہ کہ جس ناکہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت اور قائم رہنے کا امر فرمایا تھا بوجہ خطا اجہتا دی کے اس پر قائم نہ رہے اس کے بارہ میں ارشاد ہے اذ تصعدون ولا تلون علی احد والرسول یدعوکم فی اخر اکف فاصابکم غمّا بغم لکیلا تنزعوا علی ما ذاکم ولا ما اصابکم واللہ خبیر بما تعملون۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک غم دیا یہ سبب اس کے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تم نے غم دیا اور غرض اس غم دینے کی یہ فرمائی کہ تم لوگ غمگین نہ ہو تو بظاہر یہ فہم میں نہیں آتا اس لئے کہ غم تو اس لئے دیا جاتا ہے تاکہ حزن ہو نہ کہ اس لئے کہ غم نہ ہو اسی واسطے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ لازماً نہ ہے مطلب یہی ہے کہ غم اس لئے دیا تاکہ تم کو حزن ہو۔ لیکن الحمد للہ میری سمجھ میں اس کی تفسیر ایسی آئی ہے کہ اس تقدیر پر لاماننے کی ضرورت نہیں ہے اور معنی بے تکلف درست ہیں۔ وہ یہ کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حق تعالیٰ سے نہایت شربت تھے۔ جب ان سے یہ خطا واقع ہوئی تو ان کا جی چاہتا تھا کہ ہم کو سزا اس کی دنیا میں مل جائے تو ہماری طبیعت صاف ہو جاوے اور اپنے مالک حقیقی سے سرخرو ہو جائیں اگر سزا نہ ہوتی تو ساری

عمر بخیدہ رہتے اور یہ غم ان کے نزدیک نہایت جائزہ و جان فرساتھا اس بنا پر فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس خطا کی یہ سزا دے دی تاکہ تم کو غم نہ ہو۔ غرض کہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ جو سزا کا نام سن کر رکتے ہیں اور ایک وہ جو صرف اطلاع کی خبر دینے سے شرماتے ہیں اور اس کام کے قریب نہیں جاتے تو جو بے حیا تھے وہ تو یوں رُکے کہ یَعْلُوہ میں شاہ کی سزا کی طرف بھی ہے۔ چنانچہ مفسرین ایسے مقام پر فیجازیکو بہ فرماتے ہیں اور دوسرے مذاق والے اس لئے رُکے کہ شرم سے گر گئے کہ اللہ اکبرہ جانتے ہیں بہر حال یہ دونوں مذاق والوں کے لئے وعید ہے اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مرض نہایت اہتمام کے قابل ہے اب ہم کو اپنی حالت دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اندر اس معصیت سے بچنے کا کتنا اہتمام ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ شاید ہزار میں ایک اس سے بچا ہوا ہو ورنہ ابتلائے عام ہے اور اس کو نہایت درجہ ضعیف کہتے ہیں جو جوان ہیں ان کو تو اس کا احساس ہوتا ہے اور جن کی قوت شہو یہ ضعیف ہو گئی ہے ان کو احساس بھی نہیں ہوتا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تو شہوت ہی نہیں اس لئے کچھ حرج نہیں ہے سوان کو مرض کا بھی پتہ نہیں لگتا۔ اور بعضوں کو اور دھوکہ ہوتا ہے وہ یہ کہ شیطان بہکا تا ہے کہ جیسے کسی پھول اچھے کپڑے اچھے مکان وغیرہ کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے ایسے ہی اچھی صورت دیکھنے کو بھی دل چاہتا ہے سو یہ بالکل دھوکہ ہے۔ یاد رکھو کہ رنجت کے مختلف انواع ہیں جیسی رنجت پھول کی طرف ہے ویسی انسان کی طرف نہیں۔ اچھے کپڑے کو دیکھ کر کبھی جی نہیں چاہتا کہ اس کو گلے لگا لوں چٹا لوں، انسان کی طرف ایسی ہی رنجت ہوتی ہے۔ ایک دھوکہ اور ہوتا ہے وہ یہ کہ بعضے یہ کہتے ہیں جیسے اپنے بیٹے کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ گلے لگا لوں اسی طرح دوسرے کے بچے کو دیکھ کر بھی ہمارا یہی جی چاہتا ہو صاحبو! کھلی ہوئی بات ہے اپنے سیانے بچے اور دوسرے کے سیانے

لڑکے میں بڑا فرق ہے اپنے لڑکے کو گلے لگانا چمٹانا اور طرح کا ہے اس میں شہوۃ کی آمیزش ہرگز نہیں اور دوسرے کے لڑکے کی طرف اور قسم کا میلان ہے کہ اس میں گلے لگانے سے بھی آگے بڑھنے کو بعض کا جی چاہتا ہے۔ محبوب کی جدائی میں اور طرح کا رنج ہوتا ہے اور لڑکے کی جدائی میں اور قسم کا اور لڑکوں کی رغبت تو اور بھی سہم قاتل ہے نصوص میں تو اس کی حرمت ہے۔ ہمارے بزرگوں نے بھی جو اس کے آثار لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی سخت بلا ہے۔ ایک بزرگ مطلق نظر کے لئے فرماتے ہیں النظرۃ سہم من سهام ابلیس۔ یعنی نگاہ ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ حضرت ابوالقاسم قشیری دونوں امر کی نسبت فرماتے ہیں کہ سالک کے لئے مردوں اور غورتوں کی مخالطت رہزن ہے ایک بزرگ کاٹھن مردوں کے حق میں قول ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو اپنی بارگاہ سے مردود کرنا چاہتے ہیں اس کو لڑکوں کی محبت میں مبتلا کر دیتے ہیں غرض یہ نہایت معصرت کی چیز ہے اور دوسرے معاصی اور بدنگاہی کی معصیت میں ایک اور فرق ہے وہ یہ کہ صدور کے بعد سب گناہوں کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور دل بھر جاتا ہے مگر بدنگاہی ایسی شے ہے کہ جب صادر ہوتی ہے اور زیادہ تقاضا ہوتا ہے کہ اور دیکھو آدمی کھانا کھانا کھاتا ہے سیر ہو جاتا ہے پانی پیتا ہے پیاس بجھ جاتی ہے مگر یہ نظر ایسی بلا ہے کہ اس سے سیری نہیں ہوتی ہے اس حیثیت خاص سے یہ تمام گناہوں سے بڑھ کر ہے۔ بعض لوگ اس کو سمجھتے ہیں کہ اس سے خدا کا قرب ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ہم خدا کی قدرت دیکھتے ہیں مگر نرا شیطانی دھوکا ہوتا ہے۔ شیخ شیرازیؒ نے ایسے ہی لوگوں کے جواب میں ایک حکایت تحریر فرمائی ہے، فرماتے ہیں ۵

یکے صورت دید صاحب جمال	بگر دیدش از شورش عشق حال
بر انداخت بیچارہ چندان عرق	کہ شبنم بر آرد بہشتی ورق
گذر کرد بقراط بر درے سوار	بپرسید کیں را چہ افتاد کار

کسے گفتش این عابد پار ساست کہ ہرگز خطائے زوشتش نہ ساست
ببرداشت خاطر فریبے دلش فرورفتہ پائے نظر در گلش
نہ این نقش دل می رہاید ز دست دل آں مے رہاید کہ این نقش بست
بقراط جواب دیتا ہے۔

نگارندہ را خود ہمیں نقش بود کہ شوریدہ را دل بیغمار بود
چرا طفل یک روزہ ہوشش بند کہ در صنع دیدن چہ مانع چہ خرد
محقق ہماں بیند اندر اہل کہ درخوبہ دیانِ حسین و چنگل
اگر کوئی دعوے کرے کہ مجھ کو اونٹ اور انسان صاحبِ جمال دونوں برابر ہیں
وہ کاذب ہے آدمی اپنی طبیعت کا خود اندازہ کر سکتا ہے اور یہ میلان جس کو عشق
کہتے ہیں عشق نہیں ہے یہ شہوت ہے ایک صاحب فرماتے ہیں ۷
ایں نہ عشق است آنکہ در مردم بود ایں فساد از خوردن گندم بود
یہ عشق نہیں ہے جو کہ لوگوں میں عام طور پر موجود ہے یہ گیموں کھانے اور
پیٹ بھرا ہونے کی خرابی ہے۔

یہ سارا فساد دور روٹیوں کا ہے ایسے لوگوں کو چار روز تک روٹی نہ ملے اُس کے
بعد پوچھا جاوے کہ روٹی لاؤں یا لڑکا لاؤں یہ کہے گا کہ لڑکا اپنی ایسی تیزی میں جائے
روٹی لاؤ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ملا جامی نے عشق مجازی کا امر کیا ہے اور حکایت
لکھی ہے کہ کسی بزرگ کے پاس کوئی طالب گیا تھا انھوں نے کہا کہ عاشق ہو کر
آؤ اور آگے لکھتے ہیں ۷

متاب از عشق رو گر چہ مجازیت کہ آن بہر حقیقت کار سازیت
اگر اول الف با ۱۳ نحو ۱۴ نہ قرآن حرف خواندن کے توانی
اگر یہ عشق مجازی ہے مگر اس کا برا نہ سمجھ اور نہ نہ پھیر کیونکہ یہی عشق مجازی
حقیقت کے لئے کام بنانے والا ہے۔ جب تک تو الف باتا نہیں پڑھے گا
قرآن پاک کا ایک حرف بھی نہ پڑھ سکے گا۔

اس سے بعضے نادانوں نے سمجھا کہ جب تک کسی رنڈی کسی لونڈے کو قبلہ توجہ نہ بنایا جاوے اس وقت تک عشق حقیقی نہ میسر ہوگا بڑی غلطی اور سخت کم فہمی ہے میں اس کا مطلب عرض کرتا ہوں بات یہ ہے کہ اصلی مقصود طالب کا توجہ ہے کہ جملہ تعلقات قطع کر کے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ ہو تو اس کے درجہ میں تعلقات مخلوق سے قطع کرنا اس کو تو اصلاح میں فصل کہتے ہیں اور دوسری طرف تعلق پیدا ہونا اس کو وصل یعنی فصل و وصل کہتے ہیں اور یہ تعلقات ہی فاصل و جابست بن رہی ہے اگرچہ درمیان سے اٹھ جاویں تو وصل ہی وصل ہے شیخ فرماتے ہیں۔

تعلق جابست بے حاصلی جو پیوند ہائیکلی واصلی

تعلقات بیکار کے پردہ بن جاتے ہیں جب تو پیوندوں کو توڑ دے گا مقصد حاصل کر لے گا۔

پس معلوم ہوا کہ مقصود انقطاع عما سوا اللہ (اللہ کے سوا دوسروں سے تعلقات توڑ لینا) ہے جب یہ ہو جاوے تو قصہ سہل اور اس انقطاع کی تحصیل کے لئے بزرگوں نے مختلف معالجات اور تدبیریں فرمائی ہیں مقصود ایک ہی ہے صرف طرق مختلف ہیں ان میں سے ایک طریق تو ہے کہ جس جس مخلوق سے تعلق ہو اور جو جو مرض ہو اس کو قلب سے ایک ایک کر کے زائل کر دیا جاوے۔ چنانچہ متقدمین کا یہی طریق تھا لیکن اس طریق کے اندر سخت مشقت تھی اس لئے کہ مثلاً کسی شخص کو دس چیزوں سے تعلق ہے مکان سے بارگ سے اولاد وغیرہ سے اور دس ہی اس کو مرض ہیں کینہ احد، تکبر وغیرہ تو سب کا بالتفصیل علیحدہ علیحدہ معالجہ کیا جاوے اس کے لئے عمر نوح چاہیے اور پھر بھی بچ کنی ان امراض کی نہ ہوگی۔ اس مشقت کو دیکھ کر باہام حق پچھلے بزرگوں نے ایک طریقہ ایجاد کیا۔ ہے جیسے طبیب مشفق کی شان ہوتی ہے کہ مریض اگر کڑوی دوا سے ناک منہ چڑھاتا ہے تو وہ اس کو کسی اچھی تدبیر سے کھلا دیتا ہے یا بدل دیتا ہے۔ ایسے ہی انھوں نے دیکھا کہ مثلاً ایک شخص کو ایک ہزار چیزوں سے تعلق ہے تو اگر ایک ایک شے سے تعلق چھڑایا

جاوے تو بہت مدت صرف ہوگی کوئی تدبیر ایسا ہونا چاہیے کہ ایک دم سب کا خاتمہ ہو جائے جیسے کسی مکان میں کوڑا بہت ہو تو اس کی صفائی کا ایک طریق تو یہ ہے کہ ایک ایک تنکا لیا اور پھینک دیا اسی طرح سب تنکے اور کوڑا مکان سے باہر پھینک دیا جاوے اس میں تو بڑا وقت صرف ہوگا اور ایک طریق یہ ہے کہ جھاڑو لے کر تمام تنکوں کو ایک جگہ جمع کر کے پھینک دیا تو ایسے ہی یہاں بھی کوئی جھاڑو ہونا چاہئے کہ سب تعلقات کو سمیٹ کر ایک جگہ کر دیوے پھر اس ایک کا ازالہ کر دیا جاوے چنانچہ ان کی سمجھ میں آیا کہ عشق ایک ایسی شے ہے کہ سب چیزوں کو پھوک کر خود ہی رہ جاتا ہے چنانچہ اگر کوئی کسی کسی وغیرہ پر عاشق ہو جاتا ہے تو مال بیوی بچے۔ باغ مکان حتیٰ کہ اپنی جان تک اس کے واسطے ضائع کر دیتا ہے ایک رئیس کو بیلوں کا عشق تھا ہزار ہا روپیہ اس میں ضائع کر دیا۔ ہمارے استاد حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھا نوی رحمۃ اللہ علیہ کو کتابوں کا شوق تھا خود نہ دیکھتے تھے مگر سینکڑوں کتابیں اس قسم کی خرید کر رکھ چھوڑیں تھیں غرض عشق وہ شے ہے کہ سوائے معشوق کے سب کو فنا کر دیتا ہے۔

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت ہر چیز معشوق باشد جلد سوخت
عشق ایسی آگ ہے کہ جب وہ سلگ جاتی ہے تو سوائے معشوق کے ہر چیز کو جلا دیتی ہے۔

اس لئے ان بزرگوں نے تجویز کیا کہ طالب کے اندر عشق پیدا کرنا چاہیے خواہ کسی شے کا ہو اس واسطے وہ اول دریافت کرتے تھے کہ کسی پر عاشق بھی ہو۔ پس معلوم ہوا اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی ہی کا عشق ہو بھینس کا عشق بھی اس کے لئے کافی ہے اس لئے کہ مقصود تو یہ ہے کہ تمام اشیاء سے توجہ منصرف ہو کر ایک طرف ہو جاوے تاکہ پھر اس کا مالہ عشق حقیقی کی طرف سہل ہو جاوے چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ایک شخص ان کے پاس مرید ہونے آیا انھوں نے معلوم کیا کہ کسی شے سے تم کو محبت بھی ہے اس نے

کہا کہ مجھ کو اپنی بھینس سے محبت ہے فرمایا کہ جاؤ چالیس روز تک بھینس کا تصور کرو لیکن خدا کے لئے اور لوگ اس کا وظیفہ نہ کریں اس لئے کہ ہر شخص کی حالت جدا ہے کسی کے لئے کچھ مناسب ہے کسی کے لئے کچھ کبھی طیب اور اُس کے احمق شاگرد کا سا قصہ نہ ہو جاوے وہ یہ ہے کہ ایک طیب تھے وہ کسی مرتضیٰ کو دیکھنے گئے۔ پہلے روز کی حالت سے اس روز کچھ تغیر پایا تو کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے نارنگی کھائی ہے اُس سے تم کو یہ تکلیف بڑھ گئی اس نے کہا حضور بیشک نارنگی کھائی ہے جب وہاں سے فارغ ہو کر آئے تو راستہ میں شاگرد صاحب نے پوچھا کہ حضرت آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ اس نے نارنگی کھائی حکیم صاحب نے فرمایا بھائی بات یہ ہے کہ اس کے مزاج اور حالت دیکھ کر مجھ کو معلوم ہو گیا کہ کوئی بار دشنے اُس نے کھائی اور نارنگی کی تعین اس سے معلوم ہوئی کہ اُس کی چار پائی کے نیچے میں نے نارنگی کے چھلکے دیکھے شاگرد صاحب احمق تو تھے ہی جب طب پڑھ کر فارغ ہوئے تو کسی رئیس کو دیکھنے کے لئے بلائے گئے اُن کی چار پائی کے نیچے نمہ پڑا تھا فرماتے ہیں کہ بس معلوم ہو گیا آپ کو جو یہ مرض ہوا آپ نے نمہ کھایا ہے حاضرین سب ہنس پڑے اور طیب کا حلق سب پر واضح ہو گیا تو خدا کے واسطے ایسا قیاس نہ کیجیو کہ آج سے نماز روزہ ذکر شغل چھوڑ کر بھینس کا تصور باندھ کر بیٹھ جاؤ کہ یہ اس شخص کی خصوصیت تھی۔ الحاصل ان بزرگوں نے فرمایا کہ جاؤ بھینس کے تصور کا چلہ کیجیو اور چالیس روز کے بعد ہم کو خبر دو چنانچہ پانچ وقت نماز سے فارغ ہو جاتے اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر اسی بھینس کا تصور کیا کرتے۔ جب چالیس روز پورے ہو گئے تو پیر صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ بیٹا باہر آؤ کہتے ہیں کہ حضور باہر کیسے آؤں بھینس کے سینک اڑتے ہیں پیر صاحب نے شاہاشی دی کہ مقصود حاصل ہو گیا سب روگ جاتے رہے اب صرف بھینس رہ گئی اس کا نکل جانا ہل ہے پس اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اس کے لئے کسی عورت یا لڑکے کا عشق ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں سخت خطرہ ہے کہ اس کو نڈے یا عورت ہی میں

نہ رہ جائے اور مقصود اصلی سے محروم رہے اس لئے قصداً ہرگز اس کو اختیار کرنا جائز نہیں ہے ہاں اگر اضطراراً بلا قصد اس میں ابتلا کسی کو ہو جائے تو وہ بھی وصول کے لئے خاص شرائط کے ساتھ بعض اوقات ذریعہ ہو جاتا ہے۔

عاشقی گزریں سر و گزراں سرشت عاقبت مارا بیدار شد رہبر راست
مگر اس کی چند شرطیں ہیں اول تو یہ ہے کہ اس کے پاس نہ رہے نہ اس کو دیکھے نہ کلام کرے نہ اس کی آواز سنے حتیٰ الوسع دل سے بھی اس کو زائل کرنے کی فکر کرے غرض حتیٰ الامکان اس سے بچے اگرچہ اس طرح کرنا نفس کو بے حد شاق ہوگا لیکن ہمت نہ توڑے اور دل کو مضبوط کر کے اس پر عمل کرے چند روز کے بعد ایسا کرنے سے اس کے قلب میں ایک سوزش پیدا ہوگی اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ جاہ مال اولاد سب کی محبت جاتی رہیگی اب اس میں مادہ تو محبت کا پیدا ہو چکا ہے شیخ کامل اس کو مائل الحق کر دے گا اس صورت سے عشق مجازی وصول الی الحقیقۃ کا ذریعہ بن جاوے گا۔ اور اگر اس محبوب سے جدا نہ ہوا بلکہ اس سے اختلاط رکھا ہم کلام ہم نشین ہوا تو پھر اسی بلا میں پھنسا رہے گا اور کسی دن بھی اس کو اس سے خلاصی نہ ہوگی چنانچہ خود ملّا جامیؒ جن کے کلام سے عشق مجازی کی تحصیل پر استدلال کیا جاتا ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

ولے باید کہ در صورت نمانی وزیں پل زود خود را بگذرانی
لیکن چاہیے کہ صورت ہی میں نہ لگا رہے گا بلکہ اس بل پر سے جلد گزر جائے۔
مولانا اسی عشق کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

عشق یا مردہ تبا شد پایدار عشق را با حی و با قیوم دار
عشق ہائے گز پئے رنگے بود عشق نبود عاقبت ننگے بود

مرنے والی چیزوں سے عشق ہمیشہ رہنے والا نہیں ہوتا اس لئے ہی قیوم کے ساتھ عشق کرو۔
جو عشق رنگ دروپ کی وجہ سے ہوتا ہے وہ عشق نہیں ہے اس سے آخرت کا نقصان ہوتا ہے۔

آگے فرماتے ہیں۔

غرق عشقے شو کہ غرق است اندر عشق ہائے اولیں و آخریں

عشق میں بالکل ڈوب جاؤ کہ اس میں غرق ہو جانا ہی پہلے اور بعد کے لوگوں کا طریقہ ہے۔
پھر یہاں پر شبہ ہوتا تھا کہ ہم جیسوں کو عشق حقیقی تک رسائی کہاں ممکن ہے اس کا
جواب دیتے ہیں۔

تو لگو مارا بدن شد بار نیست باکرمیاں کار ہا دشوار نیست
تو یہ مت کہہ کہ ہم کو اس بادشاہ سے کوئی تعلق نہیں ہے وہاں تک پہنچنا ہی دشوار ہے
یہ غلط ہے کیونکہ وہ کریم ہے اور کرم کرنے والے کے لئے کوئی کام مشکل نہیں۔
یعنی ان کو کچھ مشکل نہیں تم کو مشکل نظر آتا ہے تم ذرا اس طرف متوجہ ہو کر تو دیکھو وہ خود
تم کو اپنے قریب کر لیں گے وہ دنیا کے محبوبوں کی طرح نہیں ہیں کہ عشاق مرجاتے ہیں اور وہ
خسرے کرتے ہیں یہ ہے غرض اس مسئلہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خوب نظر بازی کریں مرے اڑائیں
اور سمجھیں کہ ہم صوفی ہیں ہم کو سب حلال ہے اور یہ فعل ہمارا قرب کا راستہ ہے استغفر اللہ
قرب سے اس کو کیا واسطہ یہ تو بہت بعید کرنے والا ہے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ
یہ گناہ اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے۔ چنانچہ حدیث شریف ہے انا غور اللہ اعلم
ومن غیرۃ حرم الفواحش ما ظہر منہا وما لطن (میں بہت غیرت مند ہوں اور اللہ تعالیٰ ہم سے
نزیادہ غیرت مند ہے اور اسی غیرت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بے شرمی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے چاہے
اس کی برائی کھلی ہو یا اندرونی برائی ہو) اور یہ سب فواحش ہیں۔ آنکھ سے دیکھنا ہاتھ سے
پکڑنا پاؤں سے چلنا کیونکہ ان سب کو شارع نے زنا ٹھہرایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں البینا
تزنیان وزناهما النظر والاذنان تزنیان وزناهما الاستماع واللسان یزنی وزناہ
النطق والیہ ان تزنیان وزناهما البطش الحدیث۔ یعنی کہ آنکھیں زنا کرتی ہیں اور
ان کا زنا دیکھنا ہے اور کان زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا سنا ہے اور زبان بھی زنا
کرتی ہے اور اس کا زنا بولنا ہے۔ (یعنی کسی عورت ولڑکے سے شہوت کی راہ سے
باتیں کرنا) اور ہاتھ بھی زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا (غیر محرم) کو پکڑنا ہے اور جب یہ
فواحش ہیں اور فواحش پر غیرت حق اور پر معلوم ہو چکی ہے تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو
یہ افعال نہایت ناپسند ہیں اور افسوس ہے کہ بعض پیر بھی اس میں مبتلا ہوتے ہیں

کہ عورتیں ان سے پردہ نہیں کرتیں اور کہتی ہیں کہ یہ تو بجائے باپ کے بلکہ باپ سے بھی زیادہ ہیں اور بے حیا نسبتے محابا سامنے آتی ہیں اور بڑے بے حیا و دیوث وہ مرد ہیں جو ایسے پیروں کے سامنے اپنی بیٹیوں بہوؤں کو آنے دیں بعض جگہ تو ایسا سا گیا ہے کہ مرید نیاں تنہا مکان میں جاتی ہیں اور وہاں مرید ہوتی ہیں نعوذ باللہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہوگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتیں پردہ کرتی تھیں ساری امت کی عورتیں آپ کی روحانی بیٹیاں ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود معصوم کسی قسم کے وسوسہ کا بھی شائبہ نہیں لیکن باوجود اس کے پھر پردہ کا حکم تھا اور ازواجِ مطہرات تمام امت کے مردوں عورتوں کی مائیں تھیں چنانچہ ارشاد ہے وازواجہ امہاتھن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں تمام مسلمانوں کی مائیں ہیں، اور کسی کو ان کی نسبت توبہ توبہ وسوسہ تک کبھی شرکا نہ تھا لیکن باوجود اس کے ارشاد ہے وقرن فی بیوتکن یعنی اپنے گھروں میں جی رہو باہر نہ نکلو۔ اور فرماتے ہیں ولا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض یعنی نرم بات مت کرو کہ جس کے قلب میں روگ ہے وہ طمع کرے گا چنانچہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جیسے مردوں کے لئے خوش اخلاقی صفت حمیدہ ہے عورتوں میں بد اخلاقی صفت حمیدہ ہے یعنی غیر مردوں سے نرمی اور میٹھی میٹھی باتیں نہ کریں اور نہ تند مزاجی سے بلکہ ایسے انداز سے بات کریں کہ اس کو مضمون مفہوم ہو جائے اور کسی قسم کی طمع اس کے قلب میں نہ آوے نہایت خشکی و صفائی سے بات کریں۔ البتہ اپنے ظاہر و دوسری عورتوں کے ساتھ خوش اخلاقی برتیں۔ اللہ اکبر یہ خاندان نبوت کا انتظام ہے آج کون ہے وہ شخص کہ اُن سے زیادہ اپنے کو مقبول کہے بلکہ یہ وقت چونکہ فتنہ کا ہے اس لئے نہایت سخت انتظام کی ضرورت ہے۔ ایک بزرگ تھے وہ اس میں احتیاط نہ کرتے تھے اس لئے کہ بوڑھے بہت تھے غیروالی الاربع میں داخل ہو گئے تھے اس لئے ان کو عورتوں سے زیادہ اجتناب نہ تھا ایک دوسرے بزرگ نے ان کو نصیحت کی انھوں نے نہ مانا اُن بے احتیاط بزرگ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا یہ مسئلہ پوچھا فرمایا کہ اگر مرد جنید ہو اور عورت رابعہ بصریہ ہو اور وہ دونوں ایک جگہ تنہا ہوں تو ثالث اُن کا شیطان ہوگا۔ اور آدمی خواہ کسی قدر بوڑھا ہو جائے لیکن مادہ تو اس کے

اندر باقی رہتا ہے۔ وہ فرشتہ تو ہے نہیں ہاں یہ اور بات ہے کہ کچھ نہ کر سکے لیکن نظر سے تو محفوظ نہیں رہ سکتا اور کیسے محفوظ رہ سکتا ہے مرد کے اندر تو عورت کی طرف میلانِ خلق پیدا کیا ہے کوئی اُس فطری جوش کو کیسے زد کر سکتا ہے۔ گنج مراد آباد میں ایک بزرگ تھے جناب مولانا فضل الرحمن صاحب تقریباً ایک سو دس برس کی ان کی عمر ہوئی۔ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جاڑے کا موسم تھا صبح کو اٹھ کر خادم کو آواز دی ارے فلا نے مجھ کو کچھ شہ سا ہو گیا ہے جی چاہتا ہے کہ نہالوں طبیعت صاف ہو جائے گی چنانچہ خادم نے پانی رکھ دیا اُسی جاڑے میں غسل فرمایا۔ بتلائے اگر کچھ نہ رہا تھا تو شہہ کیسا۔ ایک مرتبہ کانپور میں ہمارے گھر بہت عورتیں آئیں اس میں اختلاف تھا کہ حضرت مولانا صاحب موصوفہ سے پردہ چاہتے یا نہیں میں نے یہ اختلاف سن کر یہ حکایت ان کو سنائی اور کہا کہ اب تم خود فیصلہ کر لو کہ پردہ ضروری ہے یا نہیں، سب سُن کر چُپ ہو رہے ہیں حضرت جب سو برس کی عمر میں یہ قصہ ہو سکتا ہے تو بچا سو برس کی عمر میں اب کیا مشکل ہے اور بہت سے پیر جو ان بھی ہوتے ہیں اور آجکل تو پیر بنتا کچھ بھی مشکل نہیں ہے لمبے لمبے بال ہوں، موٹے موٹے دانوں کی تسبیح ہو رنگا کرتا ہو لبس پیر ہو گئے پھر وہ خواہ عورتوں کو گھوڑیں، لونڈوں کو تکیں، حرام حلال میں کچھ امتیاز نہ کریں ان کی پیری ایسی مضبوط ہے کہ وہ کہیں سے نہیں جاتی بلکہ جس قدر کوئی خلاف شرع ہو گا اسی قدر زیادہ مقبول ہے۔ اور جس قدر حدودِ شرعیہ کے اندر ہو گا وہ پیری سے دور ہے وہ تو بُرا ملا ہے۔ یہ تو مردوں کی حالت تھی اب عورتوں کی کیفیت سُنئے بعض عورتوں ایسی بے حیا ہوتی ہیں کہ وہ خود مردوں کو دیکھتی ہیں یا پردہ وغیرہ اٹھا دیتی ہیں کہ دوسرا مرد ان کو دیکھ لیتا ہے اور احتیاط نہیں کرتیں۔ حدیث میں لعن اللہ الناظر والمنظر الیہ (اللہ تعالیٰ دیکھنے والے اور دکھانے والے پر لعنت کرے) اس کے متعلق جو یوں عورتوں سے کہا جاتا ہے نصیحت کی جاتی ہیں تو کہتی ہیں کہ انھیں ایک دفعہ دیکھ کر پھر کیا دیکھے گا ساری

عمر ترسے گا۔ جو بڑی پردہ نشین کہلاتی ہیں اُن کی یہ حالت ہے کہ خاوند کے سامنے تو بھنگن ہی بنی رہیں گی اور اگر کہیں جاویں گی تو تمام زیب و زینت حشم کر کے بیگم بن کر جاویں گی سخت بے حیائی کی بات ہے کہ خاوند جس کے لئے زیب و زینت کا حکم ہے اس کے سامنے تو زینت نہ کی جاوے اور دوسروں کے دیکھنے کے لئے کی جاوے۔ چاہئے تو یہ کہ اس کا برعکس ہو بعض عورتیں دوٹھا دولہن اور بارات کو دیکھتی ہیں اور ان کے مرد بھی کچھ نہیں کہتے۔ اسی طرح دوسری بے احتیاطی قابل نظر ہے وہ یہ کہ بعض مرد بٹے بے احتیاط ہوتے ہیں کہ گھر میں پکار کر نہیں جاتے ذرا کھنکارا اور فوراً اندر گھس گئے اور اکثر عورتیں بھی ایسی بے احتیاط ہوتی ہیں کہ ڈولی سے اترنے سے پہلے تحقیق نہیں کرتیں کہ کوئی مرد تو اندر نہیں ہے۔ میں ایک دفعہ بیمار تھا بہت عورتیں ڈولی سے عیادت کے لئے آئیں اور بلا تحقیق اندر آ گئیں، میں نے ان کو خوب بُرا بھلا کہا اور جب عورتیں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں اس وقت اور زیادہ بے حیائی ہوتی ہے چنانچہ بسا اوقات بے کہے اس گھر کے مرد دروازے میں آکر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اندر کسی نے منہ پھیر لیا کسی نے آنچل سے منہ ڈھک لیا، کوئی کسی کے پیچھے ہو گئی اور طرفہ یہ کہ ہر ایک یہ جانتی ہے کہ مجھ کو نہیں دیکھا حالانکہ اس نے سب کو دیکھ لیا۔ خلاصہ یہ کہ آنکھوں کا گناہ سخت ہے اور اس میں بہت ابتلا ہو رہا ہے اس کا بہت انتظام کرنا چاہیے اپنا بھی اور گھر والوں کا بھی اور اس کا علاج سہل یہ ہے کہ راہ میں چلنے کے وقت نیچی نگاہ کر کے چلنا چاہیے۔ ادھر ادھر دیکھے انشاء اللہ تعالیٰ محفوظ رہے گا شیطان جب مردود ہوا تو اس نے کہا تھا لا تعدن لہم صراطک المستقیم ثم لا یتھم من بین یدہم ومن خلفہم وعن ایمانہم وعن شما علیہم یعنی میں ان کے (گمراہ کرنے کے) لئے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا پھر ان کے پاس آؤں گا ان کے سامنے سے اور پیچھے سے اور داہنے سے اور بائیں سے چار سمتیں تو اس نے بتلائیں اور دو سمتیں باقی رہیں اوپر اور نیچے۔ بزرگان دین نے اس میں ایک لطیف لکھا ہے کہ اوپر نیچے کا ذکر اس لئے نہیں کیا

کہ اکثر گناہ چار سمتوں سے ہوتے ہیں پس بچنے کی دو صورتیں رہیں یا تو اوپر دیکھ کر چلو یا نیچے دیکھ کر۔ مگر اوپر دیکھنے میں تو گر جانے کا آنکھ میں کچھ پڑ جانے کا اندیشہ ہے اس لئے نجات کے لئے یہی شق متعین ہوئی کہ نیچے دیکھ کر چلیں۔

قال اللہ تعالیٰ وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا (اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ کے نیک بندے نیچی نظر کر کے چلتے ہیں) ایک بزرگ تھے وہ بات کرنے کے وقت مردوں کو بھی نہ دیکھتے تھے۔ اُن سے کسی نے اس کی وجہ پوچھی فرمایا دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن کو میں پہچانتا ہوں اور دوسرے وہ جن کو میں نہیں پہچانتا جن کو پہچانتا ہوں ان کو بلا دیکھے بھی آواز سے پہچان لیتا ہوں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے اور جن کو نہیں پہچانتا ان کے دیکھنے سے کیا فائدہ ہے۔ سبحان اللہ من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یغنیہ (کسی شخص کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ بے فائدہ باتوں یا کاموں کو بالکل چھوڑنے پر عمل اس کو کہتے ہیں بعض بزرگوں نے اس نظر کے گناہ سے بچنے کے واسطے جھگل میں رہنا اختیار کر لیا ہے۔ شیخ شیرازی فرماتے ہیں سہ

بزرگے دیدم اندر کو ہماے قناعت کرد از دنیا بغارے
چراغ غم بشہر اندر نیائی کہ بارے بندے از دل بر کشائی
بگفت آنجا پیری رویان لغزند چو گل بسیار شد سپلاں بلغزند
میں نے ایک پہاڑ میں ایک بزرگ کو دیکھا جو ایک کوہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ شہر کے اندر کیوں نہیں آتے کہ کبھی دل تو پر سے بوجھ ہلکا ہوتا۔ ان بزرگ نے جواب دیا کہ اس جگہ پری جیسے چہرہ والے پھسل رہے ہیں اور جب مٹی زیادہ ہو جاتی ہے تو ہاتھی بھی پھسل جاتے ہیں۔

ایک بزرگ طواف کر رہے تھے اور ایک چشم تھے اور کہتے جاتے تھے
اللھم انی اعوذ بک من غضبک (اے اللہ میں آپ سے آپ کے غضب کی

پناہ چاہتا ہوں کسی نے پوچھا کہ اس قدر کیوں ڈرتے ہو کیا بات ہے کہا میں نے ایک لڑکے کو بُری نظر سے دیکھ لیا تھا غیب سے چپٹ لگا اور آنکھ مپھوٹ گئی اس لئے ڈرتا ہوں کہ پھر عود نہ ہو جاوے۔

حضرت جنیدؒ چلے جا رہے تھے ایک حسین لڑکا نصرانی کا سامنے سے آرہا تھا۔ ایک مرید نے پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ ایسی صورت کو بھی دوزخ میں ڈالیں گے حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ تو نے اس کو نظر استحسان سے دیکھا ہے عقرب اس کا مزہ تم کو معلوم ہوگا چنانچہ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ شخص قرآن بھول گیا نعوذ باللہ بعضے سمجھ بزرگ من پسند ہوئے ہیں بعض کو اس سے دھوکہ ہو گیا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ حن پرست تھے تو ہم اگر ایسا کریں تو کیا مضائقہ ہے۔ سبحان اللہ کیا استدلال ہے بات یہ ہے ۵

کارپا کاں راقیاس از خودیگر

گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

اچھے لوگوں کے کاموں کو اپنے اوپر قیاس مت کر اگرچہ

لکھنے میں شیر اور شیر دودھ ایک جیسے ہیں ۶

میں ان کی حسن پرستی کی حقیقت بتلاتا ہوں کہ وہ اس معنی کے حسن پرست نہ تھے جیسے کہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ اُن کو ہر حسین شے اچھی معلوم ہوتی تھی اور ہر بُری بے وقاعدہ شے سے اس قدر نفرت تھی کہ ان کو بد صورت اور بے ڈھنگی شے دیکھنے سے تکلیف ہوتی تھی چنانچہ حضرت مرزا صاحب کو جب کہیں جانا ہوتا تھا تو پاکی میں بیٹھ کر جاتے تھے اور پاکی کے پٹ بند کر دیا کرتے تھے کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ پٹ کیوں بند کر دیتے ہیں فرمایا کہ راستہ میں بازار وغیرہ ملتے ہیں اس میں بعض دوکانیں بے قاعدہ بنی ہوئی ہوتی ہیں مجھ کو دیکھ کر سخت تکلیف ہوتی ہے۔ تمہارے بھون کے قاضی صاحب

مع اپنے ایک ہمراہی کے مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اس ہمراہی کو تاک صاف کرنے کی ضرورت ہوئی تو مرزا صاحب کی نظر پیچھے سے اس کے پائنجامے پر پڑ گئی سب چھینٹیں پائنجامے کے پیچھے تھیں۔ مرزا صاحب کے سر میں درد ہو گیا اور فرمایا کہ قاضی صاحب اس شخص کے ساتھ آپ کا کیسے گذر ہوتا ہوگا۔

اکبر بادشاہ ثانی جو کہ بادشاہ وقت تھا ایک مرتبہ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا بادشاہ کو پیاس لگی کوئی خادم اس وقت موجود نہ تھا خود اٹھ کر پانی پیا اور پانی پی کر صراحی پر کٹورا ٹیڑھا رکھ دیا مرزا صاحب کے سر میں درد ہو گیا اور طبیعت پریشان ہو گئی لیکن ضبط فرمایا چلتے وقت بادشاہ نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے یہاں کوئی آدمی خدمت کے لئے نہیں ہے۔ اگر ارشاد ہو تو کوئی آدمی بھیج دوں۔ اب تو مرزا صاحب سے نہ رہا گیا جھنجھلا کر فرمایا کہ پہلے تم تو آدمی بنو کٹورا ٹیڑھا رکھ دیا میری طبیعت اب تک پریشان ہے۔ ایک شخص نے مرزا صاحب کی خدمت میں انگور بھیجے بہت نفیس اور وہ منتظر داد کے ہوئے مگر مرزا صاحب ساکت تھے آخر اس نے خود پوچھا کہ حضرت انگور کیسے تھے۔ فرمایا کہ مردوں کی بو آتی تھی تحقیق سے معلوم ہوا کہ قبرستان میں انگور بوئے گئے تھے وہ انگور وہاں سے آئے تھے۔ مرزا صاحب کے اندر حسن پسندی تھی تو وہ طبعی تھی طبیعت کی ساخت ہی ایسی واقع ہوئی تھی کہ ہر اچھی شے پسند فرماتے تھے۔ ان کے نفس میں بڑے خیال کا شائبہ بھی نہ تھا اور دلیل اس کی یہ ہے کہ بچپن میں بھی بد صورت کی گود میں نہ جاتے تھے بھلا اس وقت کیا احتمال ہو سکتا ہے۔ خواجہ میر دردؒ کی نسبت لوگوں نے آکر مرزا صاحب سے عرض کیا کہ خواجہ صاحب راگ سنتے ہیں۔ فرمایا کہ بھائی وہ کن رس میں مبتلا ہیں میں آنکھ رس میں یعنی ان کو کانوں کا مرض ہے مجھ کو آنکھوں کا آپ نے اس کو بھی مرض سے تعبیر فرمایا ایک بزرگ کی کیفیت یہ تھی کہ حسین لڑکے ان کی خدمت کرتے تھے

اور گاہ گاہ ان کو پیار بھی کرتے تھے۔ ایک روز ان کے ایک مرید نے بھی ایک لڑکے کو پیار کر لیا پیر سمجھ گئے کہ اس نے میرا اتباع کیا ہے ایک روز بازار میں گئے لوہار کی دوکان پر دیکھا کہ لوہا سرخ انگارہ سا ہو رہا ہے پیر صاحب نے فوراً جا کر اس کو پیار کر لیا اور اس مرید سے فرمایا کہ آئیے تشریف لائیے اس کو بھی پیار کیجئے پھر تو یہ گھبرائے اس وقت انھوں نے ان کو ڈانٹا کہ خبردار ہم پر اپنے کو مت قیاس کرو ایک بزرگ کو دیکھا گیا کہ ایک حسین لڑکے سے پاؤں دبو رہے ہیں ایک شخص کو وسوسہ ہوا کہ یہ کیسے شیخ ہیں لڑکے سے پاؤں دبو اتے ہیں فرمایا کہ آگ کی انگیٹھی اٹھا لاؤ دہکتی آگ میں پاؤں رکھ دیجئے اور یہ فرمایا کہ ہم کو کچھ حس نہیں ہمارے نزدیک یہ آگ اور یہ لڑکا برا بر ہے۔ لیکن یاد رکھو ایسے بزرگوں سے جن کا ظاہر خلاف شرع نظر آوے بیعت ہونا جائز نہیں محققین کی یہ شان نہیں ہے جو لوگ مندر ارشاد پر متمکن ہوتے ہیں اور العلماء و رشتہ الانبیاء کے خطاب سے مشرف ہیں وہ بالکل متبع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہیں ان کی ہر وضع سنت کے موافق ہوتی ہے اور تہمت اور بدگمانی کے موقع سے بچنا بھی سنت ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس باب میں یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو کہ ازواجِ مطہرات میں ہیں وہاں تشریف لائیں۔ واپسی کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پہنچانے کے لئے ان کے ساتھ دروازے تک کہ وہ مسجد ہی کی طرف تھا تشریف لائے سامنے دیکھا کہ دو شخص آ رہے ہیں فرمایا کہ علی سلکنا یعنی اپنی جگہ ٹھہر جاؤ یہاں پر وہ ہے۔ اور اس کے بعد فرمایا یا ایہا صفیۃ یعنی یہ عورت صفیہ تھی اور کوئی اجنبیہ نہ تھی فکبر علیہما ذالک یعنی یہ بات ان دونوں پر بہت بھاری ہوئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ پر ایسا گمان ہو سکتا ہے، فرمایا شیطان ابن آدم کے اندر بجائے خون کے دوڑتا ہے مجھے خیال ہوا کہ کبھی وہ تمہارے ایمان کو نہ تباہ کر دے۔ پس جو لوگ ارشاد کی شان

لئے ہوئے ہیں وہ تو ایہام سے بھی بچتے ہیں ایسے حضرات قابلِ بیعت ہیں باقی جن کا ظاہر شریعت کے موافق نہ ہو ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ مکار ہیں باطن بھی ان کا موافق نہیں ہے وہ مردود ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ باطن ان کا بالکل شریعت کے موافق ہوتا ہے لیکن ظاہر ان کا ہماری سمجھ میں نہیں رہتا ان پر اعتراض نہ کرے اور نہ ان کا اتباع کرے غرض مرشد ایسے کو بنا دے جو ظاہر آباطناً پاک صاف ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی کے پاس کوئی دلیل اور سہارا بدنگاہی کے متعلق نہیں بدنگاہی ہر پہلو سے حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ آگے فرماتے ہیں وما تخلق الصدور یعنی جس شے کو سینے میں چھپاتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں یہ پہلے سے اشد ہے یعنی معصیت صرف نگاہ ہی سے نہیں بلکہ دل سے بھی ہوتی ہے بہت لوگ دل سے سوچا کرتے ہیں اور عورتوں و مردوں کا تصور کرتے ہیں اور خیال سے مزے لیتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہم متقی ہیں خوب سمجھ لو کہ یہ سب تلبیس ابلیس یعنی ہے بلکہ بعض مرتبہ دل کے اندر سوچنے سے اور دل کے اندر باتیں کرنے سے اور زیادہ فتنہ ہوتا ہے کیونکہ نگاہ کرنے میں تو بعض مرتبہ قبیح و بد صورت ثابت ہوتا ہے اور دل کے اندر باتیں کہنے میں تو طبیعت کو زیادہ لگاؤ ہو جاتا ہے اور قلب سے کسی طرح وہ بات نہیں نکلتی بلکہ محض نگاہ نہ کرنے سے اپنے کو صاحبِ مجاہدہ سمجھ کر زیادہ مقرب سمجھتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ دل میں متمتع ہو رہا ہوں تو مجاہدہ کہاں رہا غرض اس کا انداد بھی بہت ضروری ہے اور چونکہ قلب کے اندر کانوں کے واسطے سے بھی باتیں اس قسم کی پہنچتی ہیں اس لئے جس طرح آنکھوں کی حفاظت ضروری ہے کانوں کی نگہداشت بھی ضروری ہے کہ ایسے قصے اور حکایات نہ سنے نہ ایسے مقام پر جاوے جہاں گانا بجانا ہو رہا ہو بعض مرتبہ خود قلب ہی سے معصیت صادر ہوتی ہے صدور کے وقت آنکھ کان کا واسطہ نہیں

ہوتا مثلاً پہلی دیکھی ہوئی صورتیں یاد آتی ہیں اور ان سے التذاذ ہوتا ہے اور معصیت قلب کا معصیت عین سے اشد ہونا ایک اور درجہ سے بھی ہے وہ یہ کہ قلب سے سوچنے اور آنکھوں سے دیکھنے میں ایک فرق بھی ہے یعنی آنکھوں کے گناہ میں تو نفس فعل کو کوئی دیکھ بھی سکتا ہے گو نیت پر مطلع نہ ہو اور دل کے اندر سوچنے کے فعل کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا اس کی اطلاع مولیٰ اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں اس سے وہی بچے گا جس کے قلب میں تقویٰ ہو۔ اس کے بعد سمجھنا چاہئے کہ اس مرض کے ازالہ میں تین درجہ ہیں قلب کو باوجود تقاضے کے روکنا تقاضے کو ضعیف کر دینا اور قلع المقتضیٰ یعنی مادہ ہی کا قلع قمع کر دینا ان میں سے قلب کو روکنا یعنی دل کو خود اُس طرف متوجہ نہ ہونے دینا یہ امر تو اختیاری ہے کہ اگر آپ سے آپ جائے تو تم اُس کو روکو اور اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ جب قلب کسی حسین کی طرف مائل ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً کسی کریم المنظر بد شکل بد صورت بد ہیئت کی طرف دیکھو اگر کوئی موجود نہ ہو کسی ایسے بد صورت کا خیال باندھو کہ ایک شخص ہے کالا رنگ ہے چیچک کے داغ ہیں آنکھوں سے اندھا ہے سر سے گنجا ہے رال بہ رہی ہے دانت آگے کو نکلے ہوئے ہیں ناک سے نکلتا ہے ہونٹ بڑے بڑے ہیں۔ سینک بہ رہا ہے اور مکھیاں اس پر بیٹھی ہیں گو ایسا شخص دیکھا نہ ہو مگر قوت متخیلہ سے تراش لو کیونکہ تمہارے دماغ میں ایک قوت متخیلہ ہے آخر اس سے کسی روز کام تو لو گے متخیلہ کا کام تو جوڑ کا ہے جب ایسا شخص فرض کیا جاسکتا ہے اس کا مراقبہ کرو انشاء اللہ تعالیٰ وہ فساد جو حسین کے دیکھنے سے قلب میں ہوا ہے وہ جاتا رہے گا اور اگر بھر خیال آوے بھر بھی تصور کرو اور اگر یہ مراقبہ کثافت کے درجہ میں نافع نہ ہو اور بار بار بھر اسی حسین کا تصور تادے تو یوں خیال کرو کہ یہ محبوب ایک روز مرے گا اور قبر میں جاوے گا وہاں اس کا نازک بدن سڑ گل جاوے گا کیڑے اس کو کھالیں گے یہ خیال تو فوری علاج ہے اور آئندہ کے لئے تقاضا پیدا ہونے کا علاج یہ ہے کہ ذکر اللہ کی کثرت کرو دوسرے یہ کہ عذاب الہی کا تصور

کرو تیسرے یہ کہ یہ تصور کر دو کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور اس کو مجھ پر پوری قدرت ہے طول مراقبات اور کثرت مجاہدات سے یہ چور دل میں سے نکلے گا۔ جلدی نہ جاوے گا جلدی نہ کرے اس لئے کہ ایسا پرانا مرض ایک دن یا ایک ہفتہ میں نہیں جاتا یہاں مجھ کو شاہ محمود غزنوی کی حکایت یاد آگئی محمود نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو ایک ہمراہی سپاہی نے ایک مندر میں جا کر دیکھا کہ ایک بوڑھا برہمن پوجا پاٹ کر رہا ہے۔ سپاہی نے تلوار دکھائی کہ کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو ورنہ اس تلوار سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ برہمن نے کہا کہ حضور در ٹھہر سپاہی نے پھر تقاضا کیا برہمن نے عرض کی حضور نوے برس کا رام تو دل میں سے نکلتے ہی نکلتے نکلے گا ذرا سی دیر میں کیسے نکل جاوے خوب کہا ہے۔

صوفی نہ شود صفائی تا در نکشد جامی بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے
صوفی کے دل کی صفائی اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ جامی دروازہ نہ کھٹکھٹائے بہت سے سفر کرنے چاہئے تاکہ کچا پن جاتا رہے اور پکا صوفی بن جائے۔

ہمت مت ہارو مجاہدہ کرتے رہو رفتہ رفتہ یہ تقاضا ضعیف ہو جاوے گا اور قابو میں آجاوے گا کہ اپنے محل پر صرف ہوگا اور غیر محل کے لئے متحرک نہ ہوگا اور یہی مطلوب ہے۔ تیسرا درجہ یہ کہ مادہ بھی منقطع ہو جاوے یعنی بالکل میلان ہی کبھی پیدا نہ ہو یہ وہ مرتبہ ہے کہ جس کو نادان سالک مطلوب سمجھتے ہیں اور اس حاصل نہ ہونے پر پریشان ہوتے ہیں یعنی جب اپنے اندر کسی وقت ایسا میلان پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا سب ذکر مشغل و مجاہدہ ضائع گیلے کہ ایسے کلمات پریشانی میں ان کے منہ سے نکل جاتے ہیں کہ بے ادبی اور گستاخی ہو جاتی ہے مثلاً ہم اتنے زور سے طلب حق میں رہے مگر ہم پرچم نہیں آتا کہ ویسے ہی محروم ہیں یاد رکھو کہ یہ شیطان دوسرے ہے یہ ہرگز مطلوب نہیں کہ مادہ منقطع ہو جاوے اور اگر مادہ جاتا رہے تو گناہ سے بچنے میں کوئی کمال نہیں۔ اندھا اگر فخر کرے کہ میں دیکھتا نہیں کون فخر کی بات ہے، دیکھے گا کیا دیکھنے کا آلہ نہیں عین اگر عفت کا دعویٰ کرے تو کیا کمال ہے لطف اور کمال مطلوب تو یہ ہے گناہ کر سکو اور پھر اپنے دل کو روک جوں کا میں نے فوری علاج اور تقاضا روکنے کی تدبیر دونوں بیان کر دیے رہاؤ

زائل کر دینا یہ مطلوب ہی نہیں بلکہ اس کا زائل کرنا جائز ہی نہیں خلاصہ یہ کہ مجھے اس گناہ پر متنبہ کرنا منظور ہے اس لئے کہ اس گناہ کا ابتلا عام تھا جسے کہ جو نیک کہلاتے ہیں وہ بھی اس میں مبتلا ہیں خدا کے واسطے اس کا انجظام کرنا چاہیے افسوس منہ سے تو حق تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ اور غیر پر نظر افسوس صد افسوس اس وقت مجھ کو ایک حکایت یاد آئی کہ ایک عورت جا رہی تھی کوئی ہوا پرست اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا اس عورت نے پوچھا تم کون ہو اور میرے پیچھے کیوں آتے ہو کہا کہ میں تجھ پر عاشق ہو گیا اس لئے آتا ہوں عورت نے جواب دیا کہ پیچھے ایک میری بہن آرہی ہے وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے اس کے دیکھنے کو پیچھے چلا اس عورت نے اس کے ایک دھول دی اور کہا

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی در بیان دعویٰ خود صادق
پس چرا بر غیر افگندی نظر
کہا کہ اے بے وقوف اگر تو سچا عاشق ہے اور اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو پھر کیوں غیر پر نظر ڈالتا ہے اے بے خبر کیا اسے ہی عشق کا دعویٰ کہتے ہیں۔

صاحبو اگر حق تعالیٰ سامنے کھڑا کر کے اتنا دریافت فرمائیں کہ تو نے ہم کو چھوڑ کر غیر پر کیوں نظر کی تو بتلائیے کیا جواب ہے۔ یہ ہلکی بات نہیں اس کا بہت بڑا اہتمام کرنا چاہیے ایک اور تدبیر ہے جو مقوی ہے ان تدابیر کی وہ یہ کہ جب قلب میں ایسا خیال پیدا ہو تو ایسا کر دکھ و ضو کر کے دور کعت پڑھو اور توبہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو جب نگاہ بڑے یا دل میں تقاضا پیدا ہو فوراً ایسا ہی کرو ایک دن تو بہت سی رکعتیں پڑھنا پڑیں گی دوسرے دن بہت کم ایسا خیال آوے گا اسی طرح بتدریج نکل جاوے گا۔ اس لئے کہ نفس کو نماز بڑی گراں ہے۔ جب دیکھے گا کہ ذرا سامرہ لینے پر یہ مصیبت ہوتی ہے یہ ہر وقت نماز ہی میں رہتا ہے پھر ایسے وسوسے نہ آویں گے اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو سب آفات سے محفوظ رکھیں۔

آمین ثم آمین

تہمت سے بالآخر

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً
(رسالة البخاری)

دعواتِ عبدیت جلد دوم

کا

نوال^۹ وعظ ملقب بہ

تطہیرُ الاعضاء

—————: منجملہ ارشادات: —————

حکیمُ الامۃ مجددُ الملتہ حضرت مولانا محمد اشرف علی صانحانوی مدظلہ

————— (ناشر) —————

محمد عبد المنان^{عَفَرُ}

مکتبۂ تھانوی - دفتر الابکار

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔ ایچ۔ جناح روڈ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعواتِ عبدیت جلد دوم

کا

نواں وعظ ملقب بہ

تطہیر الاعضاء

این	مئے	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	ساعتین کی تعداد	متفرقات
جامع مسجد بن ۲۰ سوال	۲۰ سوال	ایک گھنٹہ	بیٹھ کر	حفظ قلب و جوارح	مولوی عبدالرشید صاحب مدرسہ امداد العلوم	تقریباً ۱۵۰	.

الحمد لله محمدًا ونسعينه وتستغفرون وتؤمن به وتتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له ونشهد أن لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا ومولانا محمداً عبداً ورسولاً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وصحبه وسلم. أما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم. قال الله تعالى وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوكًا ترجمہ آیت کریمہ کا یہ ہے) مت اتباع کر اس شے کی جس کی تجھ کو تحقیق نہیں بیشک کان اور آنکھ اور قلب ان میں سے ہر ایک سے سوال کیا جائے گا اس آیت کے سیاق و سباق میں بعض ضروری نصائح و مواعظ مفیدہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمائے ہیں اور سب کے آخر میں بطور امتنان کے فرمایا ہے ذَٰلِكَ وَمِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب مذکورہ نصائح اُن حکمت کی باتوں سے ہیں کہ تمہارے رب نے تمہاری

طرف وحی فرمائی ہے۔ اس امتنان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام نصائح جو یہاں مذکور ہیں نہایت اہتمام کے قابل ہیں منجملہ ان کے یہ آیت ہے اس آیت میں چار چیزوں کی حفاظت کا حکم فرمایا ہے قلب، آنکھ، کان یہ تین چیزیں تو بالتصریح بیان فرمائیں چوتھی چیز بقیہ جوارح یعنی ہاتھ پاؤں زبان وغیرہ کی حفاظت ہے وہ بالتصریح اس آیت میں مذکور نہیں ہیں بلکہ ان چیزوں کی حفاظت کو ولا تقف مالیس لك به علم میں دلالت ذکر فرمایا ہے چنانچہ ولا تقف مالیس لك به علم کی حقیقت میں بلا تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں تمام جوارح کی حفاظت بھی آگئی ہے اس لئے کہ اس کی حقیقت ہے بلا تحقیق کسی امر کا اتباع کرنا اب اس کی تحقیق کی چند صورتیں ہیں مثلاً کوئی شے گم ہو جائے بلا تحقیق قرائن موہومہ بر کسی کو چور کہہ دیا چور کہتا زبان کا گناہ ہے ولا تقف مالیس لك به علم اس گناہ سے روکتا ہے دیکھئے ولا تقف مالیس لك به علم پر عمل نہ ہونے سے زبان کا گناہ ہو گیا ایک عجیب حکایت یاد آئی۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھا اس سے فرمایا کہ تو چوری کرتا ہے اس نے کہا لا واللہ الذی لا الہ الا هو یعنی ہرگز نہیں قسم ہے اس ذات کی کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا صدقت ربی وکذبت عینتی یعنی میں اپنے رب کی تصدیق اور اپنی آنکھ کی تکذیب کرتا ہوں یعنی میری آنکھ نے غلط دیکھا تو سچا ہے شاید کوئی خشک مغز اس کو غلو فی الدین سمجھے یا کوئی یوں کہے کہ یہ تو استغراق یا غلبہ حال ہے سو یاد رکھو کہ انبیاء علیہم السلام میں نہ غلو فی الدین ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے اور وہ مغلوب الحال بھی نہیں ہوتے بلکہ اپنے حال پر غالب ہوتے ہیں بزرگوں کی دو قسمیں ہیں ابو الحال وابن الحال ابو الحال وہ ہیں جو اپنے حال پر غالب ہوتے مخلوق سے بے جلع رہتے ہیں اسباب ظاہرہ کو چھوڑتے نہیں ہر امر کو ضابطہ اور قاعدہ سے کرتے ہیں مال کو انتظام سے خرچ کرتے ہیں ان امور میں جیسے اور عوام کی حالت ہوتی ہے ایسی ہی ان کی بھی ہوتی

ہے اور ابنِ کمال آزاد ہوتے ہیں خلقت سے بھاگتے ہیں کسی امر کی تدبیر نہیں کرتے موحی بندے ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں کرتے ہیں ہاں خلافِ شریعت کچھ نہیں کرتے اس لئے کہ جو خلافِ شریعت کرے گا وہ مقبول و بزرگ نہیں ہو سکتا البتہ اس کا قول و فعل کبھی بظاہر خلافِ شریعت ہوتا ہے جس کی تاویل ضروری ہے۔ اکثر عوام الناس ایسے لوگوں کو باکمال سمجھتے ہیں اور اہل کمال کو کم پہچانتے ہیں اس لئے میں اہل کمال اور غیر اہل کمال کی شناخت کے لئے ایک قاعدہ کلیہ بھی بتا دیتا ہوں کہ وہ نہایت مفید ہے وہ یہ ہے کہ ولایتِ نبوۃ سے مستفاد ہے جس بزرگ کی حالت انبیاء علیہم السلام کے ساتھ زیادہ مشابہ ہوگی وہ باکمال ہوگا سو انبیاء نے نہ کبھی نعرے مارے نہ کبھی کپڑے پھاڑے نہ خلقت سے بھاگے خصوصاً ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہر امر کا انتظام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں تھا۔ سلطنت کا انتظام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا کہ سلاطین دنیا نے آپ سے سیکھا خانہ داری کا انتظام ایسا تھا کہ آج کوئی اس کی نظیر نہیں دکھلا سکتا۔ اسی طرح ملنے جلنے کھانے پینے حتیٰ کہ بول و براز کے قواعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو تعلیم فرمائے۔ اہل کمال کی حالت اسی طرز کی ہوتی ہے اور جس طرح آج کل عوام ایسے اہل کمال کو بزرگ و خدائیدہ نہیں جانتے اس وقت بھی عام لوگوں نے انبیاء کو کامل نہیں سمجھا چنانچہ کہا کرتے تھے مَا لِهَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونُ مَعَهُ نَزِيدًا أَوْ يُلْقَى إِلَيْهِ كَنزًا وَتَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا لَيَحْزَنَ وَيَصْطَبِحُ تَوَّابًا اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہوا کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ان کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا کہ ان کے ساتھ رہ کر لوگوں کو تبلیغ کرتا ان کے پاس کوئی خزانہ ہوتا یہ ہم سے بھی زیادہ غریب مفلس ہیں ہم دو وقت کھانا کھاتے ہیں ان کو ایک وقت بھی کئی کئی دن میں ملتا ہے اچھے اللہ کے پیارے ہیں کوئی اپنے پیارے کو بھوکا بھی مارا کرتا ہے یا

ان کے پاس کوئی باغ ہوتا کہ اس سے کھاتے غرض کوئی وصف ایسا ہو تا جو ہم میں نہیں یہ کیسے بنی ہیں جو ہم سے ممتاز نہیں ہیں اسی طرح جو اولیاء اللہ اس شان کے ہوتے ہیں اُن پر لوگ اعتراض کرتے ہیں اور جو خلقت سے بھاگتا ہے کھاتا پیتا نہیں تنگ رہتا ہو کسی سے بات نہ کرتا ہو وہ بزرگ ہے اور اگر خلاف عادت کوئی امر اس سے صادر ہو گیا کسی پر کوئی تصرف کر دیا اس کو تو نبی سے بڑھ کر جاتے ہیں حالانکہ تصرف کوئی چیز نہیں ہے یہ تو ریاضت سے ہندو جو گیوں میں بھی پیدا ہو جاتا ہے بلکہ اہل کمال اس کو اچھا نہیں جانتے حضرت خواجہ عبید اللہ اشراق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ عارف را ہمت بنا شد۔ یعنی عارف کو ہمت یعنی تصرف نہیں ہے ہمت کے وہ متعارف معنی نہیں کہ کسی کام کی ہمت نہیں بلکہ ہمت کے معنی تصرف وغیرہ کے ہیں مطلب یہ ہے کہ عارف کو تصرف نہیں ہوتا اور وہ اس کی یہ ہے کہ جس قدر عرفاں بڑھیکے فنا بھی ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے اور اپنے سے نظر اٹھتی جاتی ہے دیکھتے تحصیلدار اپنے اجلاس میں بیٹھ کر بڑے بڑے احکام صادر کرتا ہے۔ لیکن گورنر جنرل کے سامنے جب آتا ہے تو اس کی وہ حالت ہوتی ہے جو ادنیٰ اردلی کی ہے۔ اُسی طرح عارف کو جس قدر معرفت بڑھے گی وہ مٹتا چلا جائے گا۔ فنا سے اس کو فاعلیت مستقلہ من وجہ کے تصور سے غیرت آئے گی اور فاعلیت کجا اور معرفت سے دوسرے کی طرف توجہ تام کرنے سے غیرت آدے گی اور تصرف میں یہی ہوتا ہے کہ دوسری طرف توجہ تام کرنا پڑتا ہے اور تدبیر مسنون اس سے مستثنیٰ ہے کہ اس میں فنا علیۃ و توجہ میں استغراق نہیں ہوتا۔ عارفین میں دو باتیں ہوتی ہیں برکت اور کرامت برکت یہ ہوتی ہے ان کے وجود باوجود سے بارش ہوتی ہے بیماری دور ہوتی ہے آفات اور حوادث ٹل جاتے ہیں لیکن ان کو خبر تک نہیں ہوتی جیسے آفتاب جب نکلتا ہے تو سب کو منور کر دیتا ہے لیکن آفتاب کو کچھ خبر تک نہیں کہ میری ذات سے کس کس شے کو نفع پہنچ رہا ہے اور

دوسری شے کرامت ہے وہ بھی کبھی عارفین میں ہوتی ہے کرامت یہ ہے کہ کسی خارقِ عادت کا ان کے ذریعہ سے ظاہر ہونا کرامت میں قصد نہیں ہوتا گو علم ہو اور تصرف میں قصد کرنا اور توجہ اس طرف مبذول کرنا ضروری ہے ہاں اگر اذنِ الہی اس تصرف کا ہو تو اور بات ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امورِ نازلہ میں دعائیں بہت کی ہیں مگر یہ کہیں نہیں آیا کہ آنکھیں بند کر کے اس طرف توجہ و تصرف کیا ہو چنانچہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اللھم اعز الاسلام لعمر بن الخطاب اولعمر بن ہشام یعنی اے اللہ اسلام کو قوت دے عمر بن خطاب سے یا ابو جہل بن ہشام سے یعنی ان کو مسلمان کر دے یہ نہیں کیا کہ ان کی جانب توجہ فرمائی ہو اور تصرف کیا ہو بلکہ دعا فرمائی اگر تصرف ہوتا تو دو کا نام نہ لیتے کیونکہ تصرف میں یکسوئی لازم ہے ایک کو معین کر کے جب تک اس کی طرف کمال توجہ نہ کی جاوے کچھ نہیں ہوتا حق تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارہ میں دعا قبول فرمائی اور وہ مسلمان ہو گئے غرض یہ تو آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی دعائیں فرمائی ہیں چنانچہ احادیث ان دعاؤں سے تلو و مشحون ہیں اور یہ بہت کم منقول ہے کہ تصرف کیا ہو اسی واسطے میں نے اوپر باذنِ الہی کی شرط و قید ذکر کر دی ہے۔ اس لئے کہ تصرف بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گاہ گاہ فرمایا ہے چنانچہ آیا ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کے سینہ پر ہاتھ مارا ان کا شیعہ زائل ہو گیا۔ ایک صحابی گھوڑے پر سوار نہ ہو سکتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا وہ سوار ہونے لگے سینہ پر ہاتھ مارنا یہ قرینہ اس کا ہے کہ یہ فعل تصرف ہے اور اگر کسی کے سمجھ میں اس کی کوئی اور توجیہ آجاوے تو پھر استثناء کی حاجت نہیں ہے انبیاء علیہ السلام کے تصرف نہ فرمانے کا حکم اپنے عموم پر رہے گا۔ بہر حال اگر ثابت بھی ہو جاوے تو شاذ ہے اور شاذ پر حکم نہیں ہوا کرتا سذت وہ ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مواظبہ فرمائی ہو

مثلاً آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قبا پہنی تھی اس میں سونے کی گھنٹیاں تھیں تو یہاں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سنت ہے یہاں جواز کے لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا کیا اسی طرح یہاں بھی کہا جائے گا کہ سنت تو دعا کرتا ہے اور یہاں جواز کے لئے شاذ و نادر تصرف بھی فرمایا ہے خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں کوئی امتیاز خاص نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے اتنا بھی امتیاز نہ رکھا تھا جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس گروہ میں سردار کون ہے چنانچہ اگر کوئی آتا تو پوچھتا من محمد فیکم یعنی تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں نہ گاؤ تکیہ نہ مسند تھی حتیٰ کہ جب چلتے تھے تو اس کے لئے بھی کوئی خاص وضع مقرر نہیں فرمائی تھی کہ آگے ہی چلتے ہوں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اول اول مدینہ طیبہ تشریف لائے تو قبا میں قیام فرمایا تھا اہل مدینہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بہت کم جانتے تھے نادیدہ عاشق تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر آ رہی تھیں ہفتے گزر گئے تھے کہ ہمیشہ استقبال کو جاتے تھے لیکن ناکام آتے تھے جس روز تشریف لائے تو ایک یہودی نے جو پہاڑ پر چڑھا تھا دور سے دیکھا اور پکار کر کہا کہ یا اہل المدینہ ہذا جعد کہ یعنی تمہارا نصیب آگیا۔ چنانچہ سب آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبا میں قیام فرمایا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمراہ تھے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ڈاڑھی میں سفید بال زیادہ تھے اس لئے جو لوگ آتے تھے وہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیغمبر سمجھتے تھے جو آتا ان سے مصافحہ کرتا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ادب دیکھئے کہ انھوں نے کسی سے یہ نہیں کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کرو برابر سب سے مصافحہ کر لیتے تھے اگر کوئی کہے یہ تو بے ادبی ہے یا درکھو کہ ادب حقیقت اور اسکا

حاصل راحت رسانی ہے لوگوں نے جو ادب کے معنی گڑھے ہیں کہ جوتیاں اٹھائے دست بستہ کھڑے ہو گئے کہ جب تک اجازت نہ ہوگی بیٹھیں گے نہیں، خواہ دوسرے کو اس سے تکلیف ہی ہو یہ ادب نہیں ہے آجکل اگر کوئی بزرگوں کے سامنے ایسا کرے جیسے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کیا تو اس کو بے ادب سمجھیں گے۔ اب میں بیان کرتا ہوں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل ادب کیونکر ہے۔

بات یہ ہے کہ آپ تھکے ماندے تشریف لائے تھے اگر تمام مجمع سے آپ مصافحہ کرتے اور علیحدہ علیحدہ سب کا حال پوچھتے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ضرور تکلیف ہوتی اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ ذات مقدس ہیں کہ جن کی راحت کے لئے غار میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سانپ سے کٹوا لیا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت رسانی کے واسطے حرکت تک نہیں فرمائی پس ایسے محبوب کی اس قدر تکلیف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسے جاں نثار و محب کو کیسے گوارا ہوتی چنانچہ لوگ آ رہے ہیں اور آپ مصافحہ کر رہے ہیں اب تو یہ مصیبت ہے کہ اگر ایسا کرنے لگیں تو اس کو بے ادب گستاخ مدعی سمجھا جاتا ہے یہ تو ظاہری حکمت اس مصافحہ کی ہوئی اور ایک باطنی راز ہے وہ یہ ہے کہ محبت کا خلاصہ ہے کہ محب میں فنا فی المحبوب کا مضمون پیدا کر دیتی ہے اور فنا کا خلاصہ ہے من وجہ اتحاد سو اللہ تعالیٰ نے یہ دکھلا دیا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایسے محب ہیں کہ لوگ ان کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سمجھ کر ان سے مصافحہ کرتے ہیں۔

من تو شدم تو من شدی

من تن شدم تو جان شدی

لیکن حضرت صدیق اکبر اس پر بھی مغلوب الحال نہیں ہوئے چنانچہ انھوں نے انا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں کہا اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس

واقعہ سے اس اتحاد کو ظاہر فرما دیا جیسے احمد جام کا قول انا احمد بلا مسم یہ غلبہ حال میں انھوں نے فرمایا تھا یہ احمد جام کا قول ہے لوگ اس کو حدیث سمجھتے ہیں حدیث نہیں ہے۔ خیر یہ ایک لطیفہ ہے جس میں کوئی امر خلاف شریعت نہیں ہے حاصل یہ ہے کہ لوگ مصافحہ کرتے رہے جب آفتاب اونچا ہوا اور دھوپ کے اندر تیزی ہوئی اور آپ پر دھوپ آئی اس وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آپ پر ایک کپڑے کا سایہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور یہ خادم ہیں لیکن اس معلوم ہونے پر ان صحابہ رضی اللہ عنہم نے پھر دوبارہ اٹھ کر مصافحہ نہیں کیا اگر آجکل کے لوگ ہوتے تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کرتے اور ہر شخص کہتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں معافی چاہتا ہوں مجھ سے بڑی غلطی ہوئی صحابہؓ کے اندر یہ تکلف نہ تھا حالت یہ تھی کہ وقت پر توجان دینے کو تیار تھے اور دوسرے وقت یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ ان میں کون مخدوم ہے کون خادم ہے اور یہاں ایک بات اور معلوم ہوئی وہ یہ کہ یہ مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا اور وجہ اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر ہر وقت ابر کا سایہ رہتا تھا اس قصہ سے معلوم ہوا کہ ابر کا سایہ نہ داکمی نہ تھا لیکن ہم سایہ نہ ہونے کی نفی نہیں کرتے ہیں ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو مگر ہم نے اس کے متعلق کہیں صراحۃً روایت نہیں دیکھی مواہب لدنیہ میں بہت مبسوط کتاب ہے مگر انھوں نے بھی کوئی روایت نہیں لکھی واجعلنی نوراً سے استنباط کیا ہے لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ اس سے استدلال کرنا کیا درجہ رکھتا ہے۔ بہر حال مقصود اس قصہ سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کوئی حالت ممتاز نہیں رکھتے تھے۔ اولیاء کا ملین کی یہی حالت ہوتی ہے اس کی بحث بہت طویل ہے لیکن بقدر ضرورت تحقیق ہو چکی ہے اسی پر اکتفا کر کے میں اصلی مقصود بیان کرتا ہوں کہ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں شبہ

مغلوب الحال ہونے کا نہ کیا جاوے جیسا کہ واضح ہو گیا۔ اب رہی یہ بات کہ جب یہ نہ غلو فی الدین ہے اور نہ غلبہ حال ہے تو پھر اس حدیث کی کیا توجیہ ہے کیونکہ ظاہراً تو یہ عقل کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ صریح چوری کرتے دیکھ رہے ہیں اور پھر اپنے مشاہدہ کی تکذیب کر رہے ہیں اور عقل کے خلاف ہونے سے خود حدیث کی صحت محسوس ہو گئی اور مبنی اس شبہ کا یہ ہے کہ آجکل ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے انھوں نے کچھ اصول درایت کے تراشے ہیں اور احادیث کو ان اصول پر منطبق کرتے ہیں اور عدم الطباق کے وقت حدیث کے معنی میں تحریف کرتے ہیں یا حدیث کا انکار کر دیتے ہیں انھوں نے عقل و داریت کی حکومت کو اس قدر عام مانا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھی اس کو حاکم بنا دیا خوب سمجھ لو کہ اول تو درایت باوجود حاکم ہونے کے خدائے تعالیٰ پر حاکم نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں نہ جلنے کے خلاف درایت بتلاتے ہیں، ہماری سمجھ میں نہیں آتا اس لئے خدا تعالیٰ نے اس کو واقع نہیں کیا عجب بات ہے تمھاری سمجھ میں نہ آنے سے یہ کیسے لازم آیا کہ اس کا وقوع بھی نہیں ہوا درایت خدا تعالیٰ کے قبضے میں ہے خدا تو درایت کے قبضے میں نہیں۔

مولانا روم رحمۃ اللہ نے ایسی ہی ایک حکایت لکھی ہے۔ جس میں وجہ درایت کی بھی بتلائی ہے کہ ایک بادشاہ نے بڑی بڑی گھاٹیاں آگ سے بھر دار کھیں جو بت پرستی نہ کرتا تھا اُس کو آگ میں پھینک دیتا تھا ایک موحد عورت آئی اس کے پاس ایک بچہ تھا۔ اس عورت کو کہا تو بت کو سجدہ نہ کرے گی تو اس بچہ کو آگ میں پھینک دیں گے۔ اس نے صاف انکار کیا چنانچہ اس بچہ کو آگ میں پھینک دیا۔ اس بچہ نے آگ میں سے ماں کو ندادی ہے

اندر آما در کہ من اینجا خوشم گرچہ در صورت میان آتشم
 اندر آ اسرار ابراہیم بین کہ در آتش یافت در دویا میں
 اندر آپیدائے مسلماناں ہمہ غیر عذاب دین عذاب است آئم
 اے ماں اندر آجا اگرچہ بظاہر میں آگ میں ہوں لیکن اس جگہ
 بہت خوش ہوں اندر آجا اور ابراہیم علیہ السلام جیسا معاملہ
 دیکھ کہ انھوں نے آگ کے اندر گلاب اور یاسمین کے پھول دیکھے
 تھے۔ اے مسلمانوں تم سب اندر آجا دسوائے دین کی شیرینی کے
 سب عذاب ہی عذاب ہے۔

چنانچہ ماں بھی آگ کے اندر کود پڑی اور مسلمانوں نے گرنا شروع کیا اور سب
 صحیح و سالم رہے۔ آخر بادشاہ نے جھلا کر آگ کو خطاب کیا اے آگ تجھ کو
 کیا ہوا کیا تو آگ نہیں رہی آگ نے جواب دیا یہ

گفت آتش من ہما نم آتشم اندر آتا تو بیسی تا بشم
 طبع من دیگر نگشت و عنصرم تیغ حقم ہم بدستوری برم
 آگ نے کہا کہ میں تو وہی آگ ہوں تو خود اندر آجا تا کہ میری گرمی اور
 جلن کو دیکھ لے میری خاصیت بدلی نہیں میں تو وہی اصل سے آگ ہی
 ہوں لیکن میں خدا کی تلوار ہوں حکم کے موافق چلتی ہوں۔

مولانا رحمت اللہ علیہ اس کا راز فرماتے ہیں جس میں درایت کی وجہ بتلائی ہے
 خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
 یا من و تو مردہ باحق زندہ اند

مٹی، ہوا، پانی، آگ سب اللہ کے بندے ہیں اور تیرے لئے مردہ
 معلوم ہوتے ہیں لیکن اللہ کے لئے سب زندہ ہیں۔

پس آگ بیشک فاعل ہے مگر کب تک جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو معطل نہ
 فرمادیں اور جب معطل فرمادیں کسی کام کی نہیں جیسے تحصیلدار حاکم ہے جب

تک معطل نہ ہو جب معطل ہو گیا تو جیسے اور ہیں ویسا ہی وہ بھی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے نہیں جلایا اس لئے کہ اس کو حکم ہو گیا یہاں تک کہ اس کو فی سبیل اللہ سلاماً علی ابراہیم راے آگ تو ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کا سبب بن جا

پس گویا ظاہرِ اخلاف درایت ہے لیکن خود یہ حکم درایت کا کہ التام محرف حق تعالیٰ پر تو حجت نہیں دوسرے آپ کی درایت بھی تو نا تمام ہے چنانچہ آپ کی درایت تو صرف اس قدر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو اپنے خلاف درایت سمجھ لیا حالانکہ واقع میں یہ درایت کے بھی خلاف نہیں ہے اس لئے کہ سرفہ کی حقیقت یہ ہے اخذ مال الغیر خفیۃ اس کے تحقیق کے لئے چار چیزوں کی ضرورت ہے اول لیستہ دوسرے مال کا لینا تیسرے غیر کا مال چوتھے خفیۃ لینا آنکھ سے صرف اس قدر دیکھا جاتا ہے کہ خفیہ مال لینا مگر مال الغیر ہونا یہ آنکھ سے کیسے معلوم ہوا ممکن ہے کہ وہ شخص اس کی ہے یا اس نے اجازت لے لی ہو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اول اس ہیئت کو دیکھ کر فرمایا کہ چوری کی ہے پھر اس کی قسم کے بعد دوسرے عقلی احتمال مستحضر ہو گیا کہ شاید یہ سرفہ نہ ہو اور یہ سمجھا ہو کہ اس ہیئت میں کوئی عارضی مصلحت ہو گی آپ نے دیکھا آپ کی عقل اس قدر ہے اسی طرح جن جن چیزوں کو آپ خلاف عقل کہتے ہیں میں انشاء اللہ تعالیٰ ایک ایک کو عقل پر منطبق کر سکتا ہوں ہم اور آپ عاقل نہیں ہیں ہاں آکل ہیں یعنی ہم کو کھانے کی عقل ہے مثل بہائم کے چنانچہ بعض جانور اپنے کھانے پینے کی ایسی تدبیر کرتے ہیں کہ عقلاً بھی نہیں کر سکتے رجواڑوں میں سنا ہے کہ ریت کے اندر تر بوز چھپے رہتے ہیں۔ بیلوں کو جب پیاس لگتی ہے تو ریت کو کرید کر تر بوز نکال کر کھا لیتے ہیں اور آدمی کو تلاش سے بھی نہیں ملتے اس کھانے پینے کی تدبیروں کو لوگ ترقی کہتے ہیں ترقی یہ ہوئی کہ بیل کے برابر ہو گئے حضرت یہ ترقی نہیں ہے ترقی یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے تم کو عقل دی ہے اس کو دین کے کاموں

میں صرف کہ دکھانے پیسے کی عقل تو جانوروں کو بھی ہوتی ہے بلکہ تم سے زیادہ ہوتی ہے اس پر تو چاہیے کہ وہ زیادہ ترقی یافتہ ہوں اگر یہی ترقی ہے تو ہم میں اور جانوروں میں فرق کیا ہوگا غرض یہ قصہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کا کہ انھوں نے کس قدر احتیاط فرمائی اور لاتقف مالیس لک بد علو پر کیسا عمل کیا ہم لوگوں کی حالت یہ ہے کہ ذرا سے شبہ میں چور کہہ دیتے ہیں محض قرآن سے کسی کو چور کہہ دینا نہایت برا ہے اس پر ایک اور مضمون یاد آگیا کہ بعض لوگ چور کے معلوم کرنے کے واسطے ایک عمل لوٹا گھمانے کا کیا کرتے ہیں اس پر سورہ یسین شریف پڑھتے ہیں جس کے نام پر لوٹا گھوم جائے اس کو یقیناً چور سمجھتے ہیں اور اس عمل میں غلطی کا احتمال ذرا نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کا عمل ہے یاد رکھو کہ یہ حرام ہے شریعت میں بلا اپنے دیکھے یا دو عادل کی گواہی بغیر کسی کو چور سمجھنا ممنوع ہے اور یہ جو کہتے ہیں کہ قرآن کا عمل غلط نہیں ہو سکتا اس میں مغالطہ ہے یہ عمل اگر قرآن کا مدلول ہوتا تو واقعی یقینی ہوتا اور یہی معنی ہیں اس کے قرآن میں احتمال غلطی کا نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ عمل قرآن کا مدلول نہیں خود تمہارا گھڑا ہوا ہے کیا اگر کوئی شخص ایک بڑا سا قرآن لے کر کسی کے سر میں مار دے اور وہ زخمی ہو جاوے تو کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ عمل جائز ہے کیونکہ قرآن کے ذریعہ ہوا ہے حاصل یہ ہے کہ ولاتقف مالیس لک بد علو میں بطریق مذکور زبان کی حفاظت کا حکم بھی داخل ہو گیا اور ہاتھ کی حفاظت اس طور داخل ہوئی کہ تحقیق جرم کسی پر ظلم کرنا حرام ہے اور اس میں بھی مخالفت ہوئی ولاتقف الایہ کی اسی طرح پاؤں کی حفاظت اس طرح داخل ہے کہ بلا تحقیق جواز شرعی کسی ناجائز جمع میں جانا حرام ہے اسی طرح سب جوارح کی حفاظت اس میں داخل ہو گئی اور سمع و بصر و نواد کی حفاظت تو بالقرصیح ہے اس میں مذکور ہے مثلاً کان کو غیر مشروع اصوات و مضامین سے بچانا آنکھ کو غیر مجاز کمیطون نظر کرنے سے بچانا قلب کو گمان بد غیر سے بچانا اور اس سے کسی کو شبہ قیاس فقہی کے بطلان کا نہ ہو

کہ ظاہر وہاں بھی اتباع ہے ایسے امر کا جس کی تحقیق یقینی نہیں کیونکہ حکم مجتہد فیہ ظاہر ہے کہ ظن ہوتا ہے۔ خصوص جب کہ دوسری آیت میں بھی اتباع ظن کی مذمت فرمائی گئی ہے ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی عن الحق بشیئا (وہ لوگ اتباع کرتے ہیں مگر خیال باتوں کا اور خیالی چیز ان پر حق سے علیحدہ اور مطمئن نہیں ہو سکتے جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ جب دلائل شرعیہ مستقلہ سے یہ مسئلہ تحقیق کو پہنچ گیا کہ قیاس اور اجتہاد جائزہ اور واجب العمل ہے تو اس پر مالیس لک بہ علم صادق نہ آوے گا بلکہ وہ مالک یہ علم کا مصداق ہوگا کیونکہ علم کے عموم میں وہ دلائل شرعیہ مستقلہ مثبتہ حجۃ قیاس بالیقین داخل ہیں اگر قیاس کے متعلق اس علم کا تحقق نہ ہوتا تو بیشک اس کا اتباع مالیس لک بہ علم کا اتباع ہوتا اور اب تو وہ اتباع مالک بہ علم کا ہوگا خوب سمجھ لو اور اتباع ظن کی جو مذمت آئی ہے وہاں ظن کے معنی مصطلح فقہی نہیں ہیں بلکہ ظن مصطلح قرآن میں عام ہیں باطل یقینی اور مخالف دلیل صحیح کو بھی چنانچہ منکرین بعثت کے قول میں ان نطن الا ظن آیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کو اس کا احتمال بھی نہ تھا چر جائے کہ احتمال راجح بلکہ وہ اس کو اپنے زعم میں علم صحیح کے خلاف سمجھتے تھے پھر بھی اس کو ظن کہا گیا پس ثابت ہوا کہ اصطلاح قرآن میں ظن عام ہے امور باطلہ کو بھی پس معنی آیت ذم ظن کے یہ ہیں ان یتبعون الا ما خالف الدلیل القطعی وکل ما خالف الدلیل القطعی لا یغنی عن الحق شیئاً اھل ہو باطل قطعاً (وہ نہیں پیروی کرتے ہیں مگر اس چیز کی جو دلیل کے خلاف ہو اور قطعی دلیل کے خلاف ہو وہ حق بات سے بے پروا نہیں کر سکتا بلکہ وہ باطل ہے) پس اس آیت سے بھی شبہ کی گنجائش نہ رہے فقط۔ جامع اہل کربنا ہے کہ بعض عوارض سے میں پورا نہ لکھ سکا جس قدر ضبط ہوا اس کو صاف کر دیا کہ خالی از نقع نہ تھا خصوص تحقیق اخیر کی بے حد لطیف و نافع خصوص طلبہ کے لئے۔

واخیر دعوات ان الحمد للہ رب العالمین

تہ بالتحۃ

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً ۖ

(مسند ابی حنیفہ)

دعوات عبدیت جلد دوم کا
دشواں وعظ ملقب بہ

تقویم الزیغ

مجلد ارشادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی حسنا خانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان

مکتبہ کھانوی۔ دفتر الابقا

مسافر خانہ بند روڈ کراچی
ایم۔ جہانگیر

دعوات عبدیت جلد دوم کا وعظ دہم ملقب بہ

تقویم الزیغ

ابن	مَنَى	کَمَ	کیف	مَاذَا	مَنْضِبُط	الْمُسْتَمْعُونَ	اَشْتَاتُ
سیدنا ابوالحسن	سیدنا ابوالحسن	سیدنا ابوالحسن	سیدنا ابوالحسن	سیدنا ابوالحسن	سیدنا ابوالحسن	سیدنا ابوالحسن	سیدنا ابوالحسن
خطبہ ہر روزی اربعین	۹ شوال ۱۳۳۹ھ	۳-۲۰	کھڑے ہو کر	اندازِ محبت و اخار	چنانچہ کوئی سیاح	۹۰۰	تعلیم یافتہ بہت تھے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبہ ماثورہ اما بعد۔ فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ وَاِنَّ هَذَا اَصْرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَارْتَبِعُوْهُ وَلَا تَشِیْعُوْا الشَّیْلَ فَتَقَرَّ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهِ۔ یہ ایک آیہ کا ٹکڑا ہے اس سے اوپر خدا تعالیٰ نے بعض احکام اعتقادِ یہ اور بعض احکامِ عملیہ بیان فرمائے ہیں ان کے بعد یہ جہادِ رُشْدِ ہوا ہے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا رستہ ہے جو سیدھا ہے اس کا اتباع کرو دوسرے طریقوں کا اتباع نہ کرو کہ وہ تم کو خدا کے رستہ سے دور کر دیں گے۔ اس ترجمہ سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اس وقت کس مضمون کا بیان کرنا مقصود ہے اور یہ کہ یہ کوئی نیا مضمون نہیں بارہا کان اس سے آشنا ہوئے ہوں گے۔ اس پر ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ جب یہ مضمون بارہا سنا ہوا ہے تو اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ سُننا دوسری چیز ہے اور سمجھنا دوسری چیز ہے ہم نے سنا تو ہے مگر سمجھا نہیں خدا تعالیٰ نے کہیں کہیں اس کی تشریح بھی کی ہے اس کو تہذیب و تفکر کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے وَلَیْسَ لَکُمْ اَدُوٌّ اِلَّا الْبَاطِلُ

یعنی کیا ہم ان کو زبردستی اپنی رحمت چٹا دیں اگرچہ وہ کراہت کرتے ہوں اس کی ہم کو کیا ضرورت ہے کیا ہمارے یہاں اس کے رکھنے کو جگہ نہیں اگر ہزار بار چاہیں تو ہم بھی متوجہ ہوں گے اور تمہاری توجہ سے زیادہ متوجہ ہوں گے اور کام بھی ہماری توجہ سے چلتا ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بچے کو آپ لینا چاہیں اور لینے کو ہاتھ بڑھائیں تو اگر بچہ اپنی بساط کے بموجب دوڑے اور کوشش کرے اگرچہ گر ہی جاوے تو آپ خود دوڑ کر اٹھا لیتے ہیں اور یہ مسافت آپ ہی کے بڑھ کر اٹھا لینے سے طے ہوتی ہے ورنہ اس بچہ میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ خود اس مسافت کو طے کر سکے اسی طرح خدا تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی طرف بلا تے ہیں اگر یہ بھی کچھ ہاتھ پیر ہلائے اور کوشش کرے تو اس جانب سے جذب ہوتا ہے اور اس جذب کی بدولت یہ وہاں تک پہنچتا ہے۔ اور یہ فرلانگ دو فرلانگ کی مسافت تو ممکن ہے کہ بچہ قطع کر لے برخلاف اس بعد کے جو ممکن اور واجب میں ہے کہ اگر اُدھر سے جذب نہ ہو تو کبھی یہ مسافت طے ہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اُدھر سے جذب ہونا آپ کی طلب پر موقوف ہے جس کا افسوس ہے کہ آپ نے بالکل چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہر وقت ہدایت دینے کو تیار ہیں مگر افسوس کہ ہم ہی قاصر ہیں اور وہ طلب یہی ہے کہ ہم تدبر کریں اور سوچ لیا کریں۔ اس سے خدا تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہوتا ہے۔

صاحبو! میں پھر کہتا ہوں کہ تدبر اور سوچ اگرچہ بظاہر بہت چھوٹی سی بات ہے لیکن ثمرہ کے اعتبار سے یہ بہت بڑی بات ہے اور اس کے ترک کر دینے سے ہم بہت خراب ہو جاتے ہیں مبتلا ہو گئے ہیں اسی طرح یہ مضمون جو آج بیان کرنا مقصود ہے اس کو بھی آپ نے بہت دفعہ سنا ہو گا مگر کبھی اس میں غور کرنے اور سمجھنے کی نوبت نہیں آئی اس لئے آج سمجھانے کے لئے اس کو اختیار کیا گیا۔ میں مضمون آیۃ کو پھر دوہرائے دیتا ہوں تاکہ وہ تازہ ہو جائے اور وعظ سے یہ ہی مقصود بھی ہوتا ہے کہ جو مضامین کانوں میں پڑے ہیں لیکن ان سے غفلت ہو گئی ہے وہ پھر تازہ ہو جائیں اور یہ منور ہی نہیں کہ ہر وعظ میں کوئی نئی بات ہی بیان کی جاوے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ وعظ سننے سے اصل مقصود کیا ہونا چاہیے کیونکہ آج کل وعظ سننے والوں کے مختلف مقاصد ہو کر رہے ہیں بعض لوگ تو

اس لئے وعظ سننے آتے ہیں کہ واعظ کی تقریر کا اندازہ کریں کہ وہ کس قبیل کی ہے بیان مسلسل ہوتا ہے یا اکھڑا اکھڑا ہوتا ہے مضامین کی آمد کا کیا حال ہے بعض لوگ اس لئے سننے ہیں کہ مضامین سکر واعظ کے خیالات کا اندازہ کریں گے کہ یہ کس خیال کا آدمی ہے بعض لوگ اس لئے آتے ہیں کہ اس کے بیان اور مضامین میں عیب نکالیں گے بعض کی نیت اچھی بھی ہوتی ہے لیکن صرف یہ مجلس وعظ میں شریک ہونے سے اتنا وقت ثواب کے کام میں گزرے گا یہ نیت اگرچہ مستحسن ہے لیکن کافی نہیں کیونکہ وعظ سننے سے یہ مقصود نہیں ہوتا ثواب تو نفلوں میں تلاوت قرآن میں بھی بہت کچھ ملتا ہے وعظ سننے کی اصل غرض یہ ہے کہ وہ امراض باطنی جن پر ہماری نظر بھی نہیں جاتی ان کو سنے اور ان پر ہم کو توجہ ہو پس اس غرض کو پیش نظر رکھ کر وعظ سننا چاہیے۔ غرض خدا تعالیٰ اس مقام پر فرماتے ہیں اَنْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ فَاَتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهِ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ میں عامل اُشیر ہے جو کہ ہذا سے مفہوم ہے ترجمہ آیت کا یہ کہ میرے اس سیدھے رستے کا اتباع کرو اور دوسرے رستوں پر نہ ہو لو کہ وہ تم کو خدا کے رستے سے جدا کر دیں گے۔ ترجمہ سے معلوم ہوا کہ رستے بہت ہیں جن میں ایک خدا کا بتلایا ہوا رستہ ہے اور دوسرے خود بندوں کے تراشے ہوئے ہیں۔ پس ان سب رستوں میں ایک تو اتباع کے قابل ہوگا باقی سب ترک کے قابل۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ طریق الہی کو دوسرے طرق سے ممتاز اور جدا کرنے کے لئے کوئی معیار ہو جس سے ہم کو یہ بات معلوم ہو سکے کہ فلاں رستہ خدا تعالیٰ کا بتلایا ہوا اور قابل اتباع ہے اور اس کے سوا دوسرے قابل ترک اگر غور کیا جائے تو اسی آیت کے پورے مضمون کے اُس معیار کا پتہ چل جاوے گا کہ اس معیار کو چھوڑ دینے ہی سے یہ ساری خرابیاں پیدا ہوئیں جن کی وجہ سے یہ حالت ہو گئی کہ بعض لوگوں کو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ہم نے طرق الہی کو چھوڑ دیا یا لائے ہوئے ہیں چنانچہ اس جزو آئیہ سے اوپر کا جزو اس کے ساتھ ملایا جاوے تو اس سے معیار معلوم ہو جاوے گا۔ فرماتے ہیں قُلْ تَعَالَوْا اَنْتُلْ مَا خَرَّمْ رَّبُّكُمْ عَلَيْنَا اَنَّ لَا تَكْفُرُوْا

بِهِ شَيْئًا وَيَأْتُوا الدِّينَ إِحْسَانًا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ فرمادیجئے کہ آدمی جس کو احکام خداوندی بتلاؤں اور وہ فلاں فلاں ہے اس ارتباط باہمی سے اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ معیار طریق خداوندی کے دوسرے طرق سے ممتاز ہو جائیکہ یہ ہے کہ جس بات کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمادیں وہ پڑھ کر سناویں وہ طریق خداوندی ہو گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرمادیں وہ وحی ہوتا ہے۔ تو خلاصہ یہ نکلا کہ وحی سے جو ثابت ہو وہ طریق الہی ہے تو وحی معیار ہوئی مختلف طرق کے متنازع کرنے کی اور اسی پر دار و مدار ہوا اس مضمون کو بھی مسلمانوں نے بہت دفعہ سنا ہو گا لیکن برتاؤ اور مسلمانوں کے حالات میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے قلب میں تو وحی کی مطلق عظمت ہی نہیں اور یحییٰ کے دل میں وحی کی وقعت تو ہے لیکن اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ اس وقت مسلمانوں میں مختلف فرقے ہیں مگر سب میں مرض مشترک یہ ہے کہ وحی کو معیار نہیں سمجھتے اور اس وجہ سے مناسب تھا کہ سب کو ایک ہی فرقہ کہا جاتا لیکن چونکہ انداز الگ الگ ہیں اس لئے سب کو ایک نہیں کہا جاسکتا اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بادشاہ کی عملداری میں مختلف طرح کے آدمی رہتے ہوں بعض تو ایسے ہوں کہ وہ قوانین کو تسلیم ہی نہ کرتے ہوں بعض ایسے ہوں کہ قوانین کو تو تسلیم کریں لیکن ان قوانین کے صحیح فرض کو نہ سمجھتے ہوں تو یہ سب لوگ اس قدر مشترک میں تو شریک ہیں کہ معیار قانون پر نہیں چلتے لیکن چونکہ تسلیم اور عدم تسلیم کا فرق بھی ہے اس لئے دونوں کو الگ الگ شمار کیا جاوے گا اور برتاؤ بھی دونوں کے ساتھ مختلف ہو گا قانون غلط سمجھنے کے متعلق مجھے ایک حکایت یاد آئی اس سے انشاء اللہ یہ بات بخوبی سمجھ میں آجائے گی کہ قانون کو تسلیم کرنے کے بعد بھی کیونکر اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے۔ ایک غیر ملک کے دیہاتی نے ریل کا سفر کیا اور قریب ایک من کا پورا اپنے ساتھ لیا اسٹیشن پر پہنچا تو ملازمین ریلوے نے ٹکٹ کے ساتھ اسباب کی بلی بھی طلب کی اس نے جب بجائے بلی کے بھی اپنے ٹکٹ ہی کی طرف اشارہ کیا ملازم ریلوے نے اس کو سمجھانے کے طور پر کہا کہ تمہارا اسباب چونکہ پندرہ سیر سے زیادہ ہے اور پندرہ سیر سے زیادہ اسباب محمولہ ادا کئے بغیر لیجانے کی قانون میں اجازت نہیں ہے اس لئے ایک بلی اس اسباب کی بھی ہونی چاہیے یہ سن کر وہ دیہاتی کہتا ہے کہ پندرہ سیر سے بہت کم وزن مرا ہیں

بلکہ وہ مقدار جس کو ایک آدمی اٹھا سکے اور چونکہ ہندوستانی لوگ پندرہ سیر ہی اٹھا سکتے ہیں اس لئے یہ خاص وزن لکھ دیا گیا ہے اور ہم ایک من اٹھا سکتے ہیں اس لئے ہمارے ایک من کے لئے وہی قانون ہو گا جو ہمارے پندرہ سیر کے لئے ہے خیر یہ حکایت تو ایک لطیفہ ہے لیکن ہم کو اس سے سبق لینا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا وہ ٹکٹ کلکٹر اس دیہاتی کے جواب کو سن کر اس کو معذور سمجھے گا یا اُس کے لئے یہ ضروری ہو گا کہ وہ کتاب قانون کی لاکر اس دیہاتی کے سامنے رکھ دے اور اس کو قانون سمجھانے کی اور اس کے اشتباہ رفع کرنیکی کوشش کرے اور اگر وہ ہر شخص کے ساتھ ایسا کیا کرے تو کیا اپنے منصبی کام کو پورے طور پر انجام دے سکے گا کبھی نہیں بلکہ یہ مشغلہ اس کو معطل کر دے گا پس ان ساری دقتوں کو پیش نظر رکھ کر آپ بتلایئے کہ ٹکٹ کلکٹر کیا کرے گا۔ صرف یہ ہی کہ ہاتھ پکڑ کر اس کو پولیس کے حوالہ کر دے گا۔ تو جیسا اس دیہاتی نے قانون کی غلط تفسیر کی تھی اسی طرح آجکل قرآن کی غلط تفسیر کی جاتی ہے اور زور دیکر کہا جاتا ہے کہ اس قانون قرآنی کا یہ ہی مطلب ہے حالانکہ نہ وہ مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا نہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سمجھا نہ خدا تعالیٰ نے بتلایا۔ صاحبو! قرآن فہیم لوگوں کی نظروں میں اس قسم کی تفاسیر کی وقعت اس سے زیادہ نہیں ہے جتنی وقعت اس دیہاتی کی تفسیر قانون کی تھی حالانکہ بظاہر اس کی یہ تفسیر اور تاویل جی کو لگتی ہے کہ اگر کوئی شخص قانون پر نظر نہ رکھتا ہو تو وہ اس کو سن کر یقین کرے کہ یہ ہی معنی اس قانون کے ہیں اور آپ کو یہ تفسیر منکر معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون مدت سے سنا ہوا ہے ورنہ جس نے کبھی اس قانون کو نہ سنا ہو اور وہ اس گفتگو کو سنے کہ ٹکٹ کلکٹر تو کہتا ہے قانون یوں ہے اور دیہاتی کہتا ہے کہ قانون کی لم کیا ہے کیوں یہ خاص وزن قانون میں رکھا گیا ٹکٹ کلکٹر جواب دیتا ہے کہ ہم عالم قانون ہیں مجوزہ قانون نہیں ہم نہیں جانتے کہ کیا لم ہے اس پر دیہاتی کہتا ہے کہ تم اگر چہ نہیں جانتے لیکن میں جانتا ہوں لم اس کی یہ ہے کہ پندرہ سیر سے زیادہ اکثر ہندوستانی اٹھا نہیں سکتے اور جب یہ لم ہے تو جہاں ینتفی ہوگی قانون بھی منتفی ہو گا تو اس دیہاتی کی آب و تاب کی تقریر اور ٹکٹ کلکٹر کا بظاہر عاجزانہ جواب اس کا یہ خیال قائم کر ا دے گا کہ قانون کی اصل حقیقت دیہاتی نے سمجھی اور

ملکٹ کلکٹر محض زیر دست کر رہا ہے حالانکہ قانون دان آدمی جانتا ہے کہ قانون وہی ہے جو ملکٹ کلکٹر کہہ رہا ہے اور اس لئے وہ ملکٹ کلکٹر کی جملہ تجاویز کو جو اس دیہاتی کے متعلق ہوں بجا اور مناسب سمجھے گا۔ یہ ہی حالت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے بچپن سے کبھی شریعت کے احکام نہیں سنے اور ہوش سنبھال کر انہوں نے ایک عالم اور ایک جاہل کی گفتگو سنی کہ عالم کہتا ہے شریعت کا یہ قانون ہے اور جاہل اس کی لم دریافت کر رہا ہے جس کے جواب میں عالم یہ کہہ کر ختم کر دیتا ہے کہ ہم عالم قانون ہیں واضح قانون نہیں لم اور مصلحت خدا تعالیٰ کو معلوم ہے جو کہ واضح قانون ہے ہم اس کے ذمہ دار نہیں اور وہ جاہل مدعی عقل کہتا ہے کہ میں اس کی لم جانتا ہوں اور یہ کہہ کر احکام میں تحریف شروع کر دیتا ہے جس طرح اس دیہاتی نے قانون ریلوے میں تحریف کی تھی۔ تو صاحبو! کیا وجہ کہ اس گنوار کے قصہ میں تو اس کو ناحق پر اور ملکٹ کلکٹر کو حق پر کہا گیا اور اس جاہل کی گفتگو میں علماء کے جواب کو زیر دست پر محمول کیا گیا اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو بتلائیے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ احکام خداوندی کی عظمت دل میں نہیں اور گورنمنٹ کے احکام کی عظمت دل میں ہے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس کی عظمت دل میں ہوتی ہے اس کے احکام میں علتیں نہیں تلاش کی جاتیں بے چون و چرا تسلیم کر لیا جاتا ہے اور جس کی عظمت دل میں نہیں رہتی اس کی ہر بات میں لم اور کیف کیا جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض مرتبہ کوئی ایسا حکم سرکار کی طرف سے آتا ہے کہ جس سے طبیعت منقبض ہوتی ہے عقل بھی ابا کرتی ہے لیکن اس کو بلا تامل تسلیم کر لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب گورنمنٹ نے یہ حکم دیا تو اس میں کوئی مصلحت ضرور ہوگی اس طرح کے بہت سے احکام ہیں جن کی علت عوام کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن ان کو مانا اور ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک روپیہ کا عدالتی ٹکٹ لفافہ پر لگا کر ڈاک میں بھیجا جاوے تو لفافہ بیرنگ ہو جائے اور ڈاک خانہ کا دو پیسہ کا ٹکٹ لگا دیں تو بیرنگ نہ ہو ہزاروں آدمی ہوں گے جو اس قانون کی لم نہیں جانتے لیکن اگر ان میں کا کوئی عدالتی ٹکٹ لگا کر بھیجے اور لفافہ بیرنگ ہو جاوے تو گورنمنٹ سے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ اس کی لم دریافت کی جاتی ہے کہ ایک روپیہ (د) میں لفافہ کیوں بیرنگ ہوا اور دو پیسہ میں کیوں بیرنگ نہیں ہوتا، غرض کبھی دوسرے بھی نہیں آتا کہ اس کی مخالفت

کی جائے یا علت تلاش کی جائے برخلاف اس کے اگر ایک دوست کوئی حکم کرے یا کسی امر میں رائے دے تو اس میں صدا عیب نکال دیتے ہیں وجہ اس کی یہی ہے کہ گورنمنٹ کی وقعت دل میں ہے اور دوست کی نہیں کیونکہ وہ آپ کی برابر کا ہے اور گورنمنٹ بالادست ہے۔ صاجو اذرا غور کرو کہ خدا تعالیٰ کے احکام میں علت ڈھونڈھ کر آپ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی عظمت آپ کے دلوں میں نہیں رہی اور اگر اس کے سوا کوئی دوسری وجہ ہے تو مجھے بتائیے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے حکم یا رائے کو باوجود اس کے بالادست نہ ہونے اور ہمارے دل میں اس کی عظمت نہ ہونے کے بھی اس وجہ سے کہ ہم اس رائے کو اپنے لئے مفید سمجھتے ہیں تسلیم کر لیا جاتا ہے مثلاً ایک شخص کسی طبیب کے پاس گیا اور جا کر مرض کی تشخیص کرائی اور نسخہ لکھوایا تو اس موقع پر آپ نے کسی کو نہ دیکھا ہو گا کہ اگر اجزاء نسخہ کی حکمت اور علت اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو اس نے طبیب سے دریافت کیا ہو یا اس کے ساتھ الجھنے لگا ہو کہ یہ اوزان خاص کیوں رکھے گئے واللہ کبھی اس کا دوسرے بھی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو زبان سے کبھی نہیں کہتے کیونکہ جانتے ہیں کہ ہمارے ہی فائدہ کے لئے اس نے نسخہ تجویز کیا ہے ایسا نہ ہو چوں وجہ کرنے سے کبیدہ خاطر ہو کر ہم کو نکال دے اور کبھی نہ گھسنے دے۔ تو صاجو! اگر احکام خداوندی کی قدر بھی دلوں میں نہ ہو تب بھی اس لئے ان کو تسلیم کر لو کہ وہ صرف تمہارے ہی فائدے کے لئے تجویز کئے ہیں ایسا نہ ہو تمہارے اعراض سے خدا تعالیٰ خفا ہو جائیں اور تم پر کوئی مصیبت آپڑے ۵

من نکر دم خلق تا سوئے کنم بلکه تا برسد گاں جو دے کنم
تو اگر احکام خداوندی کی وقعت گورنمنٹ کے احکام کے برابر نہیں ہے تو حکیم ہی کا سا برتاؤ کیا ہوتا اور حیب یہ بھی نہیں تو معلوم ہوا کہ احکام خداوندی کی اتنی بھی قدر نہیں۔ البتہ حکیم کی تجاویز میں ایسے لوگ ضرور چھیڑ چھاڑ نکالا کرتے ہیں جن کو نسخہ پینا منظور نہ ہو بلکہ محض مشغلہ کے طور پر لگے ہوں تو میں لوگوں کے حالات دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر وہی لوگ احکام خداوندی میں لم کیف کرتے ہیں جن کو

کچھ کرنا نہیں ہوتا اور جن کو عمل کرنا ہوتا ہے وہ اگر سوال کرتے ہیں تو یہ کہ نماز میں قرض کس قدر ہیں، واجب کتنے ہیں کیونکہ ان کو یہ فکر ہے کہ لاعلمی میں ہم سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے جس سے نماز ہی جاتی رہے ان کو یہ کیف سے بالکل تعلق نہیں ہوتا۔ پس حجت تلاش کرنے کے دو سبب ہوئے ایک تو احکام کی وقعت نہ ہونا دوسرے عمل کی نیت نہ ہونا اور علل تلاش کرنے والوں کچھ لوگوں میں نہ وقعت ہے نہ عمل کی نیت ہے بہر حال مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت ہے جو وحی کی عظمت اور قدر نہیں کرتے اور ایک ایسی جماعت ہے جو وحی پر نہیں چلتے ان دونوں کے لئے معیارِ وحی کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے بالجملہ جس طرح معاملاتِ حکام و رعایا میں معیارِ تعین و تصحیح کا قانون ہے اسی طرح طریقِ نجات کے لئے بھی معیارِ صحیح قانونِ الہی ہے جس کو وحی کہا جاتا ہے اور جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتے ہیں اُنْزِلَ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لَمْ يَجْعَلْ لَكَ جِوَارِحًا ہوا ہے اس کو پڑھئے تو خلاصہ دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ نکلا کہ جو وحی سے ثابت ہو وہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے اور ہذا صِرَاطِی مُسْتَقِیْمًا میں صراط کو جو اپنی طرف منسوب و مضاف فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ تک پہنچانے والا اور میرا بتلایا ہوا راستہ ہے اور ظاہر ہے کہ جو راستہ خدا تک پہنچانے والا ہوگا وہ مستقیم ہی ہوگا۔ مُسْتَقِیْمًا فرمایا اور مستقیم کے معنی نہیں کہ کوئی خطِ مستقیم ہے نیز یہ بھی مقصود نہیں کہ خدا تعالیٰ کا بتلایا ہوا کوئی دوسرا غیر مستقیم رستہ بھی ہے جس سے احتراز کرنے کو اس کی صفتِ مستقیم لائے ہوں بلکہ خدا تعالیٰ کا ایک ہی رستہ بتلایا ہوا ہے جو کہ مستقیم ہی ہے تو آجکل چونکہ لوگوں نے اس طریق کو معیار نہیں بنایا اس لئے بہت سے فرقے ہو گئے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ فرقوں سے مراد مسلمانوں کے فرقے ہیں کافروں کے نہیں تو بعض تو وہ ہوئے جنہوں نے وحیِ الہی کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو اس دیہاتی نے کیا تھا کہ وحی کو وحی تو مانا مگر اُس میں تغیر و تبدل کرنے لگے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ایک بڑے فرقے کی یہ کوشش ہے کہ قرآن شریف کی آیتوں کو جس طرح بن سکے سائنس پر منطبق کیا جائے اور ایسے لوگ علماء پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ لکیر کے فقیر ہیں۔ صاحبو! میں دعویٰ کرتا ہوں کہ سائنس کا کوئی حقیقی مسئلہ قرآن شریف کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا اور حقیقی کی قید اس لئے

لگائی ہے کہ سائنس کے مسائل دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں کہ محض تخمین سے ان میں کام لیا گیا ہے اور اکثر اسی قسم کے ہیں دوسرے وہ ہیں جو تحقیق سے ثابت ہوئے ہیں تو جو مسائل تحقیقی ہوں گے وہ کبھی قرآن شریف کے دعویٰ کے معارض نہیں ہوں گے۔ کیونکہ قطعی عقلی قطعی نقلی کے معارض نہیں ہو سکتا۔ صاجو! آج کل تو تحقیق کا زمانہ ہے اور مسائل میں غور و فکر سے کام کیا جاتا ہے تو ذرا اس میں بھی تو غور کرو کہ اہل سائنس کے جتنے دعویٰ ہیں سب صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ مثلاً اہل سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمان کا وجود نہیں تارے سب فضا میں گھوم رہے ہیں تو دیکھو یہ مسئلہ ظنی ہے یا یقینی تو سائنس کی رو سے آسمان کا عدم قطعی طور سے ثابت نہیں ہو سکتا، آج تک جتنی دلیلیں نفی آسمان پر قائم کی گئیں ان سب کا خلاصہ عدم العلم ہے جو کہ عدم الوجود کو مستلزم نہیں اور وجود آسمان دلیل قطعی سے ثابت ہے کیونکہ وجود آسمان فی نفسہ ممکن ہے یعنی آسمان کا وجود و عدم دونوں عقلاً برابر ہیں اور یہ عقلی مقدمہ ہے کہ جس ممکن کے وجود کی خبر نہیں مخیر جو قطعاً صادق ہو دیتا ہے تو اس ممکن کا وجود ثابت قطعی ہوتا ہے اور اس کے وجود کی خبر ایک مخیر صادق یعنی قرآن شریف نے دی ہے پس ان تینوں مقدموں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ آسمان موجود ہے اور آسمان کے ممکن الوجود ہونے کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ عقلاً ممکن ہے یعنی نہ واجب ہے اور نہ متمنع پس نہ ضروری الوجود ہو نہ ضروری العدم تو عقل اس کے وجود یا عدم کی بابت کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتی زیادہ سے زیادہ اگر کہا جاسکتا ہے تو صرف اس قدر کہ ہم کو از روئے عقل وجود کا پتہ نہیں چلا اور معلوم ہے کہ عدم ثبوت اور ثبوت العدم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ امریکہ کا وجود جس وقت تک ہم لوگوں کو ثابت نہ تھا اس وقت تک بھی ہم یوں نہیں کہہ سکتے تھے کہ امریکہ موجود نہیں البتہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہم کو وجود امریکہ کا علم نہیں ہے۔ پس اہل سائنس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو آسمان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا اور یہ ہم کو مضر نہیں کیونکہ ہم تقریرِ رسالتی سے ان کو وجود آسمان تسلیم کر دیں گے۔ البتہ اس کے ضروری الوجود ہونے پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اہل یونان نے وجود آسمان پر عقلی دلائل قائم کئے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ یونان کے دلائل قریب قریب سب

مخدوش ہیں جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں واقعیت یہ ہے کہ عقل سے نہ آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے نہ عدم۔ رہی یہ بات کہ علی العوام اس نیلگوں رنگ کو جو جانب فوق نظر آتا ہے آسمان سمجھا جاتا تھا اور آج یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ نیلگوں رنگ آسمان نہیں ہے اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ اول تو جن دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے وہ خود ابھی مخدوش ہیں اور بنا الفاسد علی الفاسد ہے۔ دوسرے اگر ثابت ہو بھی جائے کہ یہ رنگ آسمان نہیں ہے تب بھی اس سے عدم وجود آسمان نہیں ثابت ہوتا ممکن ہے کہ آسمان اس سے آگے ہو۔ پس یہ کہنا کہ آسمان کا وجود جو کہ شریعت سے ثابت ہے دلائل سائنس سے مصادم ہے سخت غلطی ہے کیونکہ سائنس اس میں بالکل ساکت ہے اور قرآن شریف ناطق اور تصادم و تعارض ناطقین میں ہوتا ہے ساکت و ناطق میں نہیں ہو سکتا اور جب تعارض نہیں ہے تو سہار کی تفسیر کو اکب یا مانو قناد وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر یقیناً تحریف ہوگی اور ایسے محرفین کی بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ انہوں نے وحی کو معیار نہیں بنایا کیونکہ باوجود وحی کو ماننے کے اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی جس طرح اس دیہاتی کو کہا گیا تھا کہ اس نے قانون پر عمل نہیں کیا۔ ایک صورت تو وحی کو معیار نہ بنانے کی یہ تھی۔ ایک اور یہ صورت ہے کہ بعض لوگ وحی کو مانتے بھی ہیں اور اس کی حقیقت کو بھی سمجھتے ہیں لیکن اس کو قرآن شریف میں منحصر سمجھتے ہیں اور فقہ و حدیث کو وحی سے خارج کر دیتے ہیں تو غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ لوگ بھی وحی کو نہیں مانتے اور اس کو معیار نہیں سمجھتے وجہ یہ ہے کہ سب کو معلوم ہے کہ قانون کی شرح اگر مقتن کر دے تو وہ شرح بھی قانون ہی ہے یا اگر اصول اقلیدس سے اشکال جدیدہ بنائی جائیں تو ان اشکال کو بھی اقلیدس کی اشکال کہا جائے گا۔ پس حدیث تو چونکہ وحی ہے اگرچہ غیر متلو ہے اس لئے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے قرآن شریف کی شرح ہے اور اس لئے اس کا حکم بھی قرآن شریف کا سا ہے اور مسائل فقہ چونکہ انہیں اصول برہنی ہے جو قرآن و حدیث میں ہیں اس لئے وہ بھی حکم میں وحی کے ہوں گے۔ تو وحی کبھی جلی ہوتی ہے کبھی خفی۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

تُخَرِّجَ عَلَيْنَا بَيِّنَاتَهُ ۚ جُنَاحٌ مِّمَّا يَنْجِبُ حُضُورَ صَلَّی اللہ علیہ وسلم پر آیت اِنْ تَبَدَّلُوا مَا فِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تَحْقُقُوْهُ یَحْاسِبُکُمْ بِہِ اللہ ۙ نَازِلٌ ہُوْنِیٰ تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ سمجھا کہ شاید سواوس پر بھی گرفت ہو اس لئے بہت گھبرائے اُن کی گھبراہٹ پر دوسری آیت نازل ہوئی جس نے اس کی تفسیر کر دی۔ لَا یُکَلِّفُ اللہُ نَفْسًا اَلًا وَّ سَعًیًا اس آیت نے بتلادیا کہ وسواوس پر جب تک کہ وہ وسوسہ کے درجے میں رہیں مواخذہ نہ ہوگا۔ نیز حدیث کے ذریعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر فرمائی اِنَّ اللہَ یَجْعَلُ عَمَلِیَّ عَمًا وَّ سَوَسًیً صَدُوْرًا مَّا لَمْ یَعْمَلْ اَوْ تَتَكَلَّمْ اَوْ کَمَا تَال۔ پس حدیث قرآن شریف کی تفسیر ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے اور بعض چیزیں چونکہ حدیث میں بھی مجمل رہ گئی تھیں مثلاً ربو! میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ مَثَلًا بِمَثَلٍ یَّدَا یَبِیْدُ وَالْفَضْلُ رَبُّو! اور دوسری جگہ فرمایا کہ دَعُو! التَّوْبَا وَالزَّوْبِیَّةَ اس سے معلوم ہوا کہ ربو! حرام ہے اس کی جزئیات کا پتہ اس سے نہیں چلتا تھا ہمارے فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے مَثَلًا بِمَثَلٍ اور یَدَا یَبِیْدُ سے سب جزئیات کو نکال دیا جن کو عوام الناس نہ سمجھ سکتے تھے اور اسی لئے علم اصول مدون کیا نیز یہ بھی کہہ دیا کہ اَلْقَبِیُّ سٌ مُّظْہَرٌ لَا مُثَبِّتٌ جس میں اس بات کا اقرار ہے کہ ہم نے کوئی نئی بات نہیں کہی جو کچھ کہا ہے حدیث و قرآن شریف ہی کی تفسیر ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جا بجا یہ ارشاد فرمایا کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وحی سے فرماتے ہیں کوئی بات وحی کے خلاف نہیں تو اس سے اُن لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو حدیث یافتہ کو نہیں مانتے اور محدثین اور فقہاء پر اعتراض کرتے ہیں۔ صاحبوا! حدیث سے کیونکر استغنا ہو سکتا ہے فرمائیے کہ اگر حدیث کو نہ مانا جائے تو رکعات کی تعداد یا اوقات نماز کی تعیین کس طرح معلوم ہوگی۔ اگرچہ اوقات خمسہ کا ذکر قرآن شریف میں ہے لیکن وہ اس طرح ہے کہ جس کو پیشتر سے معلوم ہوئے وہ اُن پر منطبق کر سکتا ہے ورنہ خود قرآن شریف سے بلا مدد حدیث تعیین نہیں ہو سکتی کیونکہ قرآن شریف میں صراحۃً نہیں ہے اشارات ہیں اور تعداد رکعات کا اشارہ بھی نہیں اور یوں قرآن کا آسمان مان لیا جائے تو اس کو ثبوت بالقرآن نہ کہا جائے گا۔ مثلاً ایک صاحب نے

تعداد رکعات کو قرآن شریف کی اس آیت سے ثابت کیا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاَطِیْعُو السَّمٰوٰتِ وَاَلارضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃَ رُسُلًا اُولٰٓئِیْ اَاجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَاَثَلٰتٍ وَذُبَاغٌ اور کہا ہے کہ اس آیت سے نماز کا دور رکعت اور تین رکعت اور چار رکعت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ صاحبو! کہاں فرشتوں کا ذکر کہاں رکعات کی تعداد یہ سب نفس کا زیغ اور کید ہے میں یہ قسم کہتا ہوں کہ نفس کا کید ایسی بلا ہے کہ بہت سی اصلاح کید نے سے بھی دفع نہیں ہوتا اور جس نے اصلاح ہی نہ کی اس کے کید کے دور ہونے یا سرے سے کید نہ ہونے کی تو کیا امید ہو سکتی ہے اور کید یہ ہے کہ نفس نے دیکھا کہ حدیث و فقہ میں احکام بکثرت ہیں اور ان سب پر عمل ہونا دشوار ہے اس لئے اس نے یہ ترکیب نکالی کہ ان سب کو چھوڑ دو صرف قرآن شریف کو لو اور اپنی مرضی کے موافق تفسیر کرو کہ جس سے کچھ کرنا ہی نہ پڑے میں کہا کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں اعمالِ کیمیاء کی بہت ترقی ہوئی کہ دین کا بھی مست نکل آیا۔ صاحبو! جس کو طلبِ شریعت ہوگی وہ کبھی ایسی ترکیبیں نہیں نکال سکتا۔ دیکھئے جس کو بھوک کی شدت ہوتی ہے وہ زیادہ کا طالب ہوا کرتا ہے نہ یہ کہ موجود کو بھی اڑانے کی فکر کرے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ۷

نہ حنش غلیتہ دارد نہ سعدی راسخن پایاں

بمیرد تشنہ مستقی و دریا، ہم چنناں باقی

حقیقت میں جب طلب ہوتی ہے تو موجودہ ذخیرہ کو سن کر بھی تمنا ہوتی ہے کہ کچھ اور ہوتا اور جب طلب نہیں ہوتی تو سب میں اختصار کیا جاتا ہے۔ یہاں تک تفسیر بالرائے کی جاتی ہے کہ ایک صاحب نے حرمتِ ربوٰی کا انکار کر دیا اور کہا کہ کلامِ مجید میں جو ربوٰی آیا ہے بضم بالرائے ہے جس کے معنی اُچک لے نے کے ہیں۔ چونکہ اعراب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھے بعد کو لگائے گئے اس لئے غلطی ہو گئی اور کسر الراء لکھ دیا گیا۔ صاحبو! ربوٰی بضم الراء عربی کا لغت تو ہے نہیں جس کے معنی اُچک لینے کے ہوں البتہ فارسی میں ربودن کے معنی اُچک لینے کے ہیں، پس کیا یہ لفظ فارسی کا قرآن شریف میں داخل کر دیا گیا۔ اور محرفین پر تو زیادہ افسوس نہیں کہ وہ تو اپنے

مطلب کے لئے کہتے ہیں مگر افسوس ان پر ہے جو قرآن شریف کو مانتے ہیں اور پھر اس کی کوشش کرتے ہیں کہ سب احکام قرآن شریف سے ثابت ہو جائیں سچ ہے یہ دوستی بے خبر و چون دشمنی است حق تعالیٰ ازین جنہیں خدمت غنی است واللہ اس وقت وہ حالت ہے کہ دیندار اور بے دین سب کی حالت خراب ہے وہ شعریا داتا ہے جو کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا ہے کہ

اے بسر پردہ یثرب بخواب خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

ایک صاحب مجھ سے ملے کہنے لگے کہ ڈاکٹری تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ مہنی میں کچھ کیرٹے ہوتے ہیں مجھے مدت سے خیال تھا کہ قرآن شریف کی آیت سے بھی یہ بات ثابت ہو تو اچھا ہے چنانچہ ایک روز میں قرآن شریف پڑھ رہا تھا اُس میں یہ آیت نکلی۔

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اور عَلَقٌ جو نک کو کہتے ہیں مجھے بہت خوشی ہوئی۔ بھلا خیال تو فرمائیے کہ آیت کے معنی ہیں؟ کہاں جو نک کہاں کیرٹے۔ کہاں ڈاکٹری کے مسائل کہاں قرآن شریف اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص فن طب کی کتابوں میں کپڑا بننے کی ترکیب تلاش کرنے لگے، یا فن طب میں حدیث ڈھونڈنے لگے چنانچہ ایک صاحب نے ایسا کیا بھی کہ میرے پاس طب اکبر یا میزان الطب نے کرائے اور کہنے لگے کہ آپ رسم رسم کو منع لکھتے ہیں حالانکہ اس کتاب میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسینؑ یا حسنؑ کا چار سال چار ماہ چار دن کی عمر میں مکتب کرایا اور لوگوں کو جمع کرایا۔ صاحبو! جس فن کی کتاب ہو اس فن کے مسائل اس میں تلاش کرنے چاہئیں۔ تو اب یہ دیکھ لیا جائے کہ قرآن شریف کس فن کی کتاب ہے قرآن شریف جغرافیہ نہیں کہ اس میں جغرافیہ کے مسائل ڈھونڈھئے، طب ادیان نہیں کہ بخار کھانسی کی ادویہ اس میں ملیں۔ قرآن شریف طب روحانی اور تہذیب نفس کی کتاب ہے تو جیسے طب ابدان میں زراعت اور صناعت کے مسائل نہیں گے قرآن شریف میں بھی بجز طب روحانی کے دوسرے مسائل کی تلاش سعی بے حاصل ہے، اور اگر کسی دوسری چیز کا ذکر آیا بھی ہے تو وہ کسی روحانی مرض کے دفع کے لئے مثلاً منجملہ امراض روحانی کے ایک مرض جہل باللہ و بصفاۃ بھی تھا قرآن شریف نے اس کو دفع کیا اور اس ضرورت

کے لئے یہ فرمایا کہ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالاٰتِخْلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ جَس كَا
خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کو معلوم کرنے کے لئے مصنوعات میں غور کرو
مثلاً آسمان کے وجود میں زمین کے وجود میں رات اور دن کے وجود میں مگر نہ اس حیثیت
سے کہ آسمان سیال ہے یا نہیں اور زمین کردی شکل ہے یا مُسَطَّح بلکہ مطلق موجود اور مصنوع
ہونے کے اعتبار سے پس قرآن شریف میں ایک مسئلہ سائنس کا بحیثیت سائنس کے مذکور نہیں
اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں کیونکہ کسی طب کی کتاب میں جو تے بنانے کی ترکیب نہ ہونا اس
کتاب کا کمال ہے مسلمانو! خدا کی قسم یہ قرآن کا غایت درجہ کمال ہے کہ اس میں یہ خرافات
نہیں ہیں نہ قرآن شریف کو اس کی ضرورت کہ نہ بروستی اس میں ان مسائل کو داخل کیا جائے۔
بلے نقاش احتیل ہے نیست دیوار گلتاں را

اگر قرآن شریف میں یہ خرافات ہوتے تو قرآن شریف کتاب الطبعیات ہوتی نہ کہ طب روحانی
لہذا قرآن شریف سے کیرٹوں وغیرہ کے وجود ثابت کرنے کی کوشش۔ دوستی بجز وچوں دشمنی
ست ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر غلق کے ہی معنی ہیں جو کہ ان ڈاکٹر صاحب نے فرمائے تو کیا وجہ
کہ اس کو نہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھا نہ ابو بکرؓ سمجھے نہ دوسرے صحابہؓ اور تابعینؓ نے
سمجھا۔ چنانچہ کسی نے یہ تفسیر نہیں کی۔ اگر کہا جائے کہ آج مسئلے کی تحقیق ہوئی ہے اس سے
پیشتر یہ محقق نہ تھا تو اس میں اول تو اپنے اسلاف کے کتنے بڑے جہل کا اقرار ہے دوسرے
اگر کوئی ملحد تم سے کہے کہ تمہارا قرآن شریف نازل ہوا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور پڑھا
تمام صحابہؓ اور تابعینؓ نے لیکن سمجھا ہم نے تو تم کیا جواب دو گے۔ اور اگر قرآن شریف ایسا
ہی وسیع ہے کہ اس میں ہر چیز کو داخل کیا جاسکتا ہے تو پھر اپنے کو اور اپنے متعلقین کو بھی
داخل کر دو جیسے مشہور ہے کہ کسی گاؤں میں تین چودہری تھے ایک کا نام ابراہیم تھا دوسرے
کا موسیٰ تیسرے کا عیسیٰ امام نے نمازیں سبَّحِ اسْمَ رَبِّکَ سورت پڑھی جس کے اخیر میں ہے
صُحُفِ ابْرٰہِیْمَ وَمُوسٰی تُو عِیْسٰی چودہری خفا ہو گیا۔ امام نے پھر وہی سورت
پڑھی اور موسیٰ کے بعد عیسیٰ بھی پڑھا دیا۔

اسی طرح مجھ سے ایک مقام پر ایک ڈاکٹر بلے کہنے لگے کہ جدید تحقیقات سے

جواب کو سن کر معترض صاحب بھی خاموش ہو گئے۔ حالانکہ اس جواب سے صرف ڈاڑھی کا وجود معلوم ہوتا ہے وجوب سے اس میں تعرض نہیں۔ اور جب دوسرے وقت ان مستدل صاحب سے ان کے وجوب کی حقیقت ظاہر کی گئی تو فرماتے ہیں کہ خیر اُس وقت تو معترض کو خاموش کر دیا۔ صاحبو! اہل علم کو تو اس قسم کے جوابوں سے عار آنی چاہیے اور یہ خرابی اس کی ہے کہ اگرچہ نیت خراب نہیں لیکن چونکہ محیب نے دیکھا کہ ہمارے زمانہ کے لوگ بغیر آیت قرآن شریف پیش کئے ماننے نہیں اس لئے سائل کے تالیخ ہو کر ہر جواب کو قرآن شریف سے ثابت کرنے لگے۔ حالانکہ اس کا کھلا نتیجہ تحریف ہے پس آج ہی سے کیوں تحقیقی جواب نہ دیا جائے۔ اور سائل کی تبعیت چھوڑ دی جائے۔ مثلاً ڈاڑھی رکھانے کے متعلق میں تحقیقی جواب عرض کرتا ہوں لیکن اول یہ سمجھ لیتا چاہیے کہ وہ جواب بالکل پھیکا اور سیدھا سادہ ہوگا کیونکہ تحقیقی بات ہمیشہ بے مزہ ہوتی ہے دیکھئے غالب اور مومن خاں کے اشعار میں کیا کچھ لطف آتا ہے اور حکیم محمود حناں کے نسخہ پر کسی کو وجد نہیں ہوتا۔ غرض وہ تحقیقی جواب یہ ہے کہ ڈاڑھی رکھنے کے وجوب کا ثبوت قرآن شریف سے دینا ہمارے ذمہ نہیں ہے اور درحقیقت یہ سوال کہ قرآن شریف سے ثابت کر دو متضمن ایک دعویٰ کو ہے کہ احکام شرعیہ کا ثابت ہونا قرآن شریف ہی میں منحصر ہے۔ تو اول سائل سے اس دعویٰ کی دلیل دریافت کجا لگی جب وہ دعویٰ پر دلیل قائم کر دے گا۔ اس وقت ہمارے ذمہ جواب ہوگا اور جب وہ جواب نہ دے سکے گا تو ہم ثابت کریں گے کہ اصول شریعت کے چار ہیں۔ قرآن شریف حدیث۔ اجماع۔ قیاس۔

پس جب کسی حکم کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں حکم شریعت سے ثابت ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ حکم ان چاروں میں سے کسی ایک سے ثابت ہے، ہاں اگر کسی ایک سے بھی ثابت نہ کر سکے تو حکم شرعی کہنا غلط ہوگا۔ اس کی تائید کے لئے میں ایک قانونی نظیر بیان کرتا ہوں۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص نے عدالت میں جا کر کسی دوسرے شخص پر بدعوائے کیا عدالت نے

اس سے دعویٰ کے گواہ طلب کئے اور اس نے قانون کے موافق گواہ پیش کر دیئے جن پر کسی قسم کی جرح نہیں ہو سکی کیا اس کے بعد مدعا علیہ کو یہ حق ہے کہ وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ ان گواہوں کی گواہی تسلیم نہیں کرتا۔ البتہ اگر جج صاحبِ خود اگر گواہی دیں تو میں تسلیم کروں گا۔ اور اگر کوئی مدعا علیہ ایسا کہے تو عدالت اس کو کیا جواب دے گی یہ بھی کہ ان گواہوں میں جرح کر دیا دعویٰ تسلیم کرو۔ وجہ اس جواب کی یہ ہے کہ اثباتِ دعویٰ کیلئے مطلق حجت کی ضرورت ہے۔ حجت خاص کی ضرورت نہیں ہے پس کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ میں فلاں حکمِ قرآن شریف ہی سے مانوں گا۔ حدیث شریف یا اجماع وغیرہ سے تسلیم نہ کروں گا البتہ اگر کسی حدیث یا اجماع میں جرح کرے تو اس کا حق ہے اور علماء اس جرح کا جواب دینے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ ہے تحقیقی جواب۔ لیکن ہمارے بھائیوں نے اس طرز کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور بالکل معترضین کے تابع ہو گئے ہیں، لیکن کہاں تک ان کے تلواروں کے نیچے ہاتھ دیں گے کبھی تو عاجز ہونا پڑے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ع: بروئے خود در طلبا ع باز نتواں کرد۔

ایسے ہوسناک لوگوں کا اول ہی علاج کرنا چاہیے۔ خوب سمجھ لو کہ قرآن ہی سے ہر بات کے ثابت کرنے کی کوشش کرنا سخت مشکل میں پڑنا ہے حدیث فقہ سب قرآن شریف ہی کے حکم میں ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ حکیم علوی خاں کے مطب کو لے کر ایک شخص نے جمع کیا اور ہر نسخہ کے متعلق ضروری ہدایات لکھ دیں کہ فلاں نسخہ غلبہ صفر کے لئے ہے اور فلاں نسخہ غلبہ بلغم کے لئے اور دوسرے شخص نے ان سب نسخوں کی تبویب کر دی کہ امراضِ راس کے نسخے الگ کر دیئے اور امراضِ چشم کے الگ تو اس مفسر اور مہیوب کو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ حکیم علوی خاں کا مطب نہیں ہے بلکہ یہی کہیں گے کہ عباداً تئسا شتی و حُسنُکَ واجد۔ اور یہ کہا جائے گا کہ ۵

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش من اندازِ قدرتِ رامے شناسم

ہاں اس پہچان کے لئے طلب شرط ہے اگر طلب ہی نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ورنہ طالب کو حدیث فقہ سب میں قرآن شریف ہی نظر آئے گا۔ صاحبِ او یہ تفریق طلب نہ ہونے کا

نتیجہ ہے طالب کی تو یہ شان ہوتی ہے کہ ۵

بسکہ درجہ ان نگارِ دجتم بیدارم توئی ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی
ایسا شخص حدیث و اجماع کو ہرگز الگ نہ سمجھے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لیتا
چاہیے کہ جس طرح محبوب کبھی غیر محبوب کے لباس میں کبھی جلوہ گر ہوتا ہے اسی طرح کبھی
غیر مطلوب بھی مطلوب کے لباس میں آجاتا ہے تو ان میں تمیز کرنے کی بھی نہایت ضروری ہے
چنانچہ آجکل یہ مرض عام ہے کہ غیر محبوب کو محبوب سمجھ کر اس پر عاشق ہو گئے ہیں وہ لوگ
ہیں جو اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اس حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ تو گویا ایک جماعت
نے اتباع کو ایسا چھوڑا کہ وہ الحاد تک پہنچ گئے۔ دوسرے فرقے نے اس شدت سے
اتباع کیا دعویٰ کیا کہ بدعات میں مبتلا ہو گئے۔ یعنی ان کو اپنی رسوم میں بھی عبادات نظر
آنے لگیں اور وہ رسوم اگرچہ جائز بھی ہوں لیکن ان کو عبادت سمجھنا سخت غلطی ہے کیونکہ
عبادت وہ ہے جس پر ثواب کا وعدہ ہو اور ان رسوم میں ثواب کا وعدہ کسی حدیث یا آیت
میں نہیں ہے غرض اس وقت یہ دو مرض کہ دلائل کو غیر دلائل سمجھنا جو کہ الحاد ہے اور غیر
دلائل کو دلائل سمجھنا جو کہ بدعت ہے ہندوستان میں بکثرت ہے۔ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم
میں ذی اثر دو فرقے ہیں ایک امرا کا اور ایک عام فقرا کا۔ ان دونوں فرقوں کی حالت
نہایت درجہ خراب ہے ان دونوں فرقوں کی بدولت بہت زیادہ الحاد اور بدعت دنیا میں
پھیلا امرا میں الحاد زیادہ پایا جاتا ہے اور فقرا میں بدعت زیادہ پائی جاتی ہے اگرچہ ایک
تیسرا فرقہ علماء کا بھی ہے، لیکن میں نے ان کو اس لئے اضلال سے خارج کیا ہے کہ جہانتک
دیکھا جاتا ہے علماء کا دوسروں پر اثر کم ہے۔ پس ان کی وجہ سے چنداں خرابی نہیں پڑ سکتی اور
جن علماء کا کم و بیش اثر ہے تو وہ ان کی بزرگی اور درویشی خیال کی وجہ سے ہے صرف عالم ہونے
لے اور اس سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا کہ علماء جو کبھی چندہ وغیرہ کی ترغیب دیتے ہیں ان کے ترغیب دینے
میں اُس قدر خرابیاں نہ ہوں گی جتنی اہل دنیا کے طلب چندہ میں خرابیاں واقع ہوتی ہیں۔ کیونکہ
اہل دنیا کا ایک دوسرے پر اثر ہوتا ہے اور وہ دباؤ سے کام لے سکتے ہیں اور کام لیتے ہیں۔ بخلاف
علماء کے کہ وہ دباؤ ڈال ہی نہیں سکتے۔ ۱۲۰

کی وجہ سے کسی عالم کا کچھ اثر نہیں بلکہ جو صرف عالم سمجھے جاتے ہیں ان کی توہین ہے کہ اگر عوام اہل دنیا ان کی توہین نہ کریں تو غنیمت ہے یا اگر کسی عالم کے باوجود بزرگ نہ سمجھے جانے کے عزت اور اثر ہو تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے اعتبار سے ذی جاہ ہوتا ہے اور علی العموم اہل جاہ کی طرف لوگ اپنے کو منسوب کرتے ہیں کیوں کہ کسی بڑے کی عظمت کرنا خود اپنی عظمت ہوتی ہے اس لئے کہ ان کے ساتھ منتسب ہونے سے اپنی بڑائی ہوتی ہے غرض صرف عالم ہونے کی وجہ سے کسی عالم کا کچھ اثر نہیں یا فقیہ کی وجہ سے ہے یا جاہ کی وجہ سے اور بلفظ دیگر امیری کی وجہ سے ورنہ اگر صرف عالم ہونے کی وجہ سے کسی عالم کا اثر ہوتا تو طلبہ کا بھی بہت اثر ہوتا چاہئے تھا کہ وہ بھی تو عالم ہیں اور میں دوسروں کو کیا کہوں خود اپنے اندر بھی یہی حالت دیکھتا ہوں کہ طلبہ کی زیادہ وقعت نظر میں نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ علماء کی من حیث العلم کچھ وقعت نہیں ہے۔ ایک رئیس صاحب کے ہاں ایک طالب علم کا کھانا مقرر تھا۔ چونکہ اکثر اس کو وہاں انتظار کرنا پڑتا تھا اس لئے اس کو خیال ہوا کہ اتنا وقت بیکار جاتا ہے اس میں اگر کچھ دین ہی کی خدمت ہو تو اچھا ہے۔ رئیس سے کہنے لگا کہ میں یہاں دیر تک بیٹھا رہتا ہوں اگر آپ کا لڑکا کچھ پڑھ ہی لیا کرے تو اچھا ہے۔ رئیس ضا کہنے لگے کہ مولوی صاحب آپ لے عربی پڑھی تو یہ نتیجہ ہوا کہ میرے دروازہ پر کھانا لینے کے لئے آتے ہیں میرا لڑکا پڑھے گا تو کسی دوسرے کے دروازے پر جائے گا۔ اس حکایت سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ علماء کے ساتھ لوگوں کا کیا برتاؤ ہے۔ اور علماء کا کتنا اثر ہے۔ اور جب علماء کا کچھ اثر نہیں تو ان کو ذی اثر لوگوں میں کیوں شمار کروں اور اپنی اس حالت کو منکر علماء کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اب وہ کیا کریں اگر اب بھی انکی سمجھ میں نہ آیا ہو تو سخت افسوس ہے۔ خیر میں بتلاتا ہوں کہ ان کو بالکل استغفار چاہئے۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے ۵

وَمَا أَرَاهُمْ رَضُوا فِي الْعِيشِ بِالْأَدْنَى

أَدْنَى الْمُلُوكِ بِأَذْنِ الدِّينِ قَدْ قَنَعُوا

أَسْتَغْنَى الْمُلُوكُ بِدُنْيَاهُمْ عَنِ الدِّينِ

فَاسْتَغْنَى بِالْأَدْنَى عَنِ الدُّنْيَا الْمُلُوكُ كَمَا

وہ دنیا کو لیکر تم سے مستغنی ہو گئے تم دین لیکر ان کی دنیا سے مستغنی ہو جاؤ۔ میں خدا کے بھر دے پر کہتا ہوں کہ اگر اہل علم دنیا سے مستغنی ہو جائیں تو خدا تعالیٰ ان کی غریبے مدد کریں اور بلکہ خود ہی اہل دنیا جو آج کو ذلیل سمجھے ہیں اس وقت ان کو معزز سمجھنے لگیں اور ان کے محتاج ہوں گے کیونکہ ہر مسلمان کو بحیثیت مسلمان ہونے کے جس طرح اپنی ضروریات کیلئے کم و بیش دنیا کی ضرورت ہے دین کی اس سے زیادہ ضرورت ہے خواہ وہ عالم ہو یا جاہل رئیس ہو یا غریب اور یہ ظاہر ہے کہ علماء کے پاس بقدر ضرورت دنیا موجود ہے اور اہل دنیا کے پاس دین کچھ بھی نہیں تو ان کو ہر ہر امر میں موت میں حیات میں نماز میں روزے میں سب میں علماء کی احتیاج ہوگی اور اگر کوئی کہے کہ مجھے دین کی ضرورت ہی نہیں تو وہ مسلمان ہی نہیں غرض ایک وقت ایسا آئیگا کہ اہل دنیا خود علماء کے پاس آئیں گے پس علماء کو بالکل استغنا چاہئے اور خدا تعالیٰ کے دین میں مشغول ہونا چاہئے ہم لوگوں میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں کرتے اگر خدا تعالیٰ سے ہم کو تعلق ہو تو کسی کی بھی پرواہ نہ رہے البتہ میں علماء کو بد اخلاقی کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ بعض استغنا بد اخلاقی کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے حضرت حاجی امداد صاحب مہاجر مکی نور اللہ مرقدہم امرار کی بہت خاطر داری کرتے تھے اور وجہ اس کی یہ فرماتے تھے کہ نَعُوْا اِلَیْہِمْ عَلٰی بَابِ الْفَقِیْرِ یعنی جو امیر فقیر کے دروازہ پر جائے وہ بہت اچھا ہے پس جب کوئی امیر آپ کے دروازہ پر آیا تو اس میں امارات کے ساتھ ایک دوسری صفت بھی پیدا ہوگئی یعنی نعو کی پس اس صفت کی عظمت کرنی چاہئے لہذا بد اخلاقی کی اجازت نہیں۔ ہاں استغنا ضروری ہے خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ اصل مقصود اس مقام پر یہ تھا کہ علماء کی وقعت اور ان کا کچھ اثر نہیں کیونکہ جس کو دیکھتے علماء پر اعتراض کرنے اور ان کو مشورہ دینے کو آمادہ ہے۔ ایک صاحب ایک مرتبہ علماء پر نہایت برہم اور علماء کو برا بھلا کہہ رہے تھے کچھ دیر تک بوجہ اس کے کہ وہ مہمان تھے میں نے صبر کیا آخر جب وہ حد بہت آگے نکل گئے تو میں نے پوچھا کہ علماء نے کیا قصور کیا کون سی ایسی خطا ان سے ہوئی۔ کہنے لگے کہ علماء انگریزی پڑھنے کو منع کرتے ہیں اور قوم کے تنزل کا سبب یہ ہیں حالانکہ انگریزی کی بہت ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ اول تو یہ افتراء محض ہے علماء انگریزی پڑھنے کو منع نہیں کرتے دوسرے قطع نظر انگریزی کے جواز اور عدم جواز

آپ یہ بتلائیے کہ علماء کی ممانعت کا کچھ اثر ہے یا نہیں اگر کہئے اثر تو ہے میں کہوں گا کہ کیا وجہ علماء کے اثر نے قوم کے بچوں کو عربی پڑھنے پر کیوں نہ لگا دیا جب علماء ایسا نہیں کر سکے تو معلوم ہوا کہ علماء کا کچھ اثر قوم پر نہیں اور جب اثر نہیں تو علماء سے کچھ نقصان قوم کو نہیں پہنچا۔ اصل سبب قوم کے تنزل کا کوئی دوسرا امر ہے اور وہ یہ ہے کہ قوم علی العموم سست کام جو آرام طلب ہے جفا کشی تو ہو نہیں سکی اپنے چھٹکارے کے لئے مولویوں کے فتوے کو آڑ بنا لیا۔ صاحبو! کیا وجہ کہ تمام فتاوے میں سے علماء کا صرف یہ ہی ایک فتویٰ پسند ہوا بھی دوسرے فتووں پر کیوں عمل نہ کیا گیا وجہ یہ ہی ہے کہ یہ اپنی مرضی اور نفس کے موافق تھا۔ ایک شخص سے کسی نے پوچھا تھا کہ قرآن شریف کا کونسا حکم تم کو زیادہ پسند ہے کہنے لگا کُلُوا وَاشْرَبُوا اور دعا کو پوچھا تو یہ بتلائی۔ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدًا مِّنَ السَّمَاءِ کیا کوئی شخص اس کو عامل بالقرآن سمجھے گا ہرگز نہیں بلکہ تابع نفس و ہوا کہیں گے۔ بس یہی حال آج کل علماء کی پیروی اور ان کے اتباع کا ہے کہ جس بات کو اپنی مرضی کے موافق دیکھتے ہیں اس میں علماء کو آڑ بنا لیتے ہیں اس جملہ تقریر سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اثر جو کچھ ہے امرار اور فقراء کا ہے اور جو کچھ خرابیاں پھیلیں انھیں دو فرقوں کی وجہ سے پھیلیں پہلا فرقہ الحاد میں مبتلا ہے دوسرا فرقہ بدعات میں غرق ہے۔ پس اُس ملت کے مریضوں کا کیا مال ہو گا جس کے اطباء خود مریض ہیں۔ نیز علماء کے اس زمرہ سے خارج ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اگر خود بگڑیں بھی اور اعمال کو ترک بھی کر دیں تو اپنے کو گنہگار سمجھتے ہیں اور اپنے بڑے اعمال کی طرف کسی کو دعوت نہیں کرتے اور لوگوں کو اپنے اس طرز پر چلانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو نیک ہی رستہ بتلا دیں گے برخلاف امرار اور فقراء کے کہ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جس رستہ پر ہم ہیں دوسرے بھی اسی پر ہولیں اگرچہ ہم اور وہ دونوں جہنم کے غار میں جا گریں چنانچہ چند روز ہونے کے ایک روشن خیال نے یہ مضمون شائع کیا تھا کہ اسلام کی ترقی کو سب سے بڑی مانع نماز ہے اگر علماء مل کر نماز کو اسلام سے خارج کر دیں تو اسلام کو بہت ترقی ہو ہاں اتنا ضرور ہوا کہ بعض عالموں نے اپنا طرزِ عمل ایسا کر دیا کہ اہل دنیا کو ان کی بدولت خود علم سے نفرت ہو گئی یعنی بعض علماء نے امرائے

ملنا اور اختلاط کرنا اس قدر بڑھادیا اور اس اختلاط کی وجہ سے ان احرار کے ہاں میں ہاں ملنے لگے کہ ان کو دیکھ کر اہل دنیا نے یہ سمجھا کہ سب عالم ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ ٹونک کا واقعہ ہے کہ ایک رئیس نے ڈارٹھی منڈا رکھی تھی ایک عالم نے ان پر اعتراض کیا اور وہ رئیس متاثر ہوا اتفاق سے مجمع میں ایک دوسرے صاحب بھی بیٹھے تھے اور یہ مولوی کہلاتے تھے آپ فرماتے ہیں کہ ڈارٹھی ہرگز نہ رکھنی چاہیے کیونکہ اس میں جوئیں پڑ جاتی ہیں۔ اور وہ زنا کرتی ہیں۔ فرمایئے کہ اس رئیس کی نظر میں کیا وقعت ان عالم کی رہی ہوگی۔ اور زیادہ مناسب ان صفات کا کسی خاندان ہوتا ہے۔ ایک شخص نے ڈھاکہ میں مجھ سے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ انگریزی خواں طالب علم نہایت باہمت عالی حوصلہ جری جفاکش ہوتے ہیں۔ اور عربی خواں طالب علم نہایت ہست ہمت تنگ خیال شست کم حوصلہ ہوتے ہیں۔ مقصود ان کا یہ تھا کہ یہ فرق عربی اور انگریزی کے اثر سے ہے یعنی ہست ہمتی وغیرہ عربی کے آثار ہیں اور علو حوصلگی وغیرہ انگریزی کے آثار ہیں۔ میں نے کہا جناب علو حوصلگی وغیرہ جس قدر صفات ہیں یہ علو خاندان پر موقوف ہیں یعنی جو عالی خاندان ہوگا اس میں یہ صفات ہوں گے۔ وہ خواہ عربی پڑھے یا انگریزی اور جو عالی خاندان نہ ہوگا اس میں یہ صفات نہ ہوں گی۔ اگرچہ وہ انگریزی کے اعلیٰ پایہ کی ڈگری حاصل کر لے بلکہ اکثر واقعات اور مشاہدات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہست خاندان آدمی اگر عربی پڑھ لیں تو کم و بیش ان کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں اور اگر انگریزی پڑھیں تو بالکل ہی برباد ہو جاتیں۔ عربی انگریزی کے آثار کا پورا مقابلہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ ایک خاندان کے ایک طبیعت کے دو بچے لئے جائیں ایک کو انگریزی شروع کرائی جائے اور دوسرے کو عربی۔ اور دس برس کے بعد دونوں کا موازنہ کیا جائے اور جبکہ خوش قسمتی سے انتخاب ہی ایسا پاکیزہ ہو کہ عربی کے لئے جو لائے تیلی۔ اور انگریزی کے لئے شرفار۔ تو عربی کہاں تک اپنا اثر کرے اور کس حد تک ان کی بیٹی کو مٹائے اور شرفار میں کوئی بچہ عربی کے لئے دیا بھی جاتا ہے تو ایسا کہ جو بالکل ہی کو دن ہو تو جب عربی میں سارے کو دن ہی کو دن منتخب ہونگے پھر ان سے علو حوصلگی کیا ہوگی اور میں نے ان سے کہا کہ آپ ہمراہ چلئے تو میں آپ کو دکھلاؤں

کہ علماء ایسے ہوتے ہیں۔ غرض ایسے علماء سے ایک یہ ضرر پہنچ سکتا ہے اور میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر اس پر بھی کسی کو علم کمال حاصل ہو تو وہ اس دنارت و خست سے ضرر دور ہوگا سوائے لوگوں کو جب غور سے دیکھا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ عالم ہی نہیں ہیں کیونکہ علم کمال ہے اور کمال کا خاصہ ہے استغفار دیکھئے۔ بڑھی راج کو ہالہ جب اپنے فن میں کامل ہو جاتے ہیں تو کیسے مستغنی ہو جاتے ہیں تو کیا علم ان ذیل کاموں کے برابر بھی اثر نہیں رکھتا ضرور کہتا ہے اور بالیقین کہا جاسکتا ہے کہ جس میں استغنا نہیں اس کے کمال ہی میں کمی ہے۔ علامہ تقی زانی کا واقعہ لکھا ہے کہ جب امیر تیمور کے دربار میں آئے تو امیر تیمور بوجہ لنگ ہونے کے پر پھیلائے بیٹھا تھا آپ نے بھی بیٹھ کر پر پھیلا دیا۔ امیر تیمور کو ناگوار ہوا اور کہا کہ معذورم دار کہ مرا لنگ است۔ علامہ فرماتے ہیں۔ معذور دار کہ مرا لنگ است۔ صاحبو! یہ ہے علم کا خاصہ۔ جن لوگوں کو آپ عالم کہتے ہیں یہ واعظ ہیں جنہوں نے چند اردو فارسی کے رسالے یا دکر لئے ہیں ان کو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یہ لوگ اپنے کو علماء کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں اور جہل کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ ایک واعظ صاحب نے سورہ کوثر کا وعظ کیا اور ترجمہ پہلی آیت کا یہ کیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے تجھ کو کوثر کے مثل دیا اس احمق سے کوئی پوچھے کہ کاف تو اعطینا کا مفعول ہے پھر مثل کس لفظ کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح ایک واعظ گنگوہ میں آیا اور وعظ کیا جب جنت دوزخ کا تذکرہ آتا تو بجائے جہنم کے جہنم کہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ظالم نے کہیں لکھا بھی نہیں دیکھا صرف کسی کی زبان سے سن لیا ہوگا۔ اس سے بھی زیادہ پر لطف یہ واقعہ ہے کہ سہارن پور میں ایک واعظ آیا جمعہ کی نماز کے بعد آپ نے پوچھا کہ ساہبو! یہاں اداج (واعظ) بھی ہوا کرے ہے معلوم ہوا کہ نہیں ہوتا۔ آپ نے پکار دیا بھائیو! اداج (واعظ) ہوگی۔ لوگ ٹھہر گئے۔ منبر پر پہنچ کر لیسین شریف کی غلط سلط آتیں پڑھیں اور غلط سلط ترجمہ کر کے دعائیں گھر گھر اہو گیا کوئی نابینا عالم موجود تھے، انہوں نے اُس کو بلا کر پوچھا تمہاری تحصیل کہاں تک ہے تو آپ کیا فرماتے ہیں ہماری تسیل (تحصیل ہے) ہاپوڑ

پھر انھوں نے صاف کر کے پوچھا کہ تم نے پڑھا کیا کیا تو آپ فرماتے ہیں ہم نے سب کچھ پڑھا ہے۔ نور نامہ۔ ساہن نامہ۔ دانی حلیمہ کا قصہ۔ معجزہ آل نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور گو کیا جانے اندر ہے۔ یہ نمونہ ہے واعظ صاحب کی لیاقت کا۔ لیکن پھر بھی ان لوگوں سے اتنا ضرر نہیں ہوتا کیونکہ دیکھنے والے اور سننے والے ان کے جہل کے سبب پہلے ہی معتقد نہیں ہوتے۔ البتہ ان لوگوں سے گہرا ضرر پہنچتا ہے جن کی زرق برق تقریریں مہذب الفاظ، سستہ بندشیں مسلسل بیان معلوم ہوتا ہے کہ غرض الی وقت خطبہ دے رہے ہیں۔ یا رازی زماں بول رہے ہیں مگر علم دیکھئے تو ہدایۃ النخو بھی شاید نہ پڑھی ہو۔ یہ لوگ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو تباہ کیا خود ڈوبے اور دوسروں کو بھی لے ڈوبے۔ غرض حقیقی علماء پر کسی قسم کا الزام اس بابے میں نہیں آسکتا۔ ایک شبہ شاید کسی کو پیدا ہو کہ علماء میں چونکہ آپس میں اختلاف ہے اختلاف کی وجہ سے لوگ گمراہی میں مبتلا ہوئے میں کہوں گا اگر اختلاف کی وجہ سے لوگ گمراہ ہوئے تو اس میں بھی انہیں کا قصور ہے اس لئے کہ اختلاف صرف طبقہ علماء میں منحصر نہیں۔ دنیا میں شاید کوئی جماعت کوئی طبقہ ایسا ہو جس کے افراد متفق اللسان ہوں مثلاً فن طب، ڈاکٹری، صناعی، تجارت، غرض جس قدر بھی دنیا میں فنون ہیں سب میں اختلاف ہے پس اگر کسی طبقے کا اختلاف عوام کے لئے ضرر رساں ہو سکتا ہے تو اطباء اور ڈاکٹروں کا اختلاف کیوں ان کے لئے مہلک نہیں ہوا وہاں کوئی تدبیر انھوں نے کی جس کی بدولت حکیم عبدالحمید اور حکیم عبدالعزیز کے اختلافات کے ضرر سے محفوظ رہے۔ تدبیر یہ کی کہ دونوں کو کسی معیار پر جانچ کر جس کو زیادہ کامل سمجھا اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا۔ صاحبو! کیا مستعار زندگی اور چند روزہ آرام کے لئے تو اس تدبیر کی ضرورت ہے اور حیات دائمی کے لئے اس تدبیر کی ضرورت نہیں۔ اگر نہیں معلوم ہوتی تو حیف ہے اس اسلام پر۔ اور اگر ضرورت ہے تو کیوں اس تدبیر پر عمل نہیں کیا جاتا اور اختلاف کے ضرر سے کیوں نہیں بچا جاتا اور جس طرح انتخاب اطباء کے لئے مثلاً یہ معیار ہوگا کہ اس نے کسی بڑی جگہ پڑھا ہو سند حاصل کی ہو، اس کے ہاتھ سے اکثر مریض اچھے ہوتے ہوں۔ اس میں

حرص و طمع نہ ہو بتدہ دنیا رہے ہو مریضوں پر شفقت ہو شخصیں مرض میں پوری مہارت ہو۔ اسی طرح علماء میں بھی انتخاب اسی معیار سے ہو گا کہ جس کے ہاتھ سے اکثر لوگوں کو ہدایت ہوتی ہو طالین پر شفقت کرتا ہو خود دنیا سے نفور ہو۔ گناہوں سے بچتا ہو کسی بزرگ کی صحبت میں رہا ہو اس پر خشیت الہی غالب ہو۔ پس اس کے کہنے پر عمل کرو کیونکہ یہ تم کو جو کچھ بتلائے گا اس میں خدا کا خوف کرے گا اور گردِ بڑے کچھ کا کچھ نہ بتلائے گا۔ لیکن دوسروں کو بھی بُرا نہ کہو۔ بہر حال یہ خدشہ بھی جاتا رہا کہ علماء کے اختلاف سے لوگ گمراہ ہوئے۔ اب صرف دو فرقے ایسے رہ گئے کہ جن کی وجہ سے زیادہ تر گمراہی پھیلی ایک امراء اور دوسرے فقراء کہ ان میں اکثر گمراہ کن اور گمراہ ہیں (الامامنا اللہ) بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کو ابراہیم بن ادہمؒ کہنا چاہیے اور جنید بغدادیؒ حضرت جنیدؒ کی یہ حالت تھی کہ ایک شخص آپ کا امتحان کرنے آیا اور دس برس تک آپ کے پاس رہا مگر معقد نہ ہوا۔ ایک روز کہنے لگا کہ میں نے آپ کی بزرگی کی شہرت سنی تھی لیکن میں دس برس سے آپ کے پاس ہوں۔ اس مدت میں میں نے آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی آپ نے فرمایا کہ تو نے اس مدت میں جنید کو کسی گناہ صغیرہ یا کبیرہ میں مبتلا دیکھا۔ اس نے جواب دیا کہ گناہ تو کوئی نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ جنید کی یہ کچھ چھوٹی کرامت ہے کہ دس برس تک اُس سے خدا کی مرضی کے خلاف نہ ہو؟ علیٰ ہذا ایک دوسرا واقعہ ان کا مشہور ہے کہ ان کے زمانہ میں چند مدعیانِ تصوف کا یہ قول آپ کے پاس پہنچا کہ وہ کہتے ہیں نَحْنُ وَصَلْنَا ذَکَا حَبَّةً لَّنَا إِلَى الصِّيَامِ وَالصَّلَاةِ۔ آپ نے سن کر فرمایا صَدَقُوا فِی الْوَصُولِ وَلَکِنْ إِلَى سَقَرٍ اور پھر فرمایا کہ اگر میں ہزار برس زندہ رہوں تو نقلِ عبادت بھی بدوں عذر شرعی ترک نہ کروں۔ تو فقراریں بعض ایسے بھی ہیں کہ وہ جنید بغدادی کے مثل ہیں۔ اور امراء میں بھی بعض حضرات ابراہیم بن ادہمؒ کی طرح ہیں لیکن کثرت سے ایسے ہی ہیں جن میں الحاد اور بدعت کا زور ہے ایک جماعت کو تو مثالوں میں میں بیان کر چکا ہوں۔ دوسری اہل بدعت کی وہ جماعت ہے

جو ہم لوگوں کو وہابی کہتی ہے۔ لیکن ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ ہم کو کس مناسبت سے وہابی کہا گیا کیونکہ وہابی وہ لوگ جو کہ ابن عبدالوہاب کی اولاد میں ہیں یا اس کے متبع ہیں۔ ابن عبدالوہاب کے حالات مدون ہیں ہر شخص ان کو دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ نہ اتباع کی رو سے ہمارے بزرگوں میں ہیں نہ نسب کے رو سے۔

البتہ آج کل جن لوگوں نے تقلید کو ترک کر دیا ہے ان کو ایک اعتبار سے وہابی کہنا درست ہو سکتا ہے کیوں کہ ان کے اکثر خیالات ابن عبدالوہاب سے ملتے جلتے ہیں۔ البتہ ہم لوگوں کو حنفی کہنا چاہیے کیونکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصول چار ہیں۔ کتاب اللہ، حدیث الرسول، اجماع امت، قیاس مجتہد۔ ان چار کے سوا اور کوئی اصل نہیں اور مجتہد اگرچہ متعد ہیں لیکن اجماع امت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ائمہ اربعہ (یعنی امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام مالک بن انس) کے مذہب کے باہر ہونا جائز نہیں نیز یہ بھی ثابت ہے کہ ان چاروں میں سے جس ملک میں جس کا مذہب رائج ہو اس کا اتباع کرنا چاہیے۔ تو چونکہ ہندوستان میں امام ابوحنیفہ کا مذہب رائج ہے اس لئے ہم انھیں کا اتباع کرتے ہیں۔ ہم لوگ وہابی کے لقب سے بُرا نہیں مانتے لیکن اتنا ضرور کہہ دیتے ہیں کہ قیامت میں اس بہتان کی باز پُرس ضرور ہوگی۔ میں بدعت کی جڑ تیار بھی بتلاتا لیکن اول تو علمائے پوری طرح رسائل کے ذریعہ سے بتلا دیا ہے، دوسرے وقت میں گنجائش نہیں۔ البتہ ایک پہچان بدعت کی بتلائے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جو بات قرآن حدیث اجماع قیاس چاروں میں سے کسی ایک سے بھی نہ ثابت ہو اور اس کو دین سمجھ کر کیا جائے وہ بدعت ہے اس پہچان کے بعد دیکھ لیجئے کہ ہمارے بھائیوں کے جو اعمال ہیں مثلاً غُرس کرنا، فاتحہ دلانا، تخصیص اور تعین کو ضروری سمجھ کر ایصال ثواب کرنا وغیرہ وغیرہ جتنے اعمال ہیں کسی اصل سے ثابت ہیں اور ان کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے یا نہیں۔ اور اگرچہ خواص کا عقیدہ ان مسائل میں خراب نہیں۔ لیکن یہ فقہ حنفیہ کا مسئلہ ہے کہ خواص کے جس مستحسن امر سے جبکہ وہ مطلوب عند الشرع نہ ہو عوام میں خرابی پھیلے خواص کو چاہیے کہ اس امر کو ترک کر دیں۔

ہاں اگر وہ امر مطلوب عند الشرع ہو اور اس میں کچھ منکرات مل گئے ہوں تو منکرات کو مٹانے کی کوشش کریں گے اور اس امر کو نہ چھوڑیں گے مثلاً اگر جنازے کے ساتھ منکرات بھی ہوں تو مشایعت جنازے کو ترک نہ کریں گے کیونکہ مشایعت جنازہ کی مطلوب عند الشرع ہے۔ پس ایصالِ ثواب میں دو امر ہیں ایک تعین وقت دوسرا ایصالِ ثواب اور ان میں سے تعین وقت مطلوب عند الشرع نہیں اگرچہ مباح ہے اور چونکہ تعین عوام میں خرابی پھیلتی ہے اس لئے ہم تعین کو ترک کر دیں گے البتہ اگر ساری امت کا یہ عقیدہ ہو جائے کہ وہ تعین کو ضروری نہ سمجھے تو ہم خواص کو بلکہ سب کو تعین کی اجازت دیدیں گے لیکن حالت موجودہ میں (جبکہ اکثر وہ خیال ہے کہ خاص تاریخوں میں ثواب پہنچانے سے زیادہ قبولیت ہوتی ہے اور یہ خلاف شریعت ہے) کیسے اجازت دیدی جائے۔ ایک شخص نے مجھ سے کہا گیارہویں اٹھارہ تاریخ تک ہو سکتی ہے پھر نہیں ہو سکتی۔ ایک وعظ میں میں نے ان رسوم کا بیان کیا بعد وعظ کے ایک صاحب کہنے لگے کہ علماء کو ایسے مضامین بیان نہ کرنا چاہئیں کہ تفریقِ امت ہوتی ہے میں نے کہا کہ ہمارا بیان کرنا تو آپ کے عمل کرنے پر موقوف ہے جیسے لوگوں کے اعمال اور حالات ہوں گے ویسا ہم بیان کریں گے۔ اگر لوگ ان اعمال کو چھوڑ دیں تو ہم بھی اس قسم کے بیان کو چھوڑ دیں گے تو تفریق کا الزام ان اعمال کے ارتکاب کرنے والوں پر ہے نہ کہ ہم پر غرض یہ امر مطلوب عند الشرع نہیں۔ اور ان سے خرابیاں بہت کچھ پھیل رہی ہیں۔ اس لئے ان کو ترک کر دینا چاہیئے۔ ایک تو تخصیص اور تعین قابلِ ترک ہے۔ دوسرے جو ہیئت ایصالِ ثواب کی اختراع کر رکھی ہے وہ قابلِ ترک ہے۔ مجھ سے ایک دیہاتی کہنے لگا کہ اگر ایصالِ ثواب کے وقت کھانے پر چند سوتیں پڑھ لی جائیں تو حرج ہی کیا میں نے جواب دیا کہ جس مصلحت سے کھانے پر سوتیں پڑھی جاتی ہیں کبھی روپے پر یا کپڑے پر کیوں نہیں پڑھی جاتیں۔ اور ایک نیت میں اصلاح کرنی ضروری ہے کیونکہ اکثر نیت ہوتی ہے۔ ہم ان کو ثواب پہنچائیں گے تو ان سے ہمارے دنیا کے کام نکلیں گے تو صاحبو! قطع نظر فسادِ اعتقاد کے اس کی ایسی مثال ہے کہ آپ کسی شخص کے پاس ہدیہ مٹھائی بجائیں اور پیش کرنے کے بعد اس شخص سے کہیں کہ آپ میرے مقدمے میں گواہی دیدیں۔

اندازہ کیجئے کہ یہ شخص کس قدر کبیدہ ہوگا اور اس سے اسکو کیسی اذیت ہوگی پس جب اہل دنیا کو اذیت ہوتی ہے تو اہل اللہ کو تو اس سے زیادہ اذیت ہوگی۔ پھر خصوصاً وفات کے بعد کیونکہ وفات کے بعد لطافت زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ نفس غمخیز ٹوٹ جاتا ہے اور صرف روح ہی روح رہ جاتی ہے اور اس کا ادراک کامل ہو جاتا ہے پس جس وقت ان کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ یہ ہدیہ اس غرض سے پیش کیا گیا ہے کہ اس قدر ناگوار ہی ہوتی ہوگی اس کے ماسواً کس قدر شرم کی بات ہے کہ اہل اللہ سے دنیا کے لئے تعلق اور محبت ہو۔ صاحبو! ان کے پاس دنیا کہاں ہے ان سے دنیا کی امید رکھنی بالکل ایسی بات ہے جیسے کسی سناہ سے کھر پانے کی امید رکھنی یا کسی حکیم سے یہ فرمائش کرنی کہ تم چل کہہ مائے گھر کی گھاس کھو دو۔ صاحبو! ہم کو حضرت سید غوث الاعظم رحمہ اللہ سے جو محبت ہے تو اس لئے کہ انہوں ہم کو راہ ہدایت دکھلائی اس کے مکافات میں ہم ان کو کچھ ثواب بخشنے کی روح خوش ہو اور اس کے خوش ہونے سے خدا تعالیٰ خوش ہوں۔ اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم لوگ ایصالِ ثواب سے منع نہیں کرتے بلکہ اس کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور جس دن اصلاح عام ہو جائے گی اس دن ہم یہ بھی نہ کہیں گے مگر حجب تک اصلاح نہ ہو اس وقت تک ہم ضرور لایحوز کہتے رہیں گے۔ رہی بدنامی سبحد اللہ اشاعتِ دین میں ہم کو اس کی مطلق پرواہ نہیں۔ ہمارا وہ مذہب ہے ۵

ساقیا بر خیز و درودہ جام را خاک بر سر کن عسیم ایام را
گرچہ بدنامی ست نزد ا قتلاں مانخی خواہیم ننگ و نام را
(ساقی جام اٹھاؤ اور زمانے کے غم کو دور کرو اگر اس میں بدنامی ہے لیکن ہم ننگ و نام کے خواہشمند ہیں)

غرض مقصود اس بیان سے حق ظاہر کرتا ہے اعتدال کے ساتھ اور اس قاعدہ کلیہ کو اگر آپ یاد رکھیں گے تو بہت سے اعمال آپ کو حدِ جواز و عدم جواز معلوم ہو جائے گی یہ تو اعتقاد کے متعلق تھا۔ ایک فرقہ مسلمانوں میں ایسا بھی ہے کہ اس کے عقائد و اعمال سب درست ہیں مگر یہ فرقہ اپنے تقدس پر مغرور اور نہایت متکبر ہے اور دوسرے مسلمانوں کو

ذلیل و حقیر سمجھتا ہے۔ صاحبِ اُخوب سمجھ لو

غافل مرد کہ مرکب مردانِ مرد را در سنگلاخِ باد یہ پہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ زندانِ بادہ نوش تاکہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند
(غافل نہ رہو سب کو ایک جگہ چلنا ہے ان شراب نوشوں کی بھی منزل ہے)
اور۔ ع۔ تیار کر اخواہد و میلش بکہ باشد

اور صاحبِ اُخوب! تکرر کس پر کیجئے جو لوگ گنہگار ہیں ان کو بھی برا اور ذلیل نہیں سمجھ سکتے کسی کا قول ہے
ہ گناہ آئینہ عفو و رحمتِ متاعِ شیخ میں ہر چشمِ حقارت گناہگار را را
(گناہ رحمت و بخشش کا آئینہ ہے اس لئے کسی کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھنا چاہئے)
جن کو تم گنہگار سمجھتے ہو ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ وہ اعتقادی گمراہی میں مبتلا
ہیں مگر ان کو کچھ بھی گناہ نہیں کیونکہ مَنِ اشْتَرَى بِغَيْرِ عَلَيْهِ فَاِشْتَارَا ثَمَهُ عَلَى مَنْ اُفْتَاؤُ
(بغیر علم کے جس نے فتویٰ دیا تو اس کا گناہ پوچھنے والے پر ہوگا) تو بہت سے لوگ ایسے ہیں
کہ ان کو کچھ بھی خبر نہیں اس کے ماسوا وہ شخص کس منہ سے دعویٰ کر سکتا ہے جو دوسرے
مسلمانوں کو ذلیل سمجھے اور ان پر طعن کرے۔ حدیث کا مضمون ہے جس کو شیخ سعدی علیہ
الرحمۃ نے ترجمہ کیا ہے ہ بنی آدم اعضائے یکدیگر اند :۔ تو گویا تمام مسلمان مثل ایک
تن کے ہیں۔ اور جب یہ حالت ہے تو آپ کو مسلمانوں کے جہنم میں جانے سے صدمہ اور
رنج ہونا چاہیئے اور ان کے بچانے کی تدابیر میں لگنا چاہیئے۔ ہم کو گنہگار مسلمانوں کے
ساتھ وہی دلسوزی ہونی چاہیئے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تھی۔ ایک مرتبہ حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور زنا کرنے کی اجازت چاہی۔ صحابہ کرام
رضی اللہ عنہم نے سن کر اس کو ڈانڈنا چاہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور نہایت
اطمینان سے فرمایا کہ کیا تو اپنی ماں کے ساتھ ایسا کیا جانا پسند کرتا ہے اس نے کہا
نہیں۔ فرمایا بہن کے ساتھ کہا نہیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا بس جس سے تم
ایسا فعل کرو گے وہ بھی کسی کی ماں کسی کی بہن ہوگی ہ اپنہ بر خود نہ پسندی بردیگراں پسند
(جس کو تم خود پسند نہیں کرتے وہ دوسرے کیلئے بھی مست پسند کرو) بس وہ سمجھ گیا۔ سبحان اللہ حضور صلی اللہ علیہ

و سلم کے پاکیزہ اخلاق اور تربیت کی یہ حالت تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو مجنیض اور کفایت تک کی خاطر داری فرماتے تھے۔ کفار آپ کو ستاتے اور فرشتہ جبال آکر عرض کرتا کہ اگر اجازت ہو تو میں ان سب کو پہاڑوں سے ہلاک کر دوں آپ فرماتے کہ دَعُونِی دَعُونِی تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کفایت تک کی خاطر منظور تھی تو ہم میں آج کو کسی بڑائی پیدا ہو گئی ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو ذلیل سمجھیں اور ان سے تکبر سے پیش آئیں۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

شنیدم کہ مردانِ راہ خدا دل دشمنان ہم نکر دند تنگ

ترا کے میسر شود این مقام کہ بادِ دوستانِ خلافت و جنگ

اور جب تم دوستوں سے لڑتے اور ان کو حقیر سمجھتے ہو تو کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہتے ہو۔ نیز یہ امور خدا شناسی کے بھی مخالف ہیں۔ حضرت بہلولؓ کی حکایت ہے:

چہ خوش گفتم بہلول فرخندہ خوئے چو بگذشت بر عارفِ جنگ جوئے

گر ایں مدعی دوست بشناختے یہ پرکار دشمن نہ پرداختے

صاحبو! کیا بھروسہ ہے کہ شام تک ہماری کیا حالت ہوگی اور چار دن کے بعد ہم کیا ہوں گے؟ اگر قبر میں ایمان ساتھ گیا تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ تو جب ہم کو اپنی حالت پر اطمینان نہیں موجودہ حالت کے اعتبار سے بھی کہ اس میں صدمہ ناقص ہیں اور آئندہ کے اعتبار سے بھی کہ زیادہ بگڑ جانے کا اندیشہ ہے تو سخت جہل کی بات ہے کہ ہم دوسروں پر بیسیں اور ان کو کت کی نظر سے دیکھیں۔ بڑا پاگل ہے وہ شخص کہ اُس پر بیسیوں فوجداری کے مقدمات قائم ہیں اور وہ دوسرے دیوانی کے مقدمات والوں کو ذلیل سمجھتا اور بُرا بھلا کہتا پھرتا ہے تو اس وجہ سے اس فرقے کو خصوصاً میں کہتا ہوں کہ اگرچہ تمہارے اعتقادات درست ہیں اور بظاہر اعمال بھی خراب نہیں معلوم ہوتے لیکن تم اپنی اندرونی حالت میں غور کرو اور اندرونی حالت کو اچھا نہ سمجھو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مدار صرف عقائد پر ہے اگر عقائد درست کر لئے تو پھر نجات ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ یہ بھی کہ عقائد درست ہونے سے کبھی نہ کبھی نجات ہو جائے گی لیکن محض عقائد پر نجات تام کا مدعا سمجھنا غلط ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ کرنا کافی ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے محبت ہو تو نہ سوال جواب ہو گا نہ حساب کتاب ہو گا۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کا ظاہر درست ہے مگر دل مثل بھیڑیے کے نہایت سخت ہے۔ ایک بزرگ ایسے لوگوں کی شان میں کہتے ہیں۔

از بروں چوں گوید کافر پُر حیل و اندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایہ زید و زود و نت تنگ میدارد یزید

اکافر کی قبر اوپر سے بڑی ہی باروتی ہے لیکن اندر خدا کا قہر نازل ہو رہا ہے اوپر

سے۔ یزید پر طعنہ زنی کرتے ہو لیکن اندر کچھ اور ہی حال ہے)

اس لئے ایسے لوگوں کو چاہیے کہ باطن کی بھی فکر کریں جس کا طریق یہ ہے کہ

قال را بگذار مرد حال شود پیش مردے کاٹے پا مال شود

(قال سے گذر کر حال ہو جاؤ اور ایک مرد کامل)

اصل علاج یہی ہے کہ اپنے کو بالکل مشاڈے اور تواضع پوری اختیار کرے اور یہی تواضع جڑ ہے اتفاق کی بھی۔ آج کل لوگ اتفاق کی کوشش کرتے ہیں مگر اتفاق کی جو جڑ ہے اس کو بالکل چھوڑ رکھا ہے کیونکہ اتفاق ہمیشہ اس سے پیدا ہوتا ہے کہ شخص اپنے کو دوسرے سے کم سمجھے اس سے کبھی اختلاف کی نوبت آ ہی نہیں سکتی۔ افسوس آج اس پاکیزہ خصلت کو بالکل چھوڑ دیا گیا بلکہ اس کے برخلاف خود داری اور تکبر کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لباس میں ہمیشہ ایسی وضع اختیار کی جاتی ہے کہ تمام مجمع بھر میں ہمیں کو ممتاز اور بڑا سمجھا جائے اور غضب یہ ہے کہ اپنی اولاد کو بھی ابتدا ہی سے اس وضع کا عادی بناتے ہیں۔ غرض ہر فعل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کو فرعون کا ہمسر سمجھتے ہیں پھر فرمائیے اتفاق کیونکر ممکن ہے۔ صاحبوا اگر اتفاق کی واقعی تمنا ہے تو حضرات صوفیہ کے طرز پر چلنے کی کوشش کرو ان حضرات کے قدموں پر جا کر دیکھو کیسا اتفاق ہوتا ہے۔

ایک رئیس سے میری گفتگو ہوئی کہ اگر لڑکے سے کسی نوکر پر زیادتی ہو جائے تو اس کو سزا دینی چاہیے یا نہیں۔ ان رئیس صاحب کی یہ رائے تھی کہ سزا نہ دینی چاہیے کیونکہ سزا دینے سے بچہ کی طبیعت پست ہو جاتی ہے اور دماغ میں

علوِ حوصلگی نہیں رہتی سمجھ میں نہیں آتا کہ علو کے کیا معنی ان لوگوں کے نزدیک ہیں۔
ایسے علو کو غلو کہا جائے تو بہتر ہے اور نہ کہئے تب بھی ہمارا مقصود حاصل ہے کیونکہ
یہ وہی علو ہے جس کو فرماتے ہیں لَا يُرِيدُونَ غُلُوًّا اِنِ الْاَرْضُ ذَا ظُنْدٍ وَهِيَ زَرْعٌ
علو ہی چاہتے ہیں اور نہ فساد دیکھ لیجئے کہ قرآن نے اس علو کو محمود بتلایا ہے یا مذموم
بتلایا ہے تو کیونکہ یہ علو مطلوب ہو سکتا ہے۔ صاحبو! قرآن شریف کو اگر دیکھا
جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف آجکل کے مخترع تمدن کی بالکل جڑ
کاٹ رہا ہے۔ غرض یہ ہے کہ اتفاق پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ اپنے اعمال درست کرو
اور جو لوگ اپنے اعمال درست کر چکے ہیں ان کے پاس آمد و رفت رکھو مگر اس کے
ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لو کہ بزرگوں کی خدمت میں اگر جساؤ تو نیت محض اپنی اصلاح
کی کر کے جاؤ۔ بعض لوگ بزرگوں کی خدمت میں جاتے ہیں لیکن نیت ان کی محض
وقت پورا کرنا اور دل بہلانا ہوتی ہے اور علت اس کی یہ ہے کہ بزرگوں کے
پاس جا کر دنیا بھر کے قصے جھگڑے اخبار شروع کر دیتے ہیں ایسے لوگ
اپنا بھی نقصان کرتے ہیں اور ان بزرگ کا بھی وقت ضائع کرتے ہیں بعض
لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ اصلاح ہی کی نیت سے جاتے ہیں لیکن عجلت پسند
ہونے کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ دو ہی دن میں ہماری اصلاح ہو جائے۔ ان
ان لوگوں کی بالکل وہ مثال ہے الْحَاثِلُ اِذَا صَلَّی یَوْمَئِذٍ اِنْتَظَرَ الْوُحْیَ۔
(جولا جب دو دن نماز پڑھ لیتا ہے تو وحی کا انتظار کرنے لگتا ہے)
ایسے لوگوں کے جواب میں ہماری حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے
کہ یہ کیا کم فائدہ ہے کہ تم کو خدا کے نام لینے کی توفیق ہو گئی اور فرمایا کرتے
تھے کہ بھائی اگر واقعی کچھ سبھی حاصل نہ ہو تب بھی طلب نہ چھوڑنی چاہیے
۵ یا ہم اور یا دنیا ہم جتوئے میکنم حاصل آید یا نیا دید آرزوئے میکنم
(چاہے ہم کوئی چیز پائیں یا نہ پائیں تلاش رکھنی چاہیے۔ حاصل
یہ ہو کہ امید رکھنی چاہیے)

طالبِ خدا کی یہ شان ہے کہ اگر تنہا دفعہ اس کو یہ آواز آئے کہ تو دوزخی ہے تب بھی مایوسی نہ ہو۔

ایک بزرگ کے پاس شیطان آیا اور کہا کہ تم کو عبادت کرتے کتنے دن ہو گئے نہ پیام ہے نہ سلام پھر اس سے کیا نفع وہ معمول چھوڑ کر سو رہا خواب میں حضرت خضر علیہ السلام آئے اور وجہ پوچھی اس نے کہا کہ نہ لیبیک ہے نہ پیک ہے پھر کیسے دل بڑھے۔ جواب ارشاد ہوا کہ

گفت آل اللہ تو لیبیک ماست دیں نیاز و سوز و دردت پیکاست
را نھوں نے کہا تمہارا اللہ ہماری لیبیک ہے۔ تمہارا سوز و درد ہماری پیکاست
ایک بزرگ کی حکایت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے لکھی ہے کہ وہ ذکر کرنے بیٹھے تو یہ آواز آئی کہ تم کچھ بھی کرو یہاں کچھ بھی قبول نہیں مگر وہ پھر کام میں لگ گئے ان کے ایک مرید نے کہا کہ جب کچھ نفع ہی مرتب نہیں تو محنت سے کیا فائدہ بزرگ نے جواب دیا۔ بھائی اگر کوئی دوسرا ایسا ہوتا کہ میں خدا کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تو اعراض ممکن بھی تھا۔ اب تو ایک یہی در ہے قبول ہو یا نہ ہو۔

توانی ازاں دل بہ پردا حقن کہ دانی کہ بے اد تو اس ساختن
اس جواب پر رحمتِ خداوندی کو جو شش آیا اور ارشاد ہوا کہ
قبولست کہ چہ ہنر نیست کہ جز ما پناہی دگر نیست
(قبول ہے حالانکہ تمہارے پاس ہنر نہیں ہے اور ہمارے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں)
غرض طالب کو ہر حال میں طلب میں مشغول رہنا چاہیئے اور یہ حالت ہونی چاہیئے کہ

اندریں رہ می تراش و می خراش تا دم آخر دمے ف نارغ مباحش
تا دم آخر دم آخر بود کنز عنایت با تو صاحب سر بود
(ہمیشہ اصلاح کرتے رہو کسی وقت بھی فارغ نہ ہو اس لئے کہ یہ سائلِ خری سانس ہے)

البتہ اس موقع پر اس کی ضرورت ہے کہ کامل کی کوئی پہچان بتلائی جائے کیونکہ آج کل بہت سے شیطان بھی لباسِ انسان میں ہیں۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نیاید داد دست
(آج کل شیطان یعنی انسان کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے پس ہوشیار رہنا چاہیے اور اس کی علامتیں بتا دینا چاہئیں)

(۱) تو پہچان اس کی یہ ہے کہ وہ شریعت کا ضروری علم رکھتا ہو۔

(۲) کسی کامل شیخ کی تربیت میں رہا ہو۔

(۳) اور اس سے اجازتِ تربیت حاصل ہو۔

(۴) خود شریعت پر عامل ہو۔

(۵) شریعت کے خلاف پراصرار نہ کرتا ہو۔

(۶) سنت کا پورا پابند ہو۔

(۷) اپنے متعلقین پر شفقت کرتا ہو

(۸) احتساب میں کمی نہ کرتا ہو۔

جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں وہ کامل ہے اور ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا ہے

یک زمانے صحبت با اولیسا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

(ہزاروں کی صحبت میں رہنا سو سال کی عبادت سے بہتر ہے وہ بھی مکاری کے)

بحمد اللہ سب طبقات کا بیان بقدر ضرورت ہو گیا اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ سبیل

نجات صرف ایک ہے اور اس پر چلنے کا طریقہ یہ ہے جو مذکور ہوا۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا

جائے گا تو انشاء اللہ بہت کارآمد ہے اگرچہ لذیذ نہیں۔ اب دعا کیجئے کہ خدا عمل کی

توفیق دے۔ آمین۔

مکتبہ تھانوی بند روڈ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ